سہ ماہی

فیضانِ ادب

ایک بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر 2 شمارہ 3و4

جولائی تا دسمبر 2017

مدیر

فیضان حیدر

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفرپور، مئو، یوپی 275305

سہ ماہی

فیضانِ ادب

ایک بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر 2 شمارہ 3و4

جولائی تا دسمبر 2017

مدیر

فیضان حیدر

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یوپی 275305

Quarterly

FAIZAN-E-ADAB

An International Refereed Research Value Journal

Vol. II Issue: III & IV

July to December 2017

ISSN: 2456-4001

اس شمارے کی قیمت: 100روپے

زر سالانہ: 200روپے

رجسٹرڈ ڈاک سے: 300روپے

خط و کتابت کا پتہ: ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، ضلع مئو، یوپی 275305

موبائل نمبر (مدیر): +919455341072,+917388886628

ای۔میل: faizaneadab@gmail.com , faizanhaider40@gmail.com

Account No. 33588077649
IFSC: SBIN 0001671
Name: Faizan Haider
State Bank of India Branch: Maunath Bhanjan

چک یا ڈرافٹ پر صرف فیضان حیدر لکھیں۔

ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر فیضان حیدر نے روشان پرنٹرس لال کنواں، دہلی 110006 سے چھپوا کر ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، ضلع مئو، یوپی 275305 سے شائع کیا۔

فہرست

تحقیق وتنقید

نقش ہائے رنگا رنگ

قند مکرر

تعارف وتبصرہ

مدیر کے قلم سے

نہ من بیہودہ گرد کوچہ و بازار می گردم
مذاق عاشقی دارم پیٔ دیدار می گردم

اردو ہمارے ملک ہندوستان کی عوامی زبان ہے اور اسے ثانوی زبان ہونے کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اس نے اسی سرزمین پر جنم لیا اور یہیں نشوونما پائی۔ شہر، قصبے اور گاؤں کے سبھی لوگ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اسے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اسے دستور ہند میں چودہ زبانوں میں سے ایک قومی زبان ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد ایک سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین اردو داں بھی تھے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد ان کی عظیم یادگار ہے۔ بلاشبہ آج بھی برصغیر اردو زبان و ادب کا عظیم گہوارہ ہے اور ہمارے ملک میں اس کا شاندار ماضی رہا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ہم اردو کے فروغ کے لیے کوشش کریں اور اس کی ترقی کے لیے سرگرداں رہیں۔

موجودہ وقت میں کچھ شر پسند عناصر ایک مخصوص فرقے سے وابستہ قرار دے کر اسے زبردست نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومت سے ہم اردو کے شیدائی مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کو صحیح معنوں میں عملی طور پر دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے کر اس کی تعلیم کو ان ریاستوں میں لازمی قرار دے جن میں اردو بولنے اور لکھنے پڑھنے والوں کی ایک معتدبہ تعداد موجود ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان کی کئی ریاستوں میں اردو میڈیم اسکول کا معقول انتظام ہے لیکن ہماری ریاست اتر پردیش اس سے محروم ہے اور یہاں اردو میڈیم اسکول نہیں ہیں۔ ہم محبان اردو کا اولین فریضہ ہے کہ اردو کو روزمرہ استعمال میں لائیں، اردو رسائل و جرائد خرید کر پڑھیں، بچوں کو اردو تعلیم لازمی طور پر دلائیں اور دکانوں اور مکانوں پر نیم پلیٹ اور بورڈ بھی اردو میں لکھوائیں۔ ایسی صورت میں ہی اردو کو فروغ مل سکتا ہے۔ کیونکہ اس سے ہماری قوم وملت کی بہت سی یادگاریں وابستہ ہیں۔ لیکن جب ہم اپنی موجودہ نسل پر نظر ڈالتے ہیں تو کفِ افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ زبان جسے ہمارے بزرگ سینے سے لگائے تھے آج ہماری نئی نسل اس سے نابلد ہوتی جا رہی ہے اور ہمارا یہ عظیم تہذیبی اور تمدنی ورثہ پامال ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ہم اردو کے تئیں ایسی ہی غفلت برتتے رہے تو اردو زبان کو خود ہمارے ہی ہاتھوں ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اس موقع پر مجھے پروفیسر نسیم احمد کی وہ بات یاد آتی ہے جو انھوں نے ”فیضان ادب“ کے پہلے شمارے کی رونمائی کے موقعے پر کہی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اب ادب کا فیضان ختم ہوتا جا رہا ہے اور اب اس کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ یقیناً ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی کے عزائم میں سے یہ امر بھی ہے کہ فیضان ادب کے ذریعے اردو زبان وادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کے تحفظ کی بھی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

ہمیں حکومت کو وہ وقت یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ جب مہاتما گاندھی نے ہندوستانی کو ملک کی سرکاری زبان بنائے جانے کی بات کہی اور اس کی وکالت بھی کی تھی۔ ہندوستانی سے ان کی مراد عوامی زبان تھی جس میں اردو اور ہندی کا حسین امتزاج پایا جائے اور اردو اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے۔ کاش مہاتما گاندھی کی تجویز قبول کر لی گئی ہوتی تو آج اردو اور ہندی دونوں کو فروغ ملتا اور اردو لسانی تنگ نظری اور عصبیت کا شکار نہ ہوتی۔

اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ محبان اردو متحد ہو کر اردو کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کریں اور آپسی اختلافات خصوصاً مسلکی تنازعات سے حتی الامکان گریز کریں کیونکہ اسی نااتفاقی کا شر پسند عناصر اور دشمن طاقتیں فائدہ اٹھا رہی ہیں، ساتھ ہی گھروں میں اردو لکھنے پڑھنے کا ماحول بنائیں کیوں کہ اس سے ہمارے بچوں کے دل میں اردو زبان سے ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوگا۔

فیضان حیدر

کلام سودا میں الحاق

(مع ترمیم واضافہ)

نسیم احمد

تدوینِ متن کے عمل میں الحاقی کلام کا مسئلہ بڑا اہم ہے اور پیچیدہ بھی۔ ان پیچیدگیوں کا حل ناممکن نہ سہی لیکن دشوار ضرور ہوتا ہے۔ مرتبِ متن کو ان گتھیوں کے سلجھانے میں کتنے ہفت خوان طے کرنے پڑتے ہیں اس کا اندازہ صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو اس قسم کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔

شعرائے اردو کے کلیات و دواوین میں ایک دوسرے کے کلام کا خلط ملط ہو جانا عام بات ہے۔ اس قسم کا اشتباہ یا اختلاط عموماً شاعر کے نام یا تخلص کی مطابقت، ردیف اور قافیے کے اشتراک، مضامین کی مماثلت، کاتب کی بے توجہی یا لاعلمی کی بنا پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بعض اوقات اہلِ مطابع نے بھی تجارتی فائدے کے پیشِ نظر کمتر درجے کے شاعروں کا کلام مشاہیر کے نام سے یا نومشقوں کے اشعار اساتذۂ فن کے کلام کے ساتھ شائع کر کے تدوینی الجھنوں میں اضافہ کیا ہے۔

سودا کے کلیات کے مختلف مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخوں میں بھی غزلیات اور دیگر اصناف میں ایسے کلام کا ایک معتد بہ حصہ شامل ہو گیا ہے جو دوسرے شعرا کے دیوانوں میں موجود ہے یا معاصر تذکروں میں ان کے نام سے درج ہے۔ اس ضمن میں رندؔ، سوزؔ، حمزہ علی رندؔ، ہدایتؔ، یقینؔ، مجذوبؔ، شیداؔ، فغاںؔ، بیانؔ، تاباںؔ، میر حسنؔ، ممتازؔ، راقمؔ، منتؔ، فطرتؔ، آرزوؔ، کلیمؔ، فرحتؔ، رسواؔ، عاصمیؔ (آثمی)، آبروؔ، میرؔ، انتظارؔ، امیرؔ، مائلؔ، غلامؔ، حسرتؔ، جراتؔ، مرزاؔ، عسکر رمرزا عباس علی، عظیمؔ، عاکفؔ، مرزائی رگمانی مل کھتری، حیدریؔ رفتح چند ممنونؔ، معروفؔ، محبت خاں محبتؔ اور مضمونؔ وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

آئندہ صفحات میں ہم متذکرہ بالا شعرا کے اس کلام کی تفصیلات پیش کریں گے جو ان کے مجموعہ کلام اور کلیاتِ سودا کے درمیان مشترک ہیں یا تذکروں میں ان کا انتساب متذکرہ شاعروں میں سے کسی کی جانب کیا گیا ہے۔

(ا) سوداؔ، سوزؔ اور رندؔ

سوداؔ اور سوزؔ دونوں مہربان خاں رندؔ کی سرکار سے وابستہ تھے اور ان کے لیے شعر کہتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق سوداؔ نے سوزؔ کے نام سے بھی اشعار کہے ہیں (۱) چنانچہ غزلوں کی ایک بڑی تعداد تینوں کے یہاں مشترک ہو گئی ہے۔ تفصیل یہ ہے:

(الف) سوداؔ اور رندؔ

نواب مہربان خاں رندؔ میر محمد سوزؔ کے شاگرد تھے۔ سوزؔ کے علاوہ انھوں نے سوداؔ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ قائم کے بقول "ذہن سلیم و طبع مستقیم" اور شوقؔ کے الفاظ میں "طبع موزوں و مناسب" رکھتے تھے۔ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں غزل اور مراثی کے علاوہ گیت، دوہرہ اور پٹہ کے لکھنے پر بھی قدرت حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ہی فنِ موسیقی میں دستگاہ کامل اور تیراندازی و شمشیر شناسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

شوقؔ کے بیان کے مطابق رندؔ کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ اس دیوان کا اب کوئی سراغ نہیں ملتا، البتہ قاضی عبدالودود صاحب نے ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں تین چار ہزار اشعار کے ایک نسخۂ دیوان کی نشان دہی فرمائی ہے۔ "خوش معرکہ زیبا" کے مولف سعادت خاں ناصر کے پیشِ نظر بھی غالباً اسی طرح کا کوئی ایک نسخہ رہا ہوگا۔ ان کا بیان ہے:

> "رندؔ کا دیوان مولف کی نظر سے گزرا ہے۔ سلاست اس کے کلام جنون خیز (کی) سوداؔ سے ہم سلسلہ ہے مگر اکثر وہی غزلیں میر سوزؔ صاحب کے دیوان میں موجود اور نام رندؔ کا ان میں سے نابود، یہ نہ چاہیے۔ جو چیز بالعوض گئی ہو اس کا دعوی انصاف سے بعید ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔" (۲)

ناصر کے علاوہ کئی اور تذکرہ نگاروں کو بھی دیوانِ رند میں درج کلام کو مہربان خاں رندؔ کی تصنیف تسلیم کرنے میں تامل ہے۔

۱۔ میر حسنؔ لکھتے ہیں:

> "اکثر اشعار میر سوز و مرزا رفیع سوداؔ در دیوان مہربان خاں یافتہ می شود ازیں جہت اشعار او را قلمی نہ کردم، آنچہ دو سہ نوشتم برہماں اکتفا کردم" (۳)

۲۔ شوقؔ رندؔ کے کلام میں اکیس شعر بہ طور نمونہ نقل کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

> "اکثر اشعار در دیوان او یافتہ شد کہ آں را میر سوز نسبت بہ طرف خود می کنند و بعضے گویند کہ از مرزا رفیع است والعلم من عند اللہ" (۴)

اس کے بعد رندؔ کے تائیس اشعار نقل کر کے آخر میں لکھتے ہیں:

> "علیٰ ھذا القیاس اکثر غزلیات مربوط و مضبوط کہ داخل دیوان اوست، آں را بہ مرزا رفیع و میر سوز وغیرہ نسبت می کنند، خدا داند کہ در واقع از کیست" (۵)

۳۔ مصحفیؔ نے رندؔ کے تذکرے میں لکھا ہے کہ "اگر چہ شخص جاہل بود اما سلیقہ صحبت شعرا او را ہم بہ عرصۂ قلیل بہ مرتبہ والائے شاعری رسانیدہ۔۔۔ مخرج زبان ہم درست نہ داشت۔۔۔" (۶)

بعد ازاں تین غزلوں کے سات شعر نمونے کے طور پر نقل کیے ہیں۔ ان میں دو غزلوں کے چار شعر

دیوانِ سوزؔ اور کلیات سوداؔ کے بعض نسخوں میں موجود ہیں۔

۴۔قاسمؔ نے رندؔ کے ترجمے میں ایک غزل کا مطلع: ع ”یارب کہیں سے گرمیٔ بازار بھیج دے“ اور ایک شعر: ع ”دیتے ہیں عقد حسن میں عاشق عروس جان“ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

”ایں غزل در کلیات سرآمد شعرائے فصاحت آما، مرزا محمد رفیع سوداؔ، این عاصی پر معاصی دیدہ و بسیار ناپسندیدہ“(۷)

۵۔اور لالہ سری رام نے رندؔ کے نام آٹھ شعر نقل کرنے کے بعد اشعار کے انتساب کے سلسلے میں شبہہ ظاہر کیا ہے۔لکھتے ہیں:

”چند شعر ان کے دیوان میں دیکھے گئے جن کی نسبت میر سوز کہتے ہیں کہ یہ ان کا کلام ہے اور بعض مرزا رفیع سوداؔ سے منسوب کرتے ہیں واللہ اعلم۔وہ اشعار یہ ہیں۔“(۸)

بعد ازاں مزید آٹھ اشعار نقل کیے ہیں۔انھیں شواہد کی بنیاد پر قاضی عبدالودود مرحوم نے بجا طور پر یہ رائے قائم کی ہے:

”مہربان خاں خود شعر نہیں کہتے تھے۔دوسروں کے اشعار اپنی طرف منسوب کرلیا کرتے تھے“(۹) البتہ ان کا یہ بیان درست نہیں کہ ”دیوان رندؔ (نسخہ کلکتہ) میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو سوزؔ کے کسی نسخے میں نہ ہو لیکن ایک شعر بھی ایسا نہیں جو کلیات سوداؔ کے کسی معتبر نسخے میں موجود ہو“(۱۰)

سطور ذیل میں صرف دو غزلوں (۱۱) سے بحث کی جائے گی جو کلیات سوداؔ میں موجود ہیں لیکن کلیات سوزؔ میں نہیں اور جنھیں سعادت خاں ناصر نے رندؔ کے نام سے نقل کیا ہے:

۱۔ ع جب لبوں پر یار کے مسّی کی دھڑیاں دیکھیاں (۷ شعر)

یہ غزل کلیات سوداؔ کے تمام مطبوعہ ہندوستانی نسخوں میں موجود ہے۔(۱۲)

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی نے اسے لندن کے دو قلمی نسخوں (۱۳) کی بنیاد پر اپنے مرتب کردہ کلیات سوداؔ جلد اول کے حصہ سوم میں جگہ دی ہے اور ڈاکٹر ہاجرہ نے اپنے مرتبہ غزلیات مرزا محمد رفیع سوداؔ میں شامل کرلیا ہے۔لیکن سعادت خاں ناصر نے اس غزل کا مطلع رندؔ کے نام سے نقل کیا ہے۔

۲۔ ع جب یار نے اٹھا کر زلفوں کے بال باندھے (۹ شعر)

یہ غزل بھی کلیات سوداؔ کے تمام ہندوستانی ایڈیشنوں میں موجود ہے۔(۱۴) جب کہ ڈاکٹر محمد شمس الدین نے اسے لندن کے ایک قلمی نسخے (۱۵) کی بنیاد پر اپنے مرتبہ کلیات سوداؔ جلد اول کے حصہ چہارم میں جگہ دی ہے اور ڈاکٹر ہاجرہ اسے مشکوک خیال کرتی ہیں تاہم اپنے مرتبہ ”غزلیات مرزا محمد رفیع سودا“ میں شامل کیا ہے۔لیکن اس غزل کے مندرجہ ذیل دو اشعار سعادت خاں ناصر نے رندؔ کے نمونۂ کلام میں نقل کیے ہیں۔

جب یار نے اٹھا کر زلفوں کے بال باندھے   سودائیوں نے دل میں کیا کیا خیال باندھے
تیرے ہی سامنے کچھ چوکے ہے تیر نالہ   ورنہ نشانے اس نے مارے ہیں بال باندھے

کلیات سوداؔ کے تمام نسخوں میں پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ”سودائیوں نے دل میں“ کی بجائے ”تب میں نے اپنے دل میں“ اور دوسرے شعر میں ”چوکے ہے تیر نالہ“ کی بجائے ”بھکے ہے میرا نالہ“ اور ”ورنہ نشانے اس نے“ کی بجائے ”ورنہ نشانے ہم نے“ ملتا ہے۔

(ب)سوداؔ اور سوزؔ

کلیات سوداؔ میں شامل سوزؔ کے کلام کی نشان دہی سب سے پہلے شیخ چاند (متوفی ۱۹۳۶ء) نے اپنی کتاب ”سوداؔ“ میں ان الفاظ کے ساتھ کی۔(۱۶)

”ہم نے بہت سا ایسا کلام معلوم کیا ہے جو سوزؔ اور سوداؔ دونوں کے دیوانوں میں مشترک ہے۔یہ چوں کہ مقدار میں زیادہ ہے اس لیے اس کا یہاں نقل کرنا یا اس کی تفصیلات پیش کرنا طوالت سے خالی نہیں“۔

بعد ازاں قاضی عبدالودود مرحوم نے اپنے ایک مضمون ”کلیات سوداؔ کا پہلا مطبوعہ نسخہ“ میں سوزؔ اور سوداؔ کی ایک سو سات مشترک غزلیں نقل کیں اور انھیں سوداؔ کے یہاں الحاق قرار دیا۔متذکرہ مضمون کی اشاعت کے کافی عرصہ بعد ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر خلیق انجم کی تصنیف ”مرزا محمد رفیع سوداؔ“ منظر عام پر آئی جس میں انھوں نے کلیات سوداؔ میں سوزؔ کی ایک سو سولہ غزلوں اور ایک مطلع

کسو نے روم لی قسمت میں کوئی شام لے آیا
ہمیں لے کچھ نہ آیا ایک تیرا نام لے آیا

کی نشان دہی کی۔یعنی موصوف نے قاضی صاحب کے پیش کردہ الحاقی کلام پر نو غزلوں اور ایک مطلع کا اضافہ کیا۔

لیکن عجیب بات ہے کہ جب ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر محمد حسن نے کلیات سوداؔ کو دو جلدوں میں مرتب کیا تو قاضی صاحب کی نشان دادہ ایک سو سات الحاقی غزلیں جوں کی توں جلد اول کے مقدمے میں نقل کردیں۔اس کے بعد ڈاکٹر اکبر حیدری نے ’اکادمی‘ ستمبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں سوداؔ کے الحاقی کلام کی ایک طویل فہرست شائع کی، موصوف نے الحاقی کلام کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔حصہ الف میں ایک سو پینتیس غزلیں نقل کی گئی ہیں۔جن میں ایک سو چھبیس غزلیں سوز کی ہیں۔(۱۷) اکبر حیدری صاحب نے ان تمام غزلوں کی نشان دہی اردوئے معلی سوز نمبر کے حوالے سے کی ہے۔راقم السطور نے جب کلیات سوداؔ کا مقابلہ اردوئے معلی کے سوز نمبر سے کیا تو حیدری صاحب کی نشان دادہ ایک سو چھبیس غزلوں کے علاوہ ۱۰/غزلیں، ایک مطلع اور ایک مقطع مزید معلوم کیا، وہ یہ ہیں:

	کلیاتِ سودا	تعداد اشعار	صفحہ نمبر (سوز)
۱	چہرے پہ نہ یہ نقاب دیکھا	۹ شعر	۱۰۷
۲	مجھ عہد سے کام کچھ نہ نکلا	۱۰ اشعر	۹۸
۳	رات نالہ جو کیا یار سنایا نہ سنا	۷ شعر	۱۰۴
۴	روتا ہے ترے غم میں دل زار، زار زار	۷ شعر	۱۸۴
۵	اے خوشا حال ہوا جو کوئی رسوائے بتاں	۷ شعر	۲۹۲
۶	کسے آرام دے ہے چرخ مینا فام دنیا میں	۴ شعر	۳۹۳
	سدا گردش ہی میں گزری بہ رنگ خام دنیا میں	۷ شعر	۳۹۳
۷	جو صبر ہو کے عاشق مرغوب جانتے ہیں	۵ شعر	۳۰۲
۸	یہ تو میں سمجھوں ہوں یارو! وہ یار یار نہیں	۵ شعر	۳۰۱
۹	عشق بازی پر کمر تم نہ کسو جانے دو	۹ شعر	۳۴۰
۱۰	لہو اس چشم کا پونچھے سے ناصح بند کیوں کر ہو	۴ شعر	۴۳۱
۱۱	کسو نے روم لی قسمت میں کوئی شام لے آیا ہمیں لے کچھ نہ آیا ایک تیرا نام لے آیا	مطلع	۶۹
۱۲	ہاں مثل گل شگفتہ نہ ہو غنچہ ساں خموش ماتم سرا میں صورت دلگیر شرط ہے	مقطع	۳۸۶

اس طرح کل ایک سو چھتیس غزلیں مع ایک مطلع اور مقطع کے سوداؔ اور سوزؔ کے دیوانوں میں مشترک قرار پاتی ہیں۔

۲۔سوداؔ اور حمزہ علی رندؔ

میر حمزہ علی رندؔ دہلوی بقول عشقیؔ ''مردے وارستہ مزاج و آزاد مشرب'' تھے۔ ابتدا میں شیداؔ تخلص کرتے تھے بعد میں رندؔ تخلص اختیار کیا۔ فن شعر گوئی میں ماہر تھے۔ شورشؔ نے دو ہزار اشعار پر مشتمل دیوان رندؔ کی موجودگی کی اطلاع دی ہے اور دو سو سے زائد اشعار ان کے نمونۂ کلام میں نقل کیے ہیں۔

''تذکرۂ شعرائے اردو'' مرتبہ اکبر حیدری، واحد تذکرہ ہے جس میں مندرجہ ذیل تین شعر جو مہربان خاں رندؔ، سوداؔ اور سوزؔ کے یہاں مشترک ہیں، میر حمزہ علی کے نام سے نقل ہوئے ہیں:

۱۔ نہیں پیکاں پہ جو ہر نامہ ان نے تیر پر لکھا
اشارہ قتل کا مجھ کو یہ کس تقصیر پر لکھا

۲ بچے جی کس طرح روز ازل کاتب نے قدرت کے
ہمارا خون قاتل کے دم شمشیر پر لکھا
۳۔ خدا جانے کہ اس کو رندؔ پڑھ پڑھ کر وہ سمجھے گا
ہمیں تھا خط کا لکھا دور از تدبیر پر لکھا

یہ غزل سات شعر کی ہے اور سوداؔ اور سوزؔ کے علاوہ مہربان خاں رندؔ کے دیوان میں بھی موجود ہے۔ چوں کہ مہربان خاں اور میر حمزہ علی دونوں کا تخلص رندؔ ہے لہٰذا مؤلف یا کاتب / مرتب نے سہواً یہ اشعار میر حمزہ علی رندؔ کے ترجمے میں نقل کر دیے ہیں۔

۳۔سوداؔ اور ہدایتؔ

ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ دہلوی کی ایک غزل کلیات سوداؔ کے بعض قلمی نسخوں میں درج ہو گئی ہے۔ ان نسخوں کے حوالے سے اسے کلیات سوداؔ مرتبہ ڈاکٹر محمد شمس الدین جلد دوم کے حصۂ چہارم اور ''دیوان غزلیات مرزا محمد رفیع سودا'' مرتبہ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق میں شامل کر لیا گیا۔ علاوہ بریں اس غزل کے متفرق اشعار بعض تذکروں میں سوداؔ اور ہدایتؔ دونوں کے نام سے منقول ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

غزل

۱ جسے کہ زلف سیہ نے تری ڈسا ہوگا
غرض وہ مر ہی گیا ہوگا کیا جیا ہوگا
۲ نہ رحم اس کے ہی دل میں نہ جی میں اپنے صبر
الٰہی گزرے گی کیوں کر ہماری کیا ہوگا
۳ یکایک ہو کے غضب ناک یوں لگا کہنے
کہ تجھ کو مجھ سا کوئی آج تک ملا ہوگا
۴ کہا مَیں اس سے اگرچہ ہمیں تو مرنا ہے
مریں گے ہاتھ سے تیرے تو کیا برا ہوگا
۵ بلا و رنج کی محنت سے چھوٹ جاویں گے
ہمیں حیات سیتی اور بھی بھلا ہوگا
۶ بھلا بتادے مری جاں کبھو بھی عاشق نے
تمھارے جور سے شکوہ کہیں کیا ہوگا

مگر یہی نہ کہ بے اختیار ہوکے کبھو ے

کچھ اور بس نہ چلا ہوگا رو دیا ہوگا

یہ غزل کلیات سودؔا کے دو قلمی نسخوں (۱۸) کے علاوہ دو جدید تحقیقی ایڈیشنوں ا۔''کلیات سودا'' جلد اول حصۂ چہارم مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ۲۔ دیوان غزلیات سودؔا مرتبہ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق میں بھی موجود ہے۔ مزید برآں پہلا شعر تذکرۂ گردیزی و مسرت افزا میں اور شعر نمبر ۱، ۶ اور ۷ تذکرہ گلشن سخن (مردان علی خاں مبتلاؔ) میں ترجمہ سودؔا میں منقول ہیں۔ لیکن بیشتر تذکرہ نگاروں نے اس غزل کے مختلف اشعار ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ کے نام سے درج کیے ہیں۔ گردیزی نے جہاں اپنے تذکرے میں ص ۶۸ پر شعر نمبر ایک کو ترجمہ سودؔا میں نقل کیا ہے، وہیں شعر نمبر ۶ اور ۷ کو ص ۱۵۴ پر ہدایتؔ کے نام سے دیا ہے۔ میرؔ، قائمؔ، میر حسنؔ اور امر اللہ الہ آبادی اور سرورؔ نے بھی اپنے اپنے تذکروں میں ان اشعار کو ہدایتؔ ہی کے نمونۂ کلام میں نقل کیا ہے۔ علاوہ بریں شورشؔ نے شعر نمبر ۶ خلیلؔ اور مرزا علی لطف نے شعر نمبر ۱ اور ۲ شوقؔ اور قاسمؔ نے شعر نمبر ۱، ۶ اور ۷ کریم الدین اور مصطفیٰ خاں شیفتہ نے شعر نمبر ۲ کو ہدایتؔ ہی کے نام سے اپنے تذکروں میں درج کیا ہے۔

قدرت اللہ شوقؔ کے یہاں مذکورہ بالا تین شعروں (۱، ۶ اور ۷) کے علاوہ درج ذیل شعر بھی منقول ہے۔

گھڑی گھڑی ہمیں کیوں اتنا آزماتے ہو میاں یہی نہ کہ مرجائیں گے تو کیا ہوگا

اور خوب چند ذکا نے شعر نمبر ۱، ۲، ۶ اور ۷ کے علاوہ درج ذیل شعر بھی ہدایت کے نمونۂ کلام میں نقل کیا ہے۔

چمن میں گل کو تو ہم نے بھی ہنستے دیکھا ہے کسی کے دل کا بھی غنچہ کبھو کھلا ہوگا

قاسمؔ نے ہدایتؔ سے اپنے تعلقات کی مدت چالیس سال بتائی ہے اور ''انواع سخن سے مملو'' تخمیناً نو ہزار اشعار پر مشتمل دیوان کا ذکر کرنے کے بعد ان کے کلام کا طویل انتخاب دیا ہے۔ اس لیے ان اشعار کے سلسلے میں ان کی روایت کو بہ آسانی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس غزل کے کسی شعر میں سودؔا کا تخلص نہیں ملتا جب کہ نکات الشعرا، مخزن نکات، تذکرہ ہندی، تذکرہ مسرت افزا، تذکرہ شورش، طبقات الشعرا اور عیار الشعرا میں شعر نمبر ۶ میں ہدایتؔ کا تخلص موجود ہے۔ ان تمام تذکروں میں یہ شعر اس طرح نقل ہوا ہے۔

''بھلا بتاؤ مری جان کچھ ہدایتؔ نے تمھارے جور سے شکوہ کبھو کیا ہوگا''

شوقؔ نے اعلیٰ علی کے ذکر میں بھی اس غزل کو ہدایت ہی کی طرف منسوب کیا ہے۔ شاعر مذکور کے ترجمے میں ان کا بیان ہے کہ ''۔۔۔ غزل ہدایت مسطور را تضمین نمودہ۔۔۔ یک بند آں یاداست:''

کبھی جو کلبۂ احزاں میں میرے آتے ہو عجب طرح سیتی آنکھیں ہمیں دکھاتے ہو
یہ تیغ ابرو سے اپنی کسے ڈراتے ہو گھڑی گھڑی ہمیں کیوں اتنا آزماتے ہو

میاں یہی نہ کہ مرجائیں گے سو کیا ہوگا

ان شواہد کے پیش نظر سودؔا سے اس غزل کا انتساب درست نہیں معلوم ہوتا۔ بہ ظاہر یہ ہدایتؔ ہی کی تصنیف ہے لیکن ''دیوان ہدایتؔ'' کے دستیاب نہ ہونے کی بنا پر قطعیت کے ساتھ کوئی حکم لگانا ممکن نہیں۔

(۴) سودؔا اور یقینؔ

انعام اللہ خاں یقینؔ ''منظور نظر و تربیت کردۂ مرزا مظہر جان جاناں تھے۔ والد کا نام اظہر الدین خاں تھا۔ قائمؔ نے ''صاحب طرز، یگانۂ عصر و وحید دہر'' لکھ کر ان کی شاعرانہ برتری کو تسلیم کیا ہے۔ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ان کے دیوان میں صرف غزلیں ہیں اور سب کی سب پانچ شعر کی، جن کی کل تعداد ایک سو ستر (۱۷۰) ہے۔ اصلاً یہ اختصاص انھیں کی خاص ایجاد کردہ ہے۔ بعد میں شفیق اورنگ آبادی نے یقینؔ کی پیروی میں پانچ پانچ شعر کی غزلیں کہیں۔

کلیات سودؔا کے بیشتر نسخوں میں یقینؔ کی ایک غزل کے تین اشعار اور بعض نسخوں میں ان اشعار کے علاوہ پانچ شعر کی ایک مکمل غزل اور تذکرۂ آزردہ میں ایک دوسری غزل کا ایک شعر شامل ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف)

۱ بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
۲ قاتل ہماری نعش کی تشہیر ہے ضرور آئندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے
۳ گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوب رو زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

یہ تینوں اشعار کلیات سودؔا کے تقریباً تمام مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں گیارہ اشعار کی ایک غزل میں موجود ہیں۔ علاوہ بریں میرؔ، شورش، امر اللہ الہ آبادیؔ اور قاسم نے مطلع، گردیزی اور علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے تینوں شعر، میر حسنؔ اور مبتلاؔ نے شعر نمبر ۱ و ۳ مصحفیؔ اور شیفتہؔ نے شعر نمبر ۱ و ۲ اور باطنؔ نے شعر نمبر ۳ کو سودؔا کے نمونۂ کلام میں درج کیا ہے۔ خود سودؔا نے متذکرہ بالا غزل کو ایک مخمس میں تضمین کیا ہے جس میں یہ تینوں شعر شامل ہیں۔ لیکن یہ تینوں شعر دیوان یقینؔ کے تمام دریافت شدہ نسخوں میں موجود ہیں۔ تیسرے شعر کا مصرع اول کلیات سودؔا کے برخلاف دیوان یقینؔ میں اس طرح نقل ہوا ہے:

ع ''خلوت ہو اور شراب ہو، معشوق سامنے''

شفیق اورنگ آبادی نے بھی ان اشعار کو اپنے تذکرے چمنستانِ شعرا میں یقینؔ ہی کے نام سے نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

''فتح علی خاں نے دو شعر میر کے مطلع سودؔا کے ترجمے میں لکھا ہے مگر میں نے یقینؔ کے اکثر دیوانوں میں یہ اشعار دیکھے ہیں واللہ اعلم۔ ''نہج بستگی'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار یقیناً یقینؔ کے

ہیں جو کوئی ان دونوں صاحبان کی طرزِ سخن گوئی سے واقف ہے، وہ دونوں کی زبان پہچانتا ہے۔"(۱۹)

میرؔ اور گردیزی کی طرح شفیق بھی معاصر تذکرہ نگار ہے اور یقینؔ کی شاعری کا اس قدر دلدادہ ہے کہ اس نے ان کی تمام غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔لہٰذا قیاس یہ کہتا ہے کہ اس نے ضروری تحقیق و تفحص کے بعد ہی اپنے معاصر تذکرہ نگاروں کے بیان کی تردید کی ہوگی۔

راقم السطور کا خیال ہے کہ سوداؔ نے یقینؔ کی غزل کے تین شعروں پر (جو واقعی بہترین شعر ہیں) اپنے مخمس کی بنیاد رکھی اور بقیہ اشعار اپنی طرف سے کہہ کر مخمس پورا کرلیا۔ بعد ازآں کاتبوں نے ان اشعار کو سوداؔ ہی کی تصنیف سمجھ کر کلیات سوداؔ کے حصۂ غزلیات میں شامل کرلیا۔

سوداؔ اپنے معاصرین کے اشعار کو تضمین کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے میرؔ، قائمؔ اور تاباںؔ کی غزلوں کو بھی کلی یا جزوی طور پر تضمین کیا ہے۔خود یقینؔ کا ایک مصرع ان کے ایک مخمس ترجیع بند میں بہ طور مصرع ترجیع شامل ہے، اس مخمس کا آخری بند جس میں یقینؔ کے کلام کے بارے میں سوداؔ کی پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے، درج ذیل ہے۔

مصرع کو یقینؔ تیرے سوداؔ نے سنا تھا کل   روتا ہے وہ یوں تب سے برسے ہے گویا بادل
ہے رعد نمط نالاں بجلی کی طرح بے کل   پڑھتا ہے یہی پھر پھر آنکھوں کے تئیں مل مل
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

(ب)

خواب میں کس طرح دیکھوں تجھ کو بے خوابی کے ساتھ
جمع آسائش کہاں ہوتی ہے بے تابی کے ساتھ
کردیا آنکھوں نے رونے سے مرے دل کو خنک
کب تلک گرمی کروں میں مردم آبی کے ساتھ
مفت نھیں لیتے وفا کو شہر خوباں میں کہیں
کس قدر بے قدر ہے یہ جنس نایابی کے ساتھ
پونچھتے اس منہ کے ہوجاتا ہے سب رنگیں لباس
گل کہاں ہوتا ہے ایسے رنگ شادابی کے ساتھ
غنچۂ رنگیں کو سوداؔ چاہیے تہ کر رکھوں
اس کو کیا نسبت ہے ان لب ہائے عنابی کے ساتھ

پانچ اشعار کی یہ غزل راقم السطور کو کلام سوداؔ کے تین قلمی (۲۰) اور دو مطبوعہ (۲۱) نسخوں میں ملی۔دوسری

طرف پوری غزل دیوان یقینؔ مرتبہ فرحت اللہ بیگ میں موجود ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ زیر بحث غزل کا شعر نمبر ۳ یقینؔ کے یہاں مقطع ہے، جس کی شکل یہ ہے:

مفت نہیں لیتے وفا کو شہر خوباں میں یقینؔ
کس قدر بے قدر ہے یہ جنس نایابی کے ساتھ   (گردیزی ۱۵۹)

اور شعر نمبر ۵ یعنی شعر نمبر ۳ کی جگہ

(غنچۂ رنگیں کو اپنے چاہیے تہ کر رکھے
اس کو کیا نسبت ہے اس لب ہائے عنابی کے ساتھ)

اور شعر نمبر ۴ میں "رنگیں لباس" کی بجائے "رنگیں رومال" لکھا ہے۔

علاوہ بریں گردیزی نے مقطع، میرحسن اور لطف نے مطلع اور مقطع (شعر نمبر ۳) دونوں، مبتلاؔ نے مطلع، مقطع اور شعر نمبر ۳، علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے شعر نمبر ۴ مع مطلع و مقطع کلام یقینؔ میں شامل کیا ہے۔لہٰذا قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ غزل یقینؔ کی ہے، سوداؔ کی نہیں۔مبتلاؔ کے یہاں شعر نمبر ۵ کا مصرع اول یوں نقل ہے:

ع "غنچہ رنگیں کو اپنی چاہیے تہ کر رکھے"

(ج)

یہ جی میں ہے کہ (میں) اس بے وفا سے جا پوچھوں
ہمارے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے

یہ شعر یقینؔ کی ایک غزل ع "اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے" میں شامل ہے اور غلطی سے تذکرہ آزردہ میں سوداؔ سے منسوب کردیا گیا ہے۔دیوان یقینؔ اور تذکروں میں یقینؔ کے نام یہ شعر اس طرح درج ہے:

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے تو پوچھوں
کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے

(۵) سوداؔ اور مجذوبؔ

غلام حیدر بیگ مجذوبؔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے قابل ذکر شاعر ہیں۔قائمؔ، میرحسن، امراللہ الہ آبادی، علی ابراہیم خاں خلیلؔ اور عشقی عظیم آبادی کے بیانات کے مطابق "خلفِ سوداؔ" اور شورشؔ، قاسمؔ اور مصحفیؔ کے بقول "پسر خواندہ و شاگرد سوداؔ" تھے۔شوقؔ نے "منظور نظر و تربیت کردہ مرزا رفیع السودا از طفلی بہ طریق فرزندی خود او را پرورش دادہ" لکھ کر مذکورہ مجمل بیانات کی صراحت کردی ہے۔"طبع سلیم و فہم درست" رکھتے تھے اور شعر بھی اچھا کہتے تھے لیکن اب تک ان کے کسی کلیات یا دیوان کی موجودگی کا پتا نہیں چل سکا ہے۔تذکروں میں درج اشعار سے بس

اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مربی اور استاد سوداؔ کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے۔

(الف)

ع کب کسی دل سوختہ سے ساز کرتی ہے حنا

(۶ شعر) کلیات سودا (ص:۲۰۶)

چھ اشعار کی یہ غزل کلیات سوداؔ کے تمام نول کشوری ایڈیشنوں نیز نسخۂ مصطفائی میں پائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ قدرت اللہ قاسمؔ نے اس غزل کا مطلع سوداؔ کے نمونہ کلام میں نقل کیا ہے۔ برخلاف اس کے قدرت اللہ شوقؔ نے اپنے تذکرے ''طبقات الشعرا'' میں (ص ۳۸۲) اس غزل کا مطلع اور مقطع دونوں مجذوبؔ سے منسوب کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مجذوبؔ کی پوری غزل شوقؔ کے سامنے رہی ہوگی۔

(ب)

ہے سخت بے مروت وہ بت وفا کرے کیا
پر اب تو لگ گیا دل دیکھیں خدا کرے کیا

مندرجہ بالا مطلع کلیات سوداؔ کے نسخہ مصطفائی اور نول کشوری نسخوں اور دیوان غزلیات مرزا محمد رفیع سوداؔ مرتبہ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق میں مطلعات کے تحت درج ہے۔ ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی نے لندن کے ایک قلمی نسخے (۲۲) کی بنیاد پر اسے اپنے مرتب کردہ کلیات سوداؔ جلد اول کے حصہ چہارم میں رکھا ہے۔قاسمؔ نے بھی اسے اپنے یہاں ترجمہ سوداؔ ہی میں نقل کیا ہے لیکن مبتلاؔ اور سرورؔ نے اپنے اپنے تذکروں میں بالترتیب ص ۲۲۸ اور ص ۴۶۴ پر اس شعر کو مجذوبؔ سے منسوب کیا ہے۔

(ج)

ع ہم نے بھی دیر و کعبہ سے دن چار کی ہوس

(۹ شعر)(ص:۲۲۵)

نو اشعار کی یہ غزل (بہ استثنائے نسخۂ شمس) کلیات سوداؔ کے تمام مطبوعہ نسخوں اور صرف ایک قلمی نسخے میں ملتی ہے۔(۲۳) علاوہ ازیں انتخاب غزلیات سوداؔ مرتبہ شارب ردولوی (شائع کردہ اردو اکادمی، دہلی) میں بھی شامل کر لی گئی ہے۔اس کے برخلاف میر حسن نے اپنے تذکرے میں (ص ۱۹۳) پر اس غزل کا درج ذیل شعر مجذوبؔ کے نام سے نقل کیا ہے۔

گھر امن کا اسی کو ملا زیر آسماں جس نے جہاں میں آن کے مسمار کی ہوس

(د)

ع خاک وخوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں (۵ شعر)

یہ غزل (بہ استثنائے نسخۂ شمس) کلیات سوداؔ کے تمام مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے اور پروفیسر شیرانی مرحوم بھی اسے سوداؔ ہی کی تصنیف سمجھتے ہیں (۲۴) لیکن مختلف تذکروں میں اس غزل کے متفرق اشعار مجذوبؔ کے نام سے درج ہوئے ہیں مثلاً: میر حسن، امر اللہ الہ آبادی اور سرورؔ نے مقطع اور قدرت اللہ قاسمؔ اور محمد حسین آزاد نے مطلع اور مقطع دونوں کا انتساب مجذوبؔ کی طرف کیا ہے۔مقطع کا متن ہر جگہ مختلف ہے:

۱۔ آہ میں اپنی ثمر ڈھونڈھے ہے اے سوداؔ تو کیا
بید مجنوں کی نہ شاخیں ہم نے پھلیاں دیکھیاں (کلیات سوداؔ)

۲۔ آہ میں اپنی اثر ڈھونڈے ہے اے مجذوبؔ تو
بید مجنوں کی نہ شاخیں (ہم نے پھلیاں) دیکھیاں (مجموعہ نغز)

۳۔ آہ میں اپنی اثر ڈھونڈے ہے اے مجذوبؔ تو
بید مجنوں میں نہ شاخیں ہم نے پھلیاں دیکھیاں (عمدہ منتخبہ، آب حیات)

۴۔ آہ میں اپنی اثر ڈھونڈے ہے اے مجذوبؔ تو
سرو میں ہم نے لگیں اب تک نہ پھلیاں دیکھیاں (میر حسن، امر اللہ)

(ہ)

ہمیں کیا لطف ہے منہ دیکھنا وھاں یار کا اپنے (۴ شعر)
جہاں وعدہ اسے عالم سے ہو دیدار کا اپنے

یہ مطلع اور اسی زمین کے تین شعر (بہ استثنائے نسخۂ شمس) کلیات سوداؔ کے تمام مطبوعہ نسخوں میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے بھی ان اشعار کو اپنے تحقیقی مقالہ ''دیوان غزلیات سوداؔ'' میں شامل کیا ہے۔جب کہ معاصر تذکرہ نگار میر حسن نے یہ مطلع اور اشعار مذکور میں سے مندرجہ ذیل شعر مجذوبؔ کے نام سے نقل کیا ہے۔

''کیا ہے دل نے مستغنی وصال یار سے ہم کو
تصور دل میں نت رہتا ہے اس دلدار کا اپنے''

(و)

چاہوں مدد جو غیر سے اغیار کے لیے
تو میں بھی یار کم نہیں دو چار کے لیے
طوبیٰ تلے میں بیٹھ کے رووں گا زار زار
جنت میں تیرے سایۂ دیوار کے لیے

یہ دونوں شعر (بہ استثنائے نسخۂ شمس) کلیاتِ سودا کے تمام مطبوعہ نسخوں میں ملتے ہیں لیکن معاصر تذکروں میں ان کی نوعیت اس طرح ہے۔

میر حسن نے دونوں شعر اور ایک مقطع:

"مجذوب بہر سبحہ دو منت تھی شیخ سے
پھر برہمن سے عجز ہے زنار کے لیے

امر اللہ الہ آبادی نے صرف مطلع اور شوق نے دونوں اشعار کے ساتھ ایک مزید شعر ع "باغ جہاں میں آنے سے ہے گل کو کیا غرض"، سرور اور قاسم اور آزاد نے دونوں شعروں کے علاوہ ایک دوسرا شعر: ع "ہے دردِ سر ہی بلبلِ آزاد کی صفیر" اور مصحفی نے شعر مذکور کو جس کا مصرع اول ہے: ع "باغ جہاں میں......الخ"۔ کے سوا متذکرہ بالا چاروں اشعار بھی مجذوب کے ترجمہ میں نقل کیے ہیں۔ اس طرح تذکروں کی بنیاد پر مجذوب کے نام پانچ شعر کی غزل بنتی ہے، جو درج کی جاتی ہے:

چاہوں مدد کسی سے نہ اغیار کے لیے   میں بھی تو یار کم نہیں دو چار کے لیے ۱
ہے درد سر ہی بلبل آزاد کی صفیر   موزوں ہے نالہ مرغ گرفتار کے لیے ۲
طوبیٰ کے نیچے بیٹھ کے رووں گا زار زار   جنت میں تیرے سایۂ دیوار کے لیے ۳
باغ جہاں میں آنے سے ہے گل کو کیا غرض   جز یہ کہ تیرے گوشۂ دستار کے لیے ۴
مجذوب بہر سبحہ دو منت تھی شیخ سے   پھر برہمن سے عجز ہے زنار کے لیے ۵

کلیاتِ سودا میں "میں بھی تو یار" کی بجائے "تو میں بھی یار" اور "طوبیٰ کے نیچے بیٹھ کے" کی جگہ "طوبیٰ تلے میں بیٹھ کے" کے اختلافات ملتے ہیں۔

(ز)

اشراف یا کمینہ طلب گار ہو کوئی   دوں گا اسی کو دل جو طرح دار ہو کوئی

یہ مطلع کلیاتِ سودا کے مصطفائی اور نول کشوری ایڈیشنوں میں افراد کے تحت درج ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے بھی اسے اپنے مرتب کردہ دیوان غزلیات میں مطلعات کے زیرِ عنوان نقل کیا ہے، برخلاف اس کے میر حسن نے مطلع مذکور اور اسی زمین کا ایک شعر مجذوب کے کلام میں نقل کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

نہ سایۂ چمن میں نہ صیاد کے حضور   یارب مری طرح نہ گرفتار ہو کوئی

تذکرۂ میر حسن کے اس اندراج کی بنیاد پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مجذوب نے مکمل غزل کہی ہوگی جس کے دو شعر منتخب ہوئے ہیں اور مطلع غلطی سے سودا کے یہاں نقل ہو گیا ہے۔

(ح)

ع بے چین جو رکھتی ہے تمھیں چاہ کسو کی (۶ شعر)

چھ اشعار پر مشتمل بغیر مقطع کی یہ غزل (بہ استثنائے نسخۂ شمس) کلیاتِ سودا کے تمام مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے بھی اسے "دیوان غزلیات مرزا محمد رفیع سودا" میں شامل کیا ہے لیکن تذکرۂ شورش میں مطلع کے ساتھ درج ذیل مقطع بھی مجذوب کے نام سے درج ہے۔

"دنیا سے گزرنا بھی عجب کچھ ہے کہ مجذوب   کوئی نہ کبھو روک سکے راہ کسو کی"

اور تذکرہ سرور میں غزل زیر بحث کا ایک دوسرا شعر:

"زلفوں کی سیاہی میں کچھ اک دام [تھے اپنے]   قسمت کہ ہوئی رات سے تنخواہ کسو کی"

مجذوب کے نام سے ملتا ہے۔ اس طرح اب سات شعر کی ایک مکمل با مقطع غزل مجذوب کے نام سے بنتی ہے۔

(ط)

پوچھے نہ کبھو اشک وہ مغرور کسو کے (۹ شعر)

نو شعر کی یہ غزل نسخۂ مصطفائی، تمام نول کشوری ایڈیشنوں اور دیوان غزلیات مرزا محمد رفیع سودا مرتبہ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق میں موجود ہے، جب کہ معاصر شہادت اس غزل کے بارے میں سودا کے حق تصنیف کی نفی کرتی ہے۔ مثلاً شوق نے اس غزل کا مطلع اور ایک شعر جزوی اختلاف کے ساتھ مجذوب کی طرف منسوب کیا ہے۔ دونوں شعر درج ہیں:

۱ پوچھے نہ کبھی اشک وہ مغرور کسی کے   پڑ جائیں اگر چشم میں ناسور کسی کے
۲ آنکھوں سے جو نزدیک ہو کتنا ہی تو پھر کیا   جس روز پڑا دل سے کوئی دور کسی کے

کلیاتِ سودا میں شعر نمبر ۱ کے مصرع اول میں کبھی کی جگہ کبھو اور شعر نمبر ۲ کا مصرع اول تبدیل کر کے اس طرح لکھا ہوا ہے ع "ہو چشم سے کیسا ہی جو نزدیک تو پھر کیا" اور دونوں اشعار کے ردیف "کسی کے" کی بجائے "کسو کے" لکھے ہوئے ہیں۔

متذکرہ بالا روایت کے برخلاف مصحفی نے اس غزل کا مطلع اور ایک شعر نواب عماد الملک نظام کے نام سے نقل کیا ہے۔ دونوں اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

۱ پوچھے نہ کبھو اشک وہ مغرور کسو کے   پڑ جاویں اگر چشم میں ناسور کسو کے
۲ پھڑکاتی ہے کیا دختر رز شیشہ میں آنکھیں   قحبہ نہ ہوئی پردہ میں مستور کسو کے

(ی)

افسوس کہوں کس سے میں اپنے گھٹ کی قالب سے پھرے ہے روح بھٹکی بھٹکی
ان آنکھوں نے چین جی سے کھویا سودآ یہ خانہ خراب جس سے اٹکی اٹکی

یہ رباعی کلیات سودآ کے مطبوعہ نسخوں میں پائی جاتی ہے لیکن قلمی نسخے عام طور پر اس کے اندراج سے خالی ہیں۔ دوسری طرف شوقؔ نے کلیات سودآ میں شامل دوسرے بعض اشعار غزلیات کی طرح اس رباعی کو بھی مجذوبؔ کے نمونۂ کلام میں مجذوب تخلص کے ساتھ نقل کیا ہے۔

(۶) سودآ اور شیدآ (شاگرد سودآ)

میر فتح علی شیدآ، میر حسن اور عشقیؔ کے بقول میر سوزؔ کے پسر خواندہ اور سودآ کے شاگرد تھے۔ میرؔ، قائمؔ اور شفیقؔ کے معاصر تذکرے نکات الشعرا، مخزن نکات اور چمنستان شعرا ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ علی ابراہیم خاں خلیلؔ اور مصحفیؔ نے بھی انھیں میر سوزؔ کا متبنیٰ اور سودآ کا شاگرد لکھا ہے۔ مئو شمس آباد کے رہنے والے نہایت خلیق اور متواضع انسان تھے۔ سودآ کی زمینوں میں اسی طرز پر شعر کہتے تھے اور صاحب دیوان شاعر تھے جیسا کہ قاسمؔ نے لکھا ہے:

''دیوانش تاالیوم سہ ہزار بیت تخمیناً بر صفحۂ روزگار ثبت افتادہ'' (۲۵)

لیکن ابھی تک شیدآ کا کوئی مستقل دیوان دریافت نہیں ہوسکا ہے۔ معاصر تذکروں میں جتنا کلام محفوظ رہ گیا ہے وہی ان کا کل معلوم شدہ شعری اثاثہ ہے۔

کلیات سودآ کے بعض نسخوں میں ایک سو چودہ اشعار کی ایک مثنوی ع ''یارو! خدا ایک ہے اور دوسرے برحق نبی''، اور چند غزلیں ایسی ہیں جن کے متفرق اشعار تذکروں میں شیدآ کے نام سے درج ہیں۔ جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے شاگردوں کی طرح ان کا کلام بھی کلیات سودآ میں شامل ہوگیا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

(الف)

مثنوی: در ہجو فدوی

ع یارو! خدا ایک ہے اور دوسرے برحق نبی (۱۱۴/اشعار)

یہ مثنوی جو کلیات سودآ کے تمام مطبوعہ ایڈیشنوں کے علاوہ بعض قلمی نسخوں میں بھی شامل ہے یقیناً سودآ کی نہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ص ۳۳، ۳۴)

(ب)

تیرا ہے بہ زر مہر خریدار فلک پر (۹ شعر)

۹ اشعار کی یہ غزل کلیات سودآ کے تمام مطبوعہ نسخوں اور ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ چھ مخطوطات (۲۶) میں شامل ہے۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کی فراہم کردہ اطلاعات سے لندن کے چار اور قلمی نسخوں میں اِس غزل کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ (۲۷) لیکن کلیات سودآ کے یہ سبھی قلمی نسخے الحاقات و تصرفات سے یکسر پاک نہیں، تاہم صدیقی موصوف نے اس غزل کو لندن کے نسخوں کی بنیاد پر اپنے مرتبہ کلیات سودآ جلد اول کے حصہ دوم میں جگہ دی ہے۔ حصہ دوم میں موجود غزلوں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ ''گمان غالب ہے کہ سودآ کی ہی ہیں'' نیز ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے اس غزل کو ''دیوان غزلیات سودآ'' میں شامل کیا ہے۔ دوسری طرف شورشؔ نے اس غزل کا درج ذیل شعر شیدآ کے نمونۂ کلام میں نقل کیا ہے:

ہے چہرہ بدل مہر مرے شوخ سے یارو! کچھ اس کی جھمکتی نہیں دستار فلک پر

(ج)

اظہار سخن کیجیے کیا خاک زمیں پر (۱۰ شعر)

ردیف 'ر' کی یہ غزل دس اشعار پر مشتمل ہے اور کلیات سودآ کے تمام مطبوعہ نسخوں (بہ استثنائے نسخہ شمس) اور چھ قلمی نسخوں (۲۸) میں موجود ہے اور ''دیوان غزلیات سودآ'' مرتبہ ہاجرہ ولی الحق میں بھی شامل ہے لیکن ''تذکرہ مسرت افزا'' میں (ص ۷۳) اس غزل کا مطلع شیدآ کے نام سے نقل ہے۔

(د)

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں (۹ شعر)

یہ غزل بھی (بہ استثنائے نسخہ شمس) کلیات سودآ کے تمام مطبوعہ ایڈیشنوں میں شامل ہے، لیکن میر حسن، مبتلاؔ، خلیلؔ، امر اللہ اور عشقیؔ نے اس غزل کا مطلع اور ایک شعر اور سرورؔ اور نساخ نے صرف مطلع شیدآ کے نام سے نقل کیا ہے۔ یہ دونوں شعر درج ذیل ہیں:

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں ۱
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں
آئے تھے کیوں عدم سے کیا کر چلے جہاں میں ۲
یہ مرگ و زیست دونوں آپس میں ہستیاں ہیں

سودآ کے یہاں دوسرے شعر کا متن کسی قدر مختلف ہے:

آیا تھا کیوں عدم سے کیا کر چلا جہاں میں یہ مرگ و زیست تجھ بن آپس میں ہسیتاں ہیں

مطلع کو خوب چند ذکا کے تذکرہ میں خواجہ ہیگا متخلص بہ شیدا کے نام سے نقل کر دیا گیا ہے۔

(ہ)

چوڑائی میں ٹک اپنے عدو اور بھی جم لے (۱۰ شعر)

یہ غزل بھی کلیات سودا کے تمام مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے۔ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کے مطابق یہ غزل لندن کے صرف ایک قلمی نسخے میں ملتی ہے(۲۹)اور اسی کے حوالے سے انھوں نے اسے کلیات سودا جلد اول کے حصہ چہارم میں شامل کیا ہے نیز ہاجرہ ولی الحق نے اسے ''دیوان غزلیات سودا'' میں درج کیا ہے۔جب کہ معاصر تذکرہ نگار شورش کے یہاں اس غزل کا درج ذیل شعر شیدا کے نام سے منقول ہے:

میں دیکھنے والا ہوں جفا عشق کے نالے   اے حسن کش آکے نہ مرا ہاتھ قلم لے

اس شعر میں کئی غلطیاں ہیں جو اصل متن کو صحیح طور پر نہ پڑھ سکنے کے نتیجے میں در آئی ہیں۔کلیات سودا کے مطابق اس کی صحیح صورت حسب ذیل ہے:

میں کھینچنے والا ہوں جفا عشق کی مانی   اے حسن کش آگے نہ مرے ہاتھ قلم لے

(و)

۱ میں تو ملوں گا ناصحا باتیں یہ تینوں جان کے
گو کہ عدو ہیں خوب رو، دل کے، جگر کے، جان کے
۲ شکل تری کے، اے میاں! بندے ہیں کتنے آن کے
منہ کی مسی کے، رُخ کی لالی کے، لب کے پان کے
۳ منہ سے نقاب اُٹھتے ہی حلقہ بگوش ہوگئے
خال کے خط کے زلف کے، بالی کے، دُر کے کان کے
۴ بندے ہوئے یہ شش جہت ہم دل و جان سے مطربا
تال کے سر کے، ساز کے، نے کے، صدا کے تان کے
۵ ان شعرا میں ہم نہیں وہ جو طلب میں پھرتے ہیں
تیل کے گھی کے لون کے جو کے گیہوں کے دھان کے
۶ خلق تمام جانے ہے ہم بھی سخنوروں میں ہیں
رتبہ کے، ذہن کے، نام کے، جاہ کے، ذی کے شان کے
۷ سودا کو تم سمجھتے تھے کہہ نہ سکے گا یہ غزل
آفریں ایسے وہم پر صدقے میں اس گمان کے

یہ غزل (بہ استثنائے نسخۂ شمس اور نسخۂ ہاجرہ) کلیات سودا کے تمام اڈیشنوں میں ملتی ہے۔ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب ''مرزا محمد رفیع سودا'' میں لکھ دیا ہے کہ ''قاسم نے یہ غزل مجذوب سے منسوب کی ہے'' (ص ۴۱۵) ڈاکٹر محمد حسن نے بھی خلیق انجم کی پیروی میں اسے مجذوب کی تصنیف بتایا ہے۔(مقدمہ کلیات سودا جلد اول ص ۳۸ طبع ۱۹۶۹ء) حالانکہ قاسم نے اس غزل کے پانچ اشعار (بہ استثنائے شعر نمبر ۲ و ۵) شیدا کے نمونۂ کلام میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

''ایں غزل در کلیات سر آمد سخن سنجان فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا دیدہ۔اغلب کہ بعضے بہ غلطی ثبت نمودہ باشد یا بود کہ از مرزائے مغفور است واللہ اعلم بحقیقۃ الحال'' (مجموعۂ نغز، جلد اول،ص ۳۵۶)''

قاسم نے سودا کا جو منتخب کلام اپنے تذکرے میں نقل کیا ہے اس میں کئی الحاقی اشعار شامل ہیں۔اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے سامنے کلیات سودا کا جو نسخہ تھا وہ معتبر نہیں تھا۔مجموعۂ نغز میں منقول اشعار کا متن سوائے مطلع کے چونکہ کسی قدر مختلف ہے اس لیے اس تذکرے سے یہ اشعار سطور ذیل میں نقل کیے جارہے ہیں تاکہ اختلاف کی نوعیت کا اندازہ کیا جاسکے۔

۱ منہ سے الٹتے ہی نقاب حلقہ بگوش ہوگئے
خال کے، خط کے، زلف کے، بالے کے، در کے، کان کے
۲ بندے ہوئے بہ شش جہت، ہم دل و جان سے مطربا
تال کے، سر کے، (ساز کے)، لے کے، صدا کے، تان کے
۳ خلق تمام جانے ہے ہم بھی سخنوروں میں ہیں
رتبے کے، ذہن کے، نام کے، جان کے، ذی کے، شان کے
۴ تس (پہ) ہمیں یہ سمجھے آپ کہہ نہ سکیں (گے) یہ غزل
(آفریں ایسے وہم پر) صدقے ہیں اس گمان کے

(۷) سودا اور فغاں

اشرف علی خان نام فغاں تخلص اور ظریف الملک خطاب تھا، احمد شاہ بادشاہ کے رضاعی بھائی ہونے کے ناتے عرف عام میں کوکہ خاں کے لقب سے مشہور تھے۔اردو میں علی قلی خاں ندیم سے اور فارسی میں قزلباش خاں امید سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔مصحفی نے لکھا ہے کہ ''در ابتدائے عمر موزونی طبع بہ تتبع مرزا رفیع در شاہ جہاں آباد بہ ریختہ گوئی بر آوردہ''۔سودا نے بھی ان کے اشعار کو تضمین کیا ہے۔مندرجہ ذیل چار اشعار ان دونوں کے کلام میں مشترک ہیں۔

(الف)

مجھ سے جو پوچھتے ہو بہر حال شکر ہے — یوں بھی گزر گئی مری ووں بھی گزر گئی

راقم السطور کو یہ شعر کلیاتِ سوداؔ کے صرف ایک قلمی نسخے میں ملا ہے (۳۰) ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے برٹش میوزیم کے بھی ایک قلمی نسخے (۳۱) میں اس کی موجودگی کی نشان دہی کی ہے۔ دوسری طرف یہی شعر دیوانِ فغاںؔ میں پانچ اشعار کی ایک غزل ''ع کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گزر گئی'' میں موجود ہے۔ میر حسن اور مصحفیؔ نے یہ مکمل غزل فغاںؔ کے انتخابِ کلام میں شامل کی ہے۔ سرورؔ نے اس غزل کے تین شعر اپنے تذکرے میں فغاںؔ کے نام سے نقل کیے ہیں۔ ان میں زیرِ بحث شعر بھی شامل ہے۔ علاوہ بریں علی نقی خاں انتظارؔ کی مندرجہ ذیل تضمین سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ شعر فغاںؔ کا ہے:

مصرع پڑھا فغاںؔ کا میں اُٹھ اس کے رو برو
''یوں بھی گزر گئی مری ووں بھی گزر گئی''

(ب)

تنہا اگر میں یار کو پاووں تو یوں کہوں
انصاف کو نہ چھوڑ، مروت اگر گئی

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی کی اطلاع کے مطابق یہ شعر برٹش میوزیم میں محفوظ ''دیوانِ سوداؔ'' کے ایک قلمی نسخے (۳۲) میں سوداؔ کی غزل ع: ''تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یہاں خاک کر گئی'' میں شامل ہے۔ لیکن سابق الذکر شعر کی طرح یہ شعر بھی دیوانِ فغاںؔ میں موجود ہے۔ مزید برآں میر حسن اور سرورؔ نے اسے فغاںؔ ہی کے نمونہ کلام میں نقل کیا ہے۔

(ج)

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سرخ کا — تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

سوداؔ نے اپنی غزل ع ''تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یہاں خاک کر گئی'' میں اٹھارہ اشعار بطور قطعہ بند کہے ہیں۔ ان مسلسل اشعار کا اختتام مندرجہ بالا شعر پر ہوا ہے۔ لیکن محولہ بالا دونوں اشعار کی طرح یہ شعر بھی فغاںؔ کی غزل میں شامل ہے۔ گردیزی نے اس شعر کو سوداؔ اور فغاںؔ دونوں کے نمونہ کلام میں نقل کر کے مسئلہ مزید پیچیدہ کر دیا ہے۔ لیکن گردیزی کے علاوہ دوسرے تمام تذکرہ نگاروں نے یہ شعر فغاںؔ ہی کے کلام میں درج کیا ہے بلکہ محمد تقی میرؔ، میر حسن، شوقؔ اور شورشؔ نے تو اس بات کی صراحت بھی کر دی ہے کہ سوداؔ نے فغاںؔ کے اس شعر کو ایک قطعے میں تضمین کیا ہے۔

(د)

کٹی ہیں یاد میں بے طرح راتیں ہجر کی بڑیاں
لکیریں انگلیوں کی مٹ گئیں گنتے ہوئے گھڑیاں

کلیاتِ سوداؔ کے جتنے نسخے راقم السطور کی نظر سے گزرے ہیں اُن میں سے صرف ایک (۳۳) میں فردیات کے تحت یہ شعر درج ہے۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے لندن کے ایک نسخے میں (۳۴) بھی اس کی موجودگی کی نشان دہی کی ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے اسے سوداؔ کی غزل ع: ''ملائم ہو گئیں دل پر برہ کی ساعتیں کڑیاں'' کے ساتھ اپنے مرتب کردہ ''دیوان غزلیات مرزا محمد رفیع سوداؔ'' میں شامل کیا ہے۔

دوسری طرف ''دیوان فغاں'' مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن مطبوعہ ۱۹۵۰ء (کراچی) سے اس کا فغاںؔ کی تصنیف ہونا ثابت ہوتا ہے۔ نیز قائمؔ، میر حسن، مبتلاؔ اور علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے بھی اس شعر کو (بہ ادنیٰ اختلاف متن) فغاںؔ ہی سے منسوب کیا ہے۔ تاباںؔ کی مندرجہ ذیل تضمین سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ شعر دراصل فغاںؔ ہی کا ہے۔

''فغاں آتا نہیں وہ شوخ میرے ہاتھ اے تاباںؔ
لکیریں انگلیوں کی مٹ گئیں گنتے ہوئے گھڑیاں''

مزید برآں کلام سوداؔ کے ایک قلمی نسخہ (بنا) مرقومہ ۱۱۷۷ھ کے آخر میں یہ شعر ''تصنیف فردیات وغیرہ از دیگراں'' کے عنوان سے درج ہے۔

(۸) سوداؔ اور بیانؔ

خواجہ احسن اللہ خاں بیانؔ مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد تھے۔ میر حسن کے بیان کے مطابق اُن کی ولادت شاہجہان آباد میں ہوئی تھی، جب کہ علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے اکبر آباد کو اُن کا مولد اور دہلی کو اُن کا مسکن قرار دیا ہے۔ ''زاد گاہ'' کے معاملے میں شفیقؔ، مبتلاؔ، شورشؔ اور امراللہ الہ آبادی بھی خلیلؔ کے ہم خیال ہیں۔

بیانؔ کی خوش گوئی اور زبان دانی کا تمام معاصر تذکرہ نگاروں نے اعتراف کیا ہے۔ میر حسن انھیں ''شاعر عذب البیان'' قرار دیتے ہوئے ''خوش گویان زبان'' میں شمار کرتے ہیں۔ شورشؔ اُن کی طبیعت کی معنی ایجادی سے متاثر ہیں۔ قدرت اللہ شوقؔ نے انھیں ''شاعر مربوط و مضبوط و خوش گو''، علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے ''شاعر شیریں بیاں''، مصحفیؔ نے ''شاعر مربوط و صاحب زباں'' اور عشقیؔ نے ''خوش فکر و فصیح زماں'' لکھ کر انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ دوسرے معاصر شعرا کی طرح بیانؔ کا کچھ کلام بھی غلطی سے کلیاتِ سوداؔ کے بعض نسخوں میں شامل ہو گیا ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(الف)

مثنوی در ہجو چیچ مرزا فیضو (۶۴ شعر)

ع آہ واویلا ز دست روزگار

چونسٹھ اشعار کی یہ مثنوی کلیات سودا کے تقریباً تمام مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے لیکن بعض معاصر تذکرہ نگاروں نے اسے بیان کی طرف منسوب کیا ہے۔ مثلاً میرحسن نے اُن کے حال میں لکھا ہے کہ "چیچک نامہ از و مشہور ست" یا قاسم لکھتے ہیں کہ "در مثنوی خود مسمیٰ بہ چیچک نامہ داد شاعری دادہ" مزید یہ کہ یہ مثنوی سرسالار جنگ میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ دیوان بیان کے ایک قلمی نسخے میں بھی موجود ہے۔ اس طرح بیان کی طرف اس کے انتساب میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(ب)

مثنوی در تعریف چاہ مومن خاں (۱۸ شعر)

ع رہ کے دنیا میں کیجیے وہ فکر

کلیاتِ سودا کے مطبوعہ نسخوں میں شامل یہ مثنوی بھی دیوان بیان کے متذکرہ بالا قلمی نسخے میں موجود ہے۔

(ج)

(۱) کیا زلف میں اس شوخ کے تھی دبکی صبح
جوں شام سے ہوتی ہے کسی شب کی صبح
جب زلف کو میں ہاتھ لگایا اودھر
ہمسایہ پکارا کہ ہوئی کب کی صبح

(۱۱) آیا ہوں بہ تنگ دور رہتے رہتے
لوگوں سے تھکا پیام کہتے کہتے
روتا ہوں کہ سیل اشک جاری ہووے
پہنچوں میں گلی میں اس کی بہتے بہتے

کلیات سودا کے مصطفائی اور نول کشوری ایڈیشنوں میں یہ دونوں رباعیاں موجود ہیں۔ اور ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے لندن کے تین قلمی نسخوں (ب، ف، فو) کے حوالے سے دوسری رباعی کو اپنے مرتبہ کلیات سودا جلد چہارم کے حصہ سوم (ص ۲۶۴) میں جگہ دی ہے۔ اس کے برخلاف یہ دونوں رباعیاں قائم چاند پوری کے

تذکرے میں بیان کے نمونہ کلام میں نقل ہیں۔ پہلی رباعی کو قائم کے علاوہ میرحسن، مبتلا، امر اللہ اور خلیل نے بھی بیان ہی سے منسوب کیا ہے۔ مزید برآں کلامِ سودا کے نسخہ (بنا) مرقومہ ۱۱۷۷ھ میں دوسری رباعی "تصنیف فردیات وغیرہ از دیگراں" کے تحت درج ہے۔

(۹) سودا اور تاباں

میر عبدالحیٔ تاباں دہلوی محمد علی حشمت کے شاگرد اور مرزا رفیع سودا کے ایک ممتاز ہم عصر تھے۔ میرحسن نے انھیں "شاعر بامزہ و رنگیں طبع" قرار دیا ہے۔ دوسرے تذکرہ نگار بھی اُن کی "شیرینی گفتار" اور "آب داری اشعار" کے قائل ہیں۔ علی ابراہیم خاں خلیل نے لکھا ہے کہ: "مجالست با مرزا مظہر و مرزا محمد رفیع سودا داشت" لیکن مرزا علی لطف کے الفاظ یہ ہیں:

"تاباں۔۔۔ میرزا جانجاناں مظہر سے اور مرزا رفیع سودا سے ہمیشہ صحبت رکھتے تھے بلکہ مرزا رفیع سودا بنابر اک نظر توجہ کے کہ اُن کے حال پر تھی، اکثر اشعار کو اُن کے اصلاح کرتے تھے"۔

اور لطف ہی کی پیروی میں نساخ، شیفتہ اور باطن نے انھیں شاگرد سودا لکھا ہے۔ تاباں کا سودا سے اصلاح لینا معتبر ذرائع سے ثابت نہیں۔ تاہم دونوں کے کلام میں چند اشعار مشترک ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

(الف)

"گل زمیں سے جو نکلتے ہیں بہ رنگ شعلہ
کون دل سوختہ جلتا ہے تہ خاک ہنوز

درج بالا شعر کلیات سودا کے تمام نول کشوری ایڈیشنوں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود نو قلمی نسخوں (۳۵) میں شامل ایک غزل ع "کس کے ہیں زیر زمیں دیدۂ نمناک ہنوز" میں ملتا ہے۔ علاوہ بریں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے لندن کے تین قلمی نسخوں اور نسخۂ آسی کے حوالے سے اس شعر کو اپنے مرتب کردہ کلیات سودا جلد اول (ص ۲۱۱) کے حاشیہ پر نقل کیا ہے اور ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے اپنے مرتبہ غزلیات سودا میں اسے غزل مذکور کے متن کے طور پر شامل کر لیا ہے، نیز خوش معرکہ زیبا اور گلستان بے خزاں میں بھی یہ شعر سودا ہی کے نام سے درج ہوا ہے۔ دوسری طرف سرور کے تذکرے "عمدۂ منتخبہ" اور دیوان تاباں مرتبہ مولوی عبدالحق سے اس کا تاباں کی تصنیف ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ان دونوں انتسابات کے برخلاف مبتلا نے یہ شعر تاباں کے نام درج کیا ہے لیکن مصرع اول میں بادنیٰ تصرف یہی شعر منت کے نام سے بھی درج ہے اور خلیل نے اس شعر کو میر قمر الدین منت کے ترجمہ میں نقل کیا ہے۔ خلیل کے یہاں مصرع اول اس طرح منقول ہے:

گل نکلتے ہیں زمیں سیتی برنگ شعلہ

(ب)

’’میں نے کہا کہ کون ہے قاتل مرا بتا　　کہنے لگا پکڑ کے وہ تیغ و سپر کہ ہم‘‘

یہ شعر کلیاتِ سوداؔ کے عام نسخوں میں موجود نہیں۔ راقم السطور کو صرف ایک قلمی نسخے (مملوکہ ڈاکٹر ولی الحق انصاری) میں دستیاب ہوا ہے۔ مصرع اوّل میں معمولی سے تغیر کے ساتھ یہی شعر دیوان تاباںؔ میں بھی موجود ہے۔ دیوان تاباںؔ میں پہلا مصرع اس طرح منقول ہے: ’’پوچھا میں اس سے کون ہے قاتل مرا بتا‘‘ مزید برآں شورشؔ اور مبتلاؔ نے اس شعر کو تاباںؔ کے نمونۂ کلام ہی میں نقل کیا ہے۔

(ج)

’’اوروں سے چھٹے دلبر دلدار ہووے میرا
برحق ہیں اگر پیرو! کچھ تم میں کراماتیں‘‘

یہ شعر کلیات سوداؔ کے تمام مطبوعہ نسخوں کے علاوہ نو قلمی نسخوں (۳۶) میں بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق لندن کے تین اور قلمی نسخوں میں یہ شعر موجود ہے۔ انھیں نسخوں اور نسخہ آسی کے حوالے سے انھوں نے اسے اپنے مرتبہ کلیات سوداؔ جلد اول میں حاشیے پر جگہ دی ہے اور راجرہ ولی الحق نے اپنے یہاں غزل ع ’’عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں‘‘ میں شامل کرلیا ہے۔ لیکن دیوان تاباںؔ میں اس کی موجودگی اسے مشتبہ بنا دیتی ہے۔ تاباںؔ نے اس غزل کے مقطع میں سوداؔ کے ایک مصرع کو اس طرح تضمین کیا ہے:

’’سوداؔ میں گزرتی ہے کیا خوب طرح تاباں　　دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں‘‘

کلیات سوداؔ میں الحاق کے چند در چند شواہد کی بنا پر سوداؔ کی طرف اس کا انتساب شکوک وشبہات سے خالی نہیں۔

(د)

’’پہنچی نہ تجھ کو ہائے مرے حال کی خبر　　قاصد گیا تو اُن نے بھی اپنی ہی کچھ کہی‘‘

یہ شعر کلیات سوداؔ کے تقریباً تمام مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں شامل ایک غزل: ’’جس دن تری گلی کی طرف ٹک پون بہی‘‘ میں مطلع کے بعد درج ہے۔ علاوہ بریں نکات الشعرا، تذکرۂ گردیزی اور تذکرۂ شورش میں سوداؔ کے نمونۂ کلام میں نقل ہوا ہے۔ دوسری طرف ’’دیوان تاباںؔ‘‘ مرتبہ مولوی عبدالحق میں بھی یہ شعر اسی زمین کی ایک غزل میں شامل ہے لیکن حاشیے میں مرتب کی یہ عبارت درج ہے: ’’یہ شعر نسخہ مدراس کے سوا ایک اور قلمی دیوان میں زائد ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے داخل ہوگیا ہے، اس لیے کہ کلیات سوداؔ میں یہ شعر موجود ہے‘‘۔

(ہ)

بوؤں میں تخم گل کو جہاں وہاں زقوم ہو　　پالوں جو عندلیب قفس میں تو بوم ہو

یہ مطلع ایک اور شعر کے ساتھ کلیات سوداؔ کے تمام مطبوعہ اور بیشتر قلمی نسخوں میں موجود ہے۔ میرؔ، قائمؔ اور شورشؔ نے اِن دونوں اشعار کو سوداؔ ہی کے کلام میں نقل کیا ہے اور دیوانِ تاباںؔ میں یہ مطلع پانچ بندوں کے ایک مسدس میں ٹیپ کے شعر کی حیثیت سے شامل ہے۔ لیکن مسدس کے آخری بند کے اس مصرع ’’سوداؔ کی ایک بیت یہی انتخاب کی‘‘ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تاباںؔ نے اس شعر کو تضمین کیا ہے۔

(و)

۱۔ عشرت سے دو جہاں کی یہ دل ہاتھ دھو سکے
تیرے قدم کو چھوڑ سکے یہ نہ ہوسکے

۲۔ جس سرزمیں پہ جاکے روؤں تیری یاد میں
دہقاں کچھ اس زمیں میں بجز دل، نہ بوسکے

یہ دونوں اشعار کلیات سوداؔ کے تقریباً تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں موجود ہیں۔ میرؔ، شورشؔ اور رام اللہ الہ آبادی نے دونوں اشعار، گردیزی، میر حسن اور مبتلاؔ نے صرف مطلع سوداؔ کے نمونۂ کلام میں نقل کیا ہے۔ برخلاف ان شواہد کے ڈاکٹر اکبر حیدری نے شفیقؔ او رنگ آبادی کے حوالے سے ان اشعار کو تاباںؔ کی تصنیف بتایا ہے (۳۷) اور اپنے ایک مضمون ’’سودا کا الحاقی کلام‘‘ (مشمولہ دوماہی اکادمی، لکھنو، ستمبر ۱۹۸۱ء) میں ان اشعار کو الحاقی کلام کے تحت نقل کیا ہے (۳۸) ڈاکٹر موصوف اپنے ایک دوسرے مضمون ’’کلیات سوداؔ کے مطبوعہ و قلمی نسخے‘‘ (مشمولہ دوماہی اکادمی، مئی ۱۹۸۲ء) میں لکھتے ہیں کہ ’’یہ دونوں شعر نسخہ آسی (ص ۲۰۱) جلد اول میں ہیں نسخہ جانسن یا کسی اور مستند قلمی نسخے میں نہیں ہیں۔‘‘

لیکن یہ اشعار ’’چمنستان شعرا‘‘ میں تاباںؔ سے منسوب نہیں ہیں بلکہ ترجمۂ سوداؔ میں نموناً جو کلام درج ہے، اس میں یہ بھی شامل ہیں۔ البتہ ان اشعار سے پہلے نقل ایک دوسرے شعر:

’’پہنچی نہ آہ تجکو مرے حال کی خبر
قاصد گیا تو ان نے بھی اپنی ہی کچھ کہی‘‘

کے بارے میں تذکرہ نگار نے یہ اطلاع دی ہے کہ:

’’ایں بیت کہ مذکور شد در دیوان تاباں ہم بنظر در آمد (تذکرہ ’’چمنستان شعرا‘‘ طبع اول، ص ۳۶۷)

دراصل حیدری صاحب کو تسامح ہوا ہے اور انھوں نے ان اشعار کو مشکوک کلام کے تحت نقل کر دیا۔

(ز)

ہوا ہے اب کی سودؔا زور کیفیت سے دیوانا
مزا رکھتا ہے اس عالم میں اک دم اس سے مل جانا
لبوں پر مہر خاموشی زباں اوپر صد افسانا
جو کوئی بات پوچھے ہے تو اشک آنکھوں سے بھر لانا
کبھو گھبرا کے رو دینا کبھو ہنس دے کے رہ جانا

مخمس کا یہ بند کلیات سودؔا کے تمام مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے۔لیکن ''خم خانۂ جاوید'' کے مصنف نے غالباً کسی قلمی نسخے کی بنیاد پر اس بند کے علاوہ گیارہ مزید بند بہ عنوان ''مخمس میرزا محمد رفیع سودؔا بر غزل تجلی'' سودؔا کے ترجمے میں نقل کیے ہیں، دوسری طرف یہ گیارہ بند مزید چھ بندوں کے اضافے کے ساتھ صرف ''مخمس'' عنوان کے تحت دیوانِ تاباںؔ مرتبہ مولوی عبدالحق میں بھی موجود ہیں۔علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے بھی اس مخمس کے چار بند ''مخمس'' کے زیرِ عنوان تاباںؔ کے انتخاب کلام میں شامل کیے ہیں۔متذکرہ تینوں مآخذ میں مشترک بندوں میں بعض مقامات پر لفظی اختلافات بھی موجود ہیں۔مثال کے طور پر مخمس کے آخری بند کی تینوں روایتیں درج ذیل ہیں:

''خم خانۂ جاوید''

کبھو راتوں کو میں کرتا ہوں گھر میں نالہ و افغاں
کبھو پھرتا ہوں تنہا شہر میں وحشت سے سر عریاں
کبھو ہوتا ہے میرے ساتھ سودؔا مجمع طفلاں
تجلیؔ اس طرح سے دیکھ کر اب خوار و سر گرداں
کوئی کہتا ہے سودائی کوئی کہتا ہے دیوانا

[منقولہ بالا بند کے ٹیپ کے مصرع ''ع کوئی کہتا ہے۔الخ''، کو سودؔا کے ایک معاصر جعفر علی حسرتؔ نے تاباںؔ کے نام سے اپنے ایک مخمس میں تضمین کیا ہے (کلیات حسرت مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ص ۹۹)]

''دیوان تاباںؔ''

کبھی راتوں کے تئیں کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
کبھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
کبھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تاباں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مرے تئیں اس طرح سے دیکھ کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
کوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''گلزار ابراہیم''

کبھی راتوں کے تئیں کرتا ہوں (گھر میں) نالہ و افغاں
کبھی پھرتا ہوں صحرا بیچ (میں) وحشت ستی عریاں
کبھی ہوتا ہے تاباںؔ ساتھ میرے محشر طفلاں
مرے تئیں ۔۔۔۔۔۔۔ کر سب خوار (و) سر گرداں
کوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(باقی آئندہ)

☆☆☆☆☆

حواشی:

۱۔سعادت خاں ناصر نے جعفر علی حسرتؔ کے ذکر میں لکھا ہے۔''ایک دن میر سوز نے مرزا رفیع السودا سے کہا کہ ہم حسرتؔ کو آپ کی طرف سے ناصاف اور ہر باب میں خلاف پاتے ہیں، شکنجۂ ہجو سے اس کو مالش دیا چاہیے اور معترف اپنے قصور کا اسے کیا چاہیے۔سودؔا نے فرمایا:''میں اُس کی ہجو کرتا ہوں جو شاعر ہو نہ کہ ایسے ناشاعر کی۔یہ رباعی تمھارے نام سے کہی جاتی ہے۔اس کی تنبیہ کو کافی ہوگی''۔بعد ازآں ایک رباعی ع ''کیوں سوز پہ حسرت کا نہ دل ہووے سپند'' نقل کی ہے۔(خوش معرکہ زیبا، جلد اول، مرتبہ مشفق خواجہ، ص ۵۰۔۲۴۹)

۲۔ایضاً ص ۲۱۵

۳۔''تذکرۂ شعرائے اردو'' از میر حسن مطبوعہ ۱۹۲۲ء، ص ۱۲۱

۴۔''طبقات الشعرا'' از قدرت اللہ شوقؔ ص ۴۸۵ و ۴۸۸

۵۔ایضاً

۶۔''تذکرہ ہندی'' مرتبہ عبدالحق طبع اول ص ۱۰۶

۷۔''مجموعہ نغز'' از قدرت اللہ قاسم، جلد ۱ ص ۲۷۶

۸۔''خمخانۂ جاوید'' از لالہ سری رام ص ۵۱۳

۹۔''کلیاتِ سودؔا کا پہلا مطبوعہ نسخہ'' از قاضی عبدالودود، سویرا ص ۵۸

۱۰۔ایضاً ص ۵۵

۱۱۔ اِن دو غزلوں کے علاوہ اٹھارہ مراثی مہربان خاں یا مہربان تخلص کے ساتھ کلیاتِ سودؔا کے بعض نسخوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی مرثیہ سوز کے نام سے نہیں ملتا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو قاضی عبدالودود مرحوم کے محولہ بالا مقالے کا ص ۵۷ و ۵۸ اور شیخ چاند مرحوم کی کتاب ''سودؔا''۔

۱۲۔ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے بھی اسے اپنے تحقیقی مقالہ ''دیوان غزلیات سودؔا'' میں شامل کیا ہے۔ ص ۴۰۱

۱۳۔ (۱) نسخہ انڈیا آفس نمبر بی ۷ ۱۴ یو ۶۳ (۲) نسخہ برٹش میوزیم نمبر اے ڈی ڈی ۸۹۲۲

۱۴۔ دیوانِ غزلیات سودؔا مرتبہ ہاجرہ ولی الحق میں ص ۴۷۵ پر موجود ہے۔

۱۵۔ نسخہ انڈیا آفس نمبر بی ۷ ۱۴، یو ۶۳

۱۶۔ ''سودؔا'' از شیخ چاند، طبع ثانی انجمن ترقی اردو پاکستان، ص ۱۱۸

۱۷۔ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے اپنے تحقیقی مقالہ ''دیوانِ غزلیاتِ سودؔا'' کے مقدمے میں سوزؔ کی ایک سو چھبیس غزلیں کلیاتِ سودؔا میں الحاق قرار دی ہیں، جن میں ایک غزل 'روتا ہے تیرے غم میں دلِ زار، زار زار' راقم السطور کو سودؔا کے کسی دیوان یا کلیات میں نہیں ملی۔ بقیہ دس غزلوں میں سے ایک غزل ع 'آنکھیں بھی اس کی آنکھوں سے گر ٹک ملا کریں'، غالباً درج ہونے سے رہ گئی ہے۔ دوسری غزل ع 'اے گل صبا کی طرح پھرے اس چمن میں ہم' ڈاکٹر موصوفہ کے بیان کے مطابق کلیاتِ سوزؔ میں نہیں ہے جب کہ اردوئے معلی کے سوزؔ نمبر میں ص ۲۴۶ پر یہ غزل موجود ہے۔ اور آٹھ غزلیں جو اردوئے معلّی سوز نمبر میں موجود ہیں اُن کے نزدیک سودؔا کی ہیں۔

۱۸۔ (۱) نسخہ بنارس یونیورسٹی نمبر U1×3/68/4 (۲) ایضاً نمبر U1×3/70/1

۱۹۔ بحوالہ ''مرزا محمد رفیع سودؔا'' از ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۴۹۷

۲۰۔ (۱) نسخہ خدا بخش ایچ۔ ایل۔ نمبر ۱۵۵ (۲) نسخہ ادارۂ ادبیات اردو نمبر ۷۹۳ (۳) نسخہ اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد دکن (آصفیہ) نمبر ۹۸

۲۱۔ (۱) کلیات سودؔا مرتبہ محمد شمس الدین صدیقی، جلد ۱، حصہ چہارم، ص ۶۵۸ (۲) دیوان غزلیاتِ سودؔا، مرتبہ ہاجرہ ولی الحق، ص ۴۷۳

۲۲۔ نسخہ انڈیا آفس لندن نمبر بی ۷ ۱۴، یو ۶۳

۲۳۔ نسخہ سر سالار جنگ نمبر ۱۶۵

۲۴۔ 'پنجاب میں اردو' از پروفیسر محمود شیرانی، طبع اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ص ۱۷

۲۵۔ ''مجموعہ نغز''، جلد اول، ص ۳۵۶

۲۶۔ (۱) نسخہ خدا بخش نمبر ایچ۔ ایل ۱۵۵ (۲) نسخہ ادارۂ ادبیات اردو نمبر ۷۹۳ (۳) نسخہ سر سالار جنگ میوزیم نمبر ۱۵۶ (۴) نسخہ اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد (آصفیہ) نمبر ۹۸ (۵) نسخہ بنارس یونیورسٹی نمبر ۱/ ۶۸/ ۳×۱ یو (۶) نسخہ رضا

لائبریری رام پور نمبر ۸۸۸

۲۷۔ (۱) نسخہ برٹش میوزیم نمبر او۔ آر۔ ۱۲۱۱۷ (۲) ایضاً نمبر ایجرٹن ۱۰۳۹ (۳) نسخہ انڈیا آفس نمبر بی ۷ ۱۴ یو ۶۳ (۴) نسخہ برٹش میوزیم نمبر اے ڈی ڈی ۸۹۲۲

۲۸۔ (۱) نسخۂ خدا بخش نمبر ایچ۔ ایل۔ ۱۵۵ (۲) نسخہ ادارۂ ادبیات اردو نمبر ۷۹۳ (۳) نسخہ سر سالار جنگ نمبر ۱۵۶ (۴) نسخہ اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد (آصفیہ) نمبر ۹۸ (۵) نسخہ بنارس یونیورسٹی نمبر U1×3/68/1 (۶) نسخہ رضا لائبریری رام پور نمبر ۸۸۸

۲۹۔ نسخہ انڈیا آفس نمبر بی ۷ ۱۴ یو ۶۳

۳۰۔ نسخہ رضا لائبریری نمبر ۸۸۹

۳۱۔ نسخہ برٹش میوزیم نمبر اے ڈی ڈی ۸۹۲۲

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ نسخہ رضا لائبریری رام پور نمبر ۸۸۹

۳۴۔ نسخہ برٹش میوزیم نمبر او۔ آر۔ ۱۴

۳۵۔ (۱) نسخہ اسٹیٹ آرکائیوز الہ آباد نمبر ۱۰۹۳۹ (۲) نسخہ رضا لائبریری نمبر ۸۸۷ (۳) نسخہ بنارس یونیورسٹی U1×3/68/4 (۴) نسخۂ خدا بخش ایچ ایل نمبر ۱۵۵ (۵) نسخہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد نمبر ۷۹۳ (۶) نسخۂ سر سالار جنگ میوزیم نمبر ۱۵۶ (۷) نسخہ بنارس یونیورسٹی U1×3/68/1 (۸) نسخہ رضا لائبریری نمبر ۸۸۸ (۹) نسخہ اسٹیٹ آرکائیوز حیدرآباد (آصفیہ) نمبر ۹۸

۳۶۔ (۱) نسخہ خدا بخش نمبر ۳۲۷ (۲) نسخہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد نمبر ۹۲۹/ ۸۸۹ (۳) نسخہ بنارس یونیورسٹی نمبر U1×3/68/4 (۴) ایضاً نمبر U1×3/68/1 (۵) نسخۂ رضا لائبریری نمبر ۸۸ (۶) نسخۂ مملوکہ ڈاکٹر ولی الحق نمبر ۲ (۷) نسخہ انڈیا آفس نمبر بی ۷ ۱۴ یو ۶۳ (۸) نسخہ برٹش میوزیم نمبر اے ڈی ڈی ۸۹۲۲
(۹) نسخہ انڈیا آفس نمبر بی ۵۰/ پی ۲۱۱۹

۳۷۔ ''چمنستان شعرا'' از شفیق اورنگ آبادی طبع ۱۹۲۸ء، ص ۳۶۷/ شفیق کے الفاظ یہ ہیں ''ایں بیت کہ مذکور شد در دیوان تاباں ہم نظر درآمد۔''

۳۸۔ ''سودا کا الحاقی کلام'' از ڈاکٹر اکبر حیدری، شائع شدہ، اکادمی لکھنو، شمارہ ستمبر ۱۹۸۱ء، ص ۱۸۱

☆☆☆☆☆

Prof. Nasim Ahmad
Ex Head Dept. of Urdu, B.H.U.
Varanasi -221005,
Mob. 9450547158
E-Mail: nasim@hotmail.com

”غزلان الہند“ آزاد بلگرامی کی ایک شاہکار کتاب

سید حسن عباس

لامکان است مقامِ آزاد فوقِ عرش است خرامِ آزاد
سبحہ گردان ز کواکب ہر شب فلکِ پیر بہ نامِ آزاد
گل شود گوش ہمہ تن بہ چمن گر برَد باد، پیامِ آزاد
پیش آیینہ ضمیران طوطی می کند وصف کلامِ آزاد
صاحبِ ہردو جہان است شفیق ہر کہ گردید غلامِ آزاد

مندرجہ بالا اشعار میر غلام علی آزاد بلگرامی (1116-1200ھ) کے ایک ہندو شاگرد لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (م:1223ھ) نے اپنے استاد کی مدح میں کہے ہیں۔ آزاد بلگرامی کا شمار ان علما و فضلا اور شعرا و ادبا میں ہوتا ہے جنھوں نے بارہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں فارسی اور عربی زبانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے، بلکہ ہندوستان سے باہر بھی اپنے علمی کارناموں کی بنا پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے ایک ایسے درخشاں ستارے کی مانند ہیں جو یہاں کے افق پر نمودار ہوا اور اپنی تابناکی اور تابندگی سے آج تک علم و ادب کے مختلف گوشوں کو منور کر رہا ہے۔

در عرب دیوانِ ما ہم شورہا افگندہ است گرم دارد بزم ہا را شعلۂ الحان ما
در ہند چون من طوطی خوشگو نتوان یافت ہم حرف شدم چشمِ غزالانِ حرم را
آزاد از آن شعلہ کہ دارد سخن من افروختہ ام شمع و چراغِ اَب و عم را

ان کی معروف کتاب ”سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان“ مسقط گئی اور مصر سے شائع ہوئی۔ آزاد نے نعت پیمبرؐ میں ایسے معرکۃ الآرا قصیدے کہے جن کے سبب ”حسّان الہند“ کے لقب سے سرفراز ہوئے۔

چون مدحِ رسول کام من شد حسّان الہند نامِ من شد

لیکن آزاد کا حقیقی مقام و مرتبہ ان کی علمی اور ادبی تحقیقات میں مضمر ہے۔ وہ عربی و فارسی کے شاعر تھے۔ انھوں نے عربی میں ایک اور فارسی میں چھے تذکرے تالیف کیے جن میں تین ”ید بیضا“ ”سروِ آزاد“ اور ”خزانۂ عامرہ“ شعرا سے متعلق ہیں اور تین دیگر یعنی ”مآثر الکرام تاریخ بلگرام“ ”روضۃ الاولیا“ اور ”شجرۂ طیبہ“ عرفا، صوفیہ اور مشائخ سے متعلق ہیں۔ سبحۃ المرجان اور مآثر الکرام اپنے اپنے موضوعات میں وہ جامع ترین اور اولین کتابیں ہیں جن کی مثال کم ہی ملے گی۔ مولانا شبلی نے صحیح فرمایا ہے:

”فن رجال اور تاریخ اگرچہ مسلمانوں کا گویا خاص فن ہے لیکن ہندوستان کی علمی حالت کی کچھ ایسی افتاد پڑی تھی کہ ابتدا سے اس زمانے تک کسی نے ایک کتاب بھی اس فن میں نہ لکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے سیکڑوں، ہزاروں علما و فضلا کے حالات پر آج گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ آزاد سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کے علما اور ارباب عمائم کے حالات قلمبند کیے۔ آزاد نے اس اولیت پر خود جا بجا فخر کا اظہار کیا ہے اور بجا کیا ہے“۔ (مقالات شبلی 5/118)

آزاد کی مشہور زمانہ عربی تالیف سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان 1177ھ/ 1763ء میں تالیف ہوئی۔ جیسا کہ اس کے نام سے ہی آشکار ہے، اس کا اصلی موضوع ہندوستان ہے۔ یہ چار فصلوں پر مشتمل ہے۔

فصل اول: در بیان عظمت و بزرگی ہندوستان۔ تفاسیر و احادیث میں اس ملک کی نسبت جو اشارے ملتے ہیں انھیں یکجا کر دیا گیا ہے۔ مولف نے داستان آدم و حوا اور ان کا سراندیب میں آدم نامی کوہ پر اترنے کا ذکر کیا ہے۔

فصل دوم: اس فصل میں چوالیس ہندوستانی علما کا ذکر ہے۔

فصل سوم: بعض ہندوستانی صنائع و بدائع کے بارے میں ہے۔ مولف نے تیئیس صنعتیں اپنی قوت فکر سے اختراع و ایجاد کی ہیں اور ان کا نام مقرر کرنے کے ساتھ تعریفیں بیان کی ہیں اور مثال میں عربی کے سیکڑوں اشعار پیش کیے ہیں۔

فصل چہارم: یہ فصل ”معشوقات والعشاق“ کے بیان میں ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ فصل ”نایکا بھید“ سے متعلق ہے۔

موخرالذکر دونوں فصلوں کی بابت مولانا شبلی نعمانی نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

”آزاد نے سبحۃ المرجان میں ایک خاص باب باندھا ہے جس میں انھوں نے عربی زبان میں بھاشا کے خیالات اور شاعرانہ صنائع منتقل کیے ہیں“۔ (مقالات شبلی 5/119)

یہاں یہ بتانا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ سبحۃ المرجان پہلی بار 1303ھ/ 1886ء میں 298 صفحات میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فضل الرحمان ندوی سیوانی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر مختارالدین احمد کی زیر نگرانی سبحۃ المرجان کی تدوین و تصحیح کی اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کتاب کو انھوں نے دو جلدوں میں 1976ء اور 1980ء میں وہیں سے شائع کیا۔ دونوں جلدوں میں دو دو فصلیں ہیں۔ اس کے قلمی نسخے بھی متعدد کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ نیشنل میوزیم دہلی کا نسخہ بخط مولف ہے۔

اس کتاب کا اردو اور فارسی میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ دونوں ترجمے سید شمس الدین حسنی الحسینی بنارسی نے راجا ایسر پرشاد کی فرمائش پر کیا تھا۔ لیکن ابتدائی دو فصلوں سے زائد کا ترجمہ نہیں کر سکے تھے۔ ترجمہ لفظی ہے۔ اردو

ترجمہ مظہر آدم کے نام سے منشی نولکشور کے مطبع لکھنو سے 1295ھ/ 1878ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کتاب کا نام تاریخی ہے۔ فارسی ترجمے کا واحد مخطوطہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ سبحۃ المرجان کے ایک حصے کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

خود آزاد بلگرامی نے اپنی ہی کتاب کی آخری دو فصلوں کو فارسی میں منتقل کیا۔ یہ کام انھوں نے اپنے شاگردوں شفیق اورنگ آبادی اور مہربان اورنگ آبادی کی فرمائش پر 1187ھ/ 1764ء میں انجام دیا اور کتاب کا تاریخی نام ”غزلان الہند“ رکھا۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور دو مقالہ اور ہر مقالہ چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ سبب تالیف میں آزاد نے لکھا ہے:

”نوای دلکشای طوطیان ہند را بہ گوش صاحب طبعانِ فرس باید رسانید“۔

اس کتاب کا موضوع علم بدیع ہے۔ مقدمے میں اس علم کی مختصر تاریخ بیان کی ہے اور جن لوگوں نے اس فن میں نمایاں کام کیے ہیں، ان کا تذکرہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

الف: بعض صنعتیں عرب و ہند میں مشترک ہیں جیسے ایہام، حسنِ تعلیل، تجاہل عارفانہ، مراجعت، استعارہ، تشبیہ، جناس اور سجع وغیرہ۔

ب: بعض صنعتیں صرف عربوں سے مخصوص ہیں جیسے استخدام، مضمر، حسنِ تخلص اور تاریخ بہ قاعدۂ جُمل وغیرہ۔

ج: بعض صنعتیں صرف سرزمین ہندوستان سے مخصوص ہیں۔ عربی یا فارسی میں نہیں ہیں۔ انھوں نے ایسی ستائیس صنعتوں کا انتخاب کیا ہے جن میں سبحۃ المرجان میں تیئیس اور غزلان الہند میں ستائیس کا بیان ہوا ہے۔

واضح رہے کہ غزلان الہند کی آخری دو فصلیں خالص ہندوستانی موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے کتاب کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

مقدمہ:

مقالۂ اول: در بیان صنائع و آن مشتمل بر چہار فصل است۔

فصل اول: در بیان تفرّس صنائع ہند

فصل ثانی: در بیان صنائع مخترعۂ مولف

فصل ثالث: در بیان صنعتی از امیر خسرو دہلوی: ”بوقلمون“

فصل رابع: در بیان سہ صنعت قدیم: البیّنات- دائرۃ التاریخ- الزبرہ

مقالۂ ثانی: در بیان نایکا بھید (اہل ہند کی شاعری میں عاشق و معشوق کا اطلاق کس پر ہوتا ہے) این نیز مشتمل بر چہار فصل است۔

فصل اول: در بیان معشوقات متجزۂ ہندیان (اہل ہند کا ایجاد کردہ تغزّل)

الف: بیان طیب (وجود اشجار طیب در ہند)

ب: بیان نسا (اہل ہند کی شاعری میں مرد معشوق اور عورت عاشق ہے)

اقسام نایکا بھید:

تقسیم اول: بہ اعتبار صلاح و طلاح زن

الف: صالحہ (اپنے شوہر سے التفات کرے اور اس کا خاصہ شرم و حیا اور رضائے شوہر ہے)

ب: طالحہ (برعکس صالحہ) اس کی دو قسمیں ہیں:

(1) بیتیہ: اس کی تین قسمیں ہیں

الف: مختفیہ (اس کا فسق کسی پر ظاہر نہ ہو)

ب: مسترہ (اس کا فسق ظاہر ہو اور وہ پنہاں کرے)

ج: معلّنہ (اس کے فسق کا شہرہ ہو اور وہ بدنام زمانہ ہو)

(2) سوقیہ (بازاری ہو)

تقسیم ثانی: بہ اعتبار زن۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

اول: صغیرہ: (جس کے آثار جوانی ظاہر ہو چکے ہوں) اس کی دو قسمیں ہیں۔

قسم اول: غافلہ اور اس کی چند قسمیں بتائی گئی ہیں از آں جملہ:

-مترقّیہ (جس کے حسن میں روز بروز اضافہ ہو)

-متنزّیہ (جو آرائش و زیبائش سے بیزار ہو)

-باکرہ (ہنوز بہ تصرفِ مرد نہ آئی ہو)

-ثیبہ (ازالۂ بکارت ہو چکا ہو)

-نافرہ عن الجماع

قسم دوم: خبیرہ (جس میں جوانی کا اثر ظاہر ہو چکا ہو اور وہ اس سے باخبر ہو)

متوسط (جوانی کی سرحد میں داخل ہو چکی ہو اور عشق اس میں پیدا ہو چکا ہو)

کبیرہ (متوسط حد سے تجاوز کر چکی ہو اور اس کا عشق حیا پر غالب آ جائے)

تقسیم ثالث: شاکیہ، اس کی دو قسمیں ہیں۔

1۔ رامزہ (وہ جو رمز و ایما میں شکایت کرے)

2۔ مصرحہ (جو صاف صاف شکایت کرے)

تقسیم رابع: مضطربہ، اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

1۔منہرہ (جو روزانہ جانب شوہر جائے)

2۔طارقہ (جوشب میں جانب شوہر جائے)

تقسیم خامس: فاطنہ (فطانت سے کام لے) اس کی دو قسمیں ہیں:

1۔فاطنہ قولاً (گفتگو میں فطانت سے کام لے)

2۔فاطنہ فعلاً (عمل میں فطانت سے کام لے)

تقسیم سادس: متکبرہ، اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

1۔روپ گربتا (اپنے حسن و جمال پر مغرور ہو)

2۔پیم گربتا (شوہر کی محبت پر مغرور ہو)

اقسام متفرقہ

-حاضرہ (شوہر کو سفر سے روکے)

-مترجیہ (شوہر سے امیدوار رہے)

-جایت نادمہ (شوہر سے تغافل کرنے پر پشیمان ہو)

فصل ثانی: در بیان اقسام معشوقات متخرجۂ مولف

-الزایرہ فی الزوایا (عاشق کی خواب میں زیارت کرے)

-النافرہ عن الشیبہ (شوہر میں آثار پیری دیکھ کر غم زدہ ہو)

-العایدہ (شوہر کی عیادت کرے)

-الغیری (شوہر کے ساتھ بدسلوکی کرے)

المخلفہ للوعد (شوہر سے کیے گئے وعدے پورے نہ کرے)

البدویہ (بادیہ میں نشو و نما ہوئی ہو)

المرسلہ (شوہر کو نامہ و پیام بھیجے)

فصل ثالث: در بیان اقسام عشاق برآوردۂ ہندیان

-المستفرد (ایک عورت یا مرد پر قناعت کرے)

-المستکثر (کئی عورتوں سے نکاح کرے اور سب کے ساتھ مساوی سلوک کرے)

فصل رابع: در بیان عشاق برآوردۂ مولف

-العفیف

-الفاطن۔ یہ دو طرح کے ہیں الفاطن فعلاً اور الفاطن قولاً

-الطارق -الواصل -المہجور -الجازع عن الوداع

-الذاکر الایام الحمی -الساہر باللیل -الراضی من جور الحبیب -الشاکی من جور الحبیب

-الشاکی من عینہ -المتاذی من الرقیبہ -الغیور -صاحب حدیث القلب

-صاحب حدیث النسیم

فہرست مندرجات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ آزاد بلگرامی نے کتنی محنت اور دقّت سے کام لیا ہے اور علم بدیع کے باب میں کیا اضافات کیے ہیں۔ کیونکہ سنسکرت کے جو صنائع ہیں وہ بہر طور فارسی میں اس سے پہلے کہیں اور نظر نہیں آتے۔ لے دے کر ایک کتاب "تحفۃ الہند" تالیف میرزا خان ابن فخر الدین محمد ہے جس کا ایک باب" در علم سنگار رس یعنی علم عاشقی و معشوقی و بیان احوال عاشق و معشوق" غزلان الہند کے مقالۂ ثانی" در بیان نایکا بھید" سے مشابہ ہے۔

واضح رہے کہ غزلان الہند کا تعلق ادبیات تطبیقی سے ہے۔ مولف نے اس میں سنسکرت کے بعض عناصر کا ایک دوسرے سے مقائسہ و موازنہ بھی کیا ہے مثلاً ردیف کے بارے میں بہت دقیق بحث کی ہے۔ آزادؔ نے سنسکرت کی ستائیس صنعتوں کو پہلے عربی میں پھر فارسی میں ترجمہ کر کے پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی اہمیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ یہ علم بدیع کے اچھوتے گوشوں کو روشن کرتی ہے بالخصوص وہ عناصر جن کا تعلق خالص ہندوستان کی سرزمین سے ہے، اس کتاب میں پہلی بار سامنے آئے ہیں۔

آزاد بلگرامی کے استخراج کردہ صنائع شعری اور معشوقات کی اقسام، ان کے وسیع مطالعے کی زائیدہ ہے۔ ایسی بہت سی صنعتیں آزادؔ کے زمانے تک توجہ سے محروم تھیں جن میں ایک" وفاق" ہے۔ ان صنعتوں کا مطالعہ سبک ہندی کی شاعری میں زیبائی شناسی کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس پہلو سے آزاد نے مرزا صائبؔ کے بہت سے اشعار بطور مثال پیش کر کے کلام صائب میں زیبائی شناسی کو ایک مخصوص رخ عطا کیا ہے۔

دوسری اہم بات اس کتاب کے سلسلے میں یہ کہی جا سکتی ہے کہ آزاد بلگرامی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے غزلان الہند میں خالص ہندوستانی شعری صنائع اور سنسکرت میں موجود" نایکا بھید" کو پہلے عربی میں پھر فارسی میں منتقل کر کے اس سرزمین کے علوم کو اہل عرب و ایران سے متعارف کرانے کی پُرخلوص کوشش کی ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان کی اس کوشش کو جتنا سراہا جانا چاہیے تھا، وہ اس سے محروم رہے۔ آخری بات یہ ہے کہ یہ کتاب ایک ادب کو دوسرے ادب کے اوصاف سے خاص کر ہمارے ملک کی مخصوص تہذیبی اور ثقافتی روایات کے پیش نظر، واقف و آگاہ کراتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ کتاب منفرد مقام کی حامل ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر سید عبداللہ نے آزاد کی ایسی کوشش کا کھل کر اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"۔۔۔انھوں نے فارسی ادب کے ہندی دبستان کی بڑی حمایت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب

اہل ایران ہندوستانی فارسی دانوں کو معیاری نہ سمجھتے تھے بلکہ ضد میں آ کر ہر ہندی چیز کی مخالفت کرتے تھے۔ ایرانیوں کی اس اسپرٹ کے خلاف آرزو اور آزاد دونوں نے آواز بلند کی اور ہندوستان کی تعریف میں کتابیں لکھیں، مثال کے طور پر آزاد کی کتاب ”سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان“ ایک غیر معمولی کتاب ہے۔

آزاد بلگرامی سنسکرت اور ہندی کے بھی عالم تھے۔ انھوں نے عربی اور سنسکرت پنگل کے عروض و بدیع کا مقابلہ کیا ہے۔ ہندوؤں کے النکار، نک اور کوک کے فنون کو ”سبحۃ المرجان“ میں عربی میں ڈھالا ہے“۔ (فارسی زبان و ادب، ص 323)

1178ھ میں اپنی اسی کتاب سے اُن دو فصلوں کو فارسی میں منتقل کیا جن کا تعلق ہندی شاعری کے صنائع و بدائع سے تھا اور اس کا تاریخی نام ”غزلان الہند“ (1178ھ) رکھا۔

غزلان الہند کے متعدد قلمی نسخے ملک اور بیرون ملک کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ راقم السطور نے چار پانچ قلمی نسخوں کی مدد سے اس کا متن مرتب کر کے کتاب کو اشاعت کے لیے خدا بخش لائبریری پٹنہ کے سابق ڈائرکٹر جناب حبیب الرحمان چغانی صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد کمپوز شدہ متن موصول ہوا۔ آخری پروف دیکھے جانے کے بعد کتاب واپس لائبریری بھیج دی گئی۔ وہ جب تک وہاں رہے اُن کے زمانے میں وہ کتاب شائع نہیں ہوسکی۔ ان کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری مرحوم نے وہاں کی ڈائرکٹرشپ سنبھالی۔ وہ جب تک رہے، یہ کتاب یاد دہانی کے باوجود شائع نہیں ہوسکی۔ آخر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے اشاعتی امداد کے لیے مسوّدہ وہاں داخل کیا گیا۔ ایک سال بعد منظوری ملی۔ کتاب کی کمپوزنگ مکمل ہونے پر پتا چلا کہ ڈاکٹر سیروس شمیسا نے یہ کتاب ایران سے شائع کر دی ہے۔ کتاب کے حصول میں مزید سال بھر کا وقفہ لگ گیا۔ ڈاکٹر شمیسا کے متن کی اساس بنگلا دیشی نسخے پر ہے۔ یہ نسخہ انھیں حکیم حبیب الرحمان کے ذخیرے میں ملا تھا جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔

ایرانی ایڈیشن میں کتاب کا نام ”غزلان الہند“ کے بجائے ”غزالان الہند“ رکھا گیا ہے اور ڈاکٹر صاحب شاید یہ بھول گئے کہ یہ کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے سال تالیف 1178ھ ظاہر ہوتا ہے۔ میں نے اپنا مرتب کردہ متن فی الحال شائع نہیں کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

Prof. Syed Hasan Abbas
Director, Rampur Raza Library,
Rampur U.P -244901,
Mob. 9839337979,
E-Mail: shabbas_05@gmail.com

اقبال اور مقام شبیری

عبد الحق

تاریخ تہذیبی تلاطم سے عبارت ہے مگر تصادم سے کسی نئی زبان کا وجود میں آنا ایک لسانی معجزہ ہے۔ اردو اسی اعجاز کی مظہر ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں ایک ثقافتی تاب کاری اور تخلیقی توانائی ہے۔ وہ اپنی کم عمری کے باوجود رزمیہ شاعری کے عظیم الشان سرمایہ اور ثروت سے گراں مایہ ہے۔ آفرین ہو ان بزرگوں پر جنھوں نے تاریخ کو تخلیق کا شاہ کار بنایا اور علامہ شبلی نے اس تخلیق کو تنقید کی تقدیس بخش دی۔ اس صنف ادب نے تحریک و تسلسل کی صورت گری اختیار کی۔ فن کار مختلف ادوار میں نفس مضمون اور اظہار میں توسیع و تبدیلی بھی کرتے رہے۔ غرض یہ سلسلۂ تخلیق رواں دواں ہی رہا۔ انیس و دبیر کے بعد حالی نے شخصی مرثیے کی شروعات کی۔ حالی کا یہ شعری اجتہاد تھا جس کی تقلید و توسیع میں اقبال نے ایک امکانی دنیا کی آگہی شامل کر دی۔ حالی نے غالبؔ کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی شخصیت کی شبیہ سازی میں غالب کی طرفگی اور تقابل میں ان کے قد و قامت کو قدما سے بھی بلند تر بتایا:

میں نے سب کا کلام دیکھا ہے ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

حالی نے نثر میں بھی یادگار غالب جیسی انمول کتاب پیش کی۔ کئی ناقدین نے اقبال کو حالی کی توسیعی صورت کہا ہے۔ اس کا یقین اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال نے بھی غالب کو منظوم خراج عقیدت کے ساتھ نثر پاروں میں بھی اکثر و بیشتر ان کے فن کی فسوں کاری پر بڑے ہی فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ گویا حالی کے بعد اقبال دوسرے غالب شناس ہیں جنھوں نے عظمتِ غالب کے اعتراف میں جس تنقیدی بصیرت کا اظہار کیا ہے وہ غالبیات میں ہنوز نایاب ہے، اقبال نے رثائی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ انیس و دبیر کی تخلیقات سے بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے بعض ناقدین نے اقبال کی زبان و بیان پر اعتراضات کیے تو اقبال نے اپنے دفاع میں کلام انیس سے استناد پیش کیے۔ ایک دوسرے خط میں مرثیے کی مقبولیت کا ایک انتہائی فکر انگیز سبب بیان کیا ہے۔ انھوں نے اظہار و اسالیب سے استفادے کے علاوہ موضوعات میں بھی نئے امکانات اور جہات کی تخلیقی صورتیں پیش کیں اور انھیں فکر و فلسفہ سے ہم آہنگ کیا۔

ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتاب زندگی
یا
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

اقبال نے تین اہم شخصی مرثیے لکھے۔ ”مرثیۂ داغ“ ، ”والدہ مرحومہ کی یاد میں“ اور ”مسعود مرحوم“ ۔ان میں زندگی کے دردو داغ کے ساتھ عقیدت و احترام کے بے پایاں جذبات موجود ہیں اور حیات و موت کی فلسفیانہ تعبیریں کائنات کی کھلی حقیقت بیان کرتی ہیں۔

ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

یا

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے

یا

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں

اقبال کی کئی مرثیہ نما نظمیں بھی ملتی ہیں، جنھیں مرثیوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ جیسے فاطمہ بنت عبداللہ، شبلی و حالی، سوامی رام تیرتھ اور متروک کلام میں شامل دوسری نظمیں۔نظم فاطمہ بنت عبداللہ کا یہ شعر قابل توجہ ہے۔

ہے جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

اقبال کی فکر میں یہی شوق شہادت ہے جس کی مختلف صورتوں نے شاعرِ رنگین نوا کے کلام کو گل گونہ خوں سے لالہ زار کیا ہے۔اس تمہید سے قطع نظر میرا معروضہ ہے کہ اقبال نے مرثیہ کی تقدیس کو جو تفکیری بلندی و برنائی بخشی ہے اس کی مثال پورے رثائی ادب میں کہیں نہیں ملتی اور نہ کوئی دوسرا ان کا حریف ہوسکا۔مفکر شاعر سے ہم یہی توقع بھی کرتے ہیں۔

اقبال نے مروجہ ہیئت و ساخت کے اجزا و عناصر سے قطع نظر اسما و اماکن کے ساتھ حادثے کی سنگینی اور ان سے حاصل ہونے والے پیغام کو نفسِ موضوع بنایا۔حضور رسالت مآبؐ کی بیٹی، داماد اور دو نواسے کی مقدس سیرت و شہادت بنی نوع بشر کے لیے آئینۂ تمثال ہیں۔بیٹی اور داماد کا تذکرہ مرثیے میں ناگزیر ہے مگر اصلاحی گفتگو میں واقعۂ کربلا ہی مرثیہ نگاری کا مرکز و محور ہے۔راقم بھی اقبال کے ان فکر انگیز اور لاثانی تصورات سے صرفِ نظر کرتا ہے جن میں جناب فاطمہؑ اور حضرت علیؑ کی ذات و صفات پر شاعرِ مشرق نے عقیدت و ارادت کے گنج ہائے گہر پیش کیے ہیں۔جذبۂ عقیدت و افکار سے معمور یہ خیالات بھی ہماری تخلیق و تاریخ میں ناپید ہیں۔حضرت حسینؑ کی ذات والاصفات، باطل طاقتوں سے ان کی جنگ آزمائی اور شہادت سے برآمد ہونے والے نتائج اقبال کے قلب و نظر میں ہمیشہ طوفان و تلاطم برپا کرتے رہے ہیں۔ان کی مثالی شخصیت اقبال کے مردِ مومن کے لیے تصورات کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ان کی شہادت ایمان افروزی کی دلیل ہی نہیں وہ پیکارِ زندگی میں عزم و استقلال کی قندیل ہے۔شہادت کی یہ سلسبیل ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔اس میں مالِ غنیمت اور

کشور کشائی کی خواہشات مذموم ہیں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن　　نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو　　عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی

اقبال کے کلام میں جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہ کسی نہ کسی طرح اسی شہادت سے نسبت رکھتا ہے۔حد یہ ہے اقبال کو مناظر فطرت کا وہی شاہکار محبوب ہے جو حسینی نسبت رکھتا ہے۔فکر و نظر میں لالے سے وابستگی محض اس برگزیدہ نسبت کے سبب ہے۔

گل و نرگس و سوسن و نسترن　　شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
سرِ خاکِ شہیدِ برگہائے لالہ می پاشم　　کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے　　قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

اسی شہادت کے سبب ہر قطرۂ لہو زندگی جاوداں حاصل کرتا ہے۔لہو کا استعارہ ہو یا علامت سب شہادت کے ایک ہی مرکز سے وابستہ ہیں۔

لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
یا　　لہو خورشید کا ٹپکے اگر پتھر کا دل چیریں
سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر　　دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند
یا　　ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

ربِّ جلیل کے روبرو بے چون و چرا سرِ نیاز پیش کر دینے کا جذبۂ شوق ہی تکمیل زندگی ہے۔یہی شوقِ شہادت ہے جو اسلام کی تاریخ کے دو کمانوں یعنی اول و آخر کے درمیان سررشتۂ حیات کی دعوت دیتا ہے کیونکہ تاریخ حادثات سے مرتب ہوتی ہے اور حادثات عزمِ جواں اور اضطرابِ پیہم سے نمو حاصل کرتے ہیں، یہی لافانی نقوش افراد ملت کو آدابِ جنوں سکھاتے ہیں۔جنوں خیزی ہی جبر و استبداد کے ایوانوں میں زلزلہ طاری کرتی ہے۔ہماری ثقافت ان حوادث سے ہمیشہ نبرد آزما رہی ہے۔اسی پیکارِ حیات نے تازگی و طرب ناکی بخشی ہے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم　　نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

اسلامی تاریخ کی اس سے بہتر ترجمانی مفکرین اور مفسرین نہ کرسکے۔تاسیسِ بنائے دین ذبح عظیم سے شروع ہوتی ہے اور اس کی تکمیل شہادتِ حسینؑ پر ہوتی ہے۔یہ نہ استعارہ ہے نہ علامت بلکہ بدیہی حقیقت ہے۔کچھ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ فن اور اس کے متعلقات ہندی اساطیر کی شبیہ ہیں۔ان پُر فریب بیانات کو خاطر میں نہ لایا

جائے۔ اقبال کی رفعتِ فکر دیکھیے، انھوں نے 1930ء میں ہی باور کرایا تھا کہ یہ حقیقت ابدی ہے۔ حقیقت کو علائم واستعاروں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سینۂ کائنات کے اس راز کو بہ بانگِ اسرافیل کہنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیریؑ   بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

اقبال نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ یہ حقیقتِ ابدی ہر زمانے میں زور و جبر کی طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما رہتی ہے۔ انھوں نے ایک اور مقام پر کوفہ و شام کے نئے پیکروں کی ملامت کی ہے۔

الاماں از روح جعفر الاماں   الاماں از جعفرانِ این زماں

موسیٰؑ کی فرعون سے، ابراہیمؑ کی نمرود سے، چراغ مصطفوی کی شرارِ بولہبی سے معرکہ آرائی سب اسی حقیقتِ ابدی کے انقلابات ہیں جن سے ثقافت وسیادت کی سیرابی ہوتی ہے۔ یہ میراثِ خلیل پیغمبرِ اعظم وآخر سے ہو کر حسین کے ہاتھوں براہِ راست پہنچتی ہے۔ انھوں نے کشادہ جبینی کے ساتھ یہ امانت ہمیں سونپ دی ہے۔ اقبال کی ندرتِ فکر کی بلندی دیکھیے:

اک فقر ہے شبیریؑ اس فقر میں ہے میری   میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیریؑ

اس وراثت کی حفاظت خون گرم سے ہی ممکن ہے۔ جس کی منتہا و معراج جاں بازی و جاں سپاری کے ساتھ حصول شہادت ہے۔ جو کفن و کافور یا نالہ و شیون سے بے نیاز ہے۔ آپ اقبال کے آفاقی انسان کی جو بھی تعبیر کریں مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ اس تصور کی پہلی زندہ جاوید شبیہ بہ قول پروفیسر رشید احمد صدیقی ولائے مصطفوی ہی ہے۔

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی   قطرہ و دریا و طوفانم توئی

دوسری شبیہ خلفائے راشدین کی ہے۔

تازہ کن آئین صدیق و عمر   چوں صبا بر لالۂ صحرا گذر

سروری در دین ما خدمت گری است   عدلِ فاروقی و فقر حیدری است

اور پھر اس مثالی انسان کے پیکر و پندار میں سرمایۂ شبیر کا ضمیر وخمیر شامل ہے۔ وہ انسان جس کی پیدائش و پرورش خاتون جنت کی مبارک آغوش میں ہوئی، جو شانۂ رسول پر سوار ہو کر اٹھکھیلیاں کرتا رہا اور زیرِ تیغِ پدر تربیت یافتہ ہو۔ اس تمثیل وتبریک کے لیے سب سے زیادہ وہی تاریخ میں حقدار ہوگا۔ نسبتوں کے ان تمام زاویوں پر اقبال نے پہلی بار مفکرانہ اجتہاد کیے ہیں۔ ان کے اظہار کے بعد بھی وہ متفکر تھے کہ حق ادا نہیں ہو پایا۔ مولانا گرامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"فکر میں ہوں کہ کوئی ایسا شعر نکلے کہ مضمون کے اعتبار سے ایک سو شعر کے برابر ہو"

"رموزِ بے خودی" میں جذبۂ عقیدت کو فکر کی گہرائی میں اتارنے کے باوجود انھیں اطمینان حاصل نہ تھا۔

وہ نظم رثائی ادب کا لازوال شاہکار ہی نہیں ادبی تخلیق وتاریخ میں الہام سے کم نہیں ہے۔

آں امامِ عاشقاں پورِ بتول   سروِ آزادے ز بُستانِ رسول

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید   این دو قوت از حیات آید پدید

خونِ او تفسیر این اسرار کرد   ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد

اس بیداری کا انحصار یا اجارہ داری کسی ایک قوم کی نہیں ہے۔ دنیا کے تمام انسانوں کی نجات کے لیے یہ اکسیرِ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے جو بیاضِ حسین میں قیامت تک کے لیے نسخۂ شفا کی حیثیت رکھتا ہے۔ حسین کے بغیر سوز وساز زندگی ممکن نہیں ہے اور نہ حریت وحرکت کے حصول کے وسیلے پیدا ہو سکتے ہیں۔ انھیں کی بدولت زندگی کے سوز وساز کی مضرابی ممکن ہو سکتی ہے۔ اہل حق کے لیے آزادی کا پیغام اسوۂ حسین میں ہی پنہاں ہے۔ محکومی اور مظلومی انسانیت کے لیے ایک مذموم شے ہے۔ اس لیے نجات حاصل کرنے کے لیے ان کے سبق آموز کردار کو بے کم وکاست اپنانا ہوگا۔ رُموزِ بے خودی میں ارشاد ہے:

در نوائے زندگی سوز از حسین   اہلِ حق حریت آموز از حسین

مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے کہ اقبال ہمیشہ بدر وحنین کی معنویت کو حسین سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ ان معرکوں میں بذاتِ خود شریک نہیں ہوئے مگر ان کے آبا واجداد کی ظفریابی اور دعوت وعزیمت نے معرکہ کے ان میدانوں کو خونِ شہیداں سے لالہ زار کیا تھا۔ کلام میں بیشتر مقامات پر انھیں نسبتوں سے ذکر ہوتا ہے۔ تقریباً تمام مجموعہ ہائے کلام میں اس عظیم شخصیت اور ان کے شعار زندگی کا ذکر ناگزیر طور پر سامنے آتا ہے۔ اسرار ورموز، پیام مشرق، زبورِ عجم، بالِ جبریل، پس چہ باید کرد اور ارمغانِ حجاز میں ان غزوات کے ساتھ ایک نسبت قائم کی گئی ہے۔ بال جبریل کا شعر ملاحظہ ہو:

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق   معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

"جاوید نامہ" کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین   فقر و سلطان وارثِ جذبِ حسین

"پس چہ باید کرد" کے یہ دو اشعار پیش خدمت ہیں اور غور وفکر کے مقتضی ہیں۔

فقرِ عریاں گرمیِ بدر و حنین   فقرِ عریاں بانگِ تکبیر حسین

گرمیِ ہنگامۂ بدر و حنین   حیدر و صدیق و فاروق و حسین

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک حق وباطل کی آویزشوں کی یہ ابتدا تھی جس کی انتہا حسین کے ہاتھ کربلا میں انجام پاتی ہے۔ یہ جنگ وجدل صرف معرکے نہیں ہیں بلکہ مجاہدانہ زندگی کے معمولات ہیں۔ جن میں مالِ غنیمت کی حرص وہوا اور منصب ومملکت کی خواہش حرام ہے۔ یہ حاکم مطلق کی سرفرازی اور اطاعت حق میں

مردِ مسلمان کا نذرانۂ عبودیت ہے۔جس کا بدل دولتِ کونین بھی نہیں ہے۔تاریخ بدر وحنین ایک حقیقت ہے جو راہِ حق میں جاں طلبی کی دعوت دیتا رہتا ہے۔حسین بھی اجداد کی تلواروں کے سایے میں پل کر جواں ہوئے تھے۔ پون صدی پہلے کی زبورِ عجم میں اقبال کی یہ پیشین گوئی آنے والے حادثات کو بے حجاب دیکھ رہی تھی۔جب ہی انھوں نے بڑی دردمندی سے ہمیں مخاطب کیا تھا کہ عراق کے صحرا کب سے ہمارے منتظر ہیں اور حجاز کی کھیتیاں تشنہ کام ہیں۔ایسے میں اپنے وجود کے کوفہ وشام سے نکل کر خونِ حسین کی امانت سے ان ریگ زاروں کو لالہ زار بنایا جائے۔بہ قول پروفیسر رشید احمد صدیقی ہر آزمائش کے وقت ہمارا رخ کربلا کی طرف ہونا چاہیے کوفہ کی طرف نہیں۔دانائے راز کی پیشین گوئی ملاحظہ ہو:

ریگِ عراق منتظر ،کشتِ حجاز تشنہ کام   خونِ حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را

اقبال اس اضطرابی انتظار سے ہمیشہ دو چار رہے کہ

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں   گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اقبال کی فکری مناسبات کا صرف ایک پہلو پیش کیا جاسکا ہے۔شرح و بیاں کے لیے کئی تصانیف اور کئی محفلیں درکار ہوں گی۔آخری بات گوش گزار کرنے کی سعادت چاہتا ہوں۔آپ کچھ اندازہ لگائیں کہ اقبال نے اپنے کلام کا اختتام بھی اسی اشارے پر کیا ہے۔جو میرے نزدیک بڑی برگزیدگی کا حامل ہے۔ہم آپ جانتے ہیں کہ ”ارمغانِ حجاز“ ان کا آخری مجموعۂ کلام ہے۔جو عاشقِ رسول کا نذرانۂ عقیدت ہے۔یہ بسترِ علالت اور آخری لمحات کی دل دوز آرزوؤں کا اظہار ہے جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔اس آخری کتاب کا اختتام اس رباعی پر ہوتا ہے:

قلندر میل تقریرے ندارد   بجز این نکتہ اکسیرے ندارد
ازان کشتے خرابے حاصلے نیست   کہ آب از خونِ شبیرے ندارد

اس نکتے کو ہم آپ فراموش نہ کریں کہ خونِ شبیر کی روح کو خاطر میں لائے بغیر ہر عمل سعی رائگاں ہے۔ مقدس آثار میں حرف زار کی طرف اشارہ ہے کہ اہل ایمان کی جان سپاری کے عوض بہشت ان کے لیے خریدی جا چکی ہے۔کاروانِ وجود رواں دواں ہے۔مردانِ حر کے قافلے کی قیادت کے لیے سپر سنبھالنے سے پہلے بازوئے جگر دار کی ضرورت ہے۔

شمشیرِ پدر خواہی بازوئے پدر آور

☆☆☆☆☆

Dr. Abdul Haque
Dept. of Urdu, University of Delhi,
India, Pin Code -110007

آخری قسط

امام خمینی کی شاعری میں عشق وعرفان

ارشاد حسین

شراب بطورِ مطلق نشہ اور مستی و مدہوشی سے کنایہ ہے۔عارفوں اور سالکوں کی اصطلاح میں یہ محبت اور جذبۂ حق ہے۔ساتھ ہی عشق، ذوق، مستی اور مدہوشی کو بھی شراب سے شبیہ دی گئی ہے۔عراقی ہمدانی شراب کو عشق کے غلبے سے تعبیر کرتے ہیں اور جب عشق کا غلبہ ہو تو انسان سے ایسے اعمال سرزد ہوتے رہتے ہیں جو سادہ لوح انسانوں کے خیالِ خام میں موجب ملامت ہوتے ہیں۔اہل کمال وہی افراد ہیں جو سیر وسلوک کی انتہائی منازل پر فائز ہوں۔امام خمینی کہتے ہیں:

مست از قدح شراب نابم
دور از برِ یار دلربایم

مے وشراب کا استعمال امام خمینی کے اشعار میں کثرت سے دکھائی دیتا ہے اور یقیناً سادہ لوح افراد کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام خمینی جیسے عارف و سالک اور حکیم نے اپنی شاعری میں ان الفاظ سے کثرت سے استفادہ کیا ہے۔اپنے مطلوب کی وضاحت سے قبل ہم عربی اور فارسی ادبیات پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ مے وشراب کا استعمال عربی اور فارسی کے عرفا اور حکما نے بھی کثرت سے کیا ہے۔ اس کا وجود ہمیں پانچویں صدی ہجری سے ہی دیکھنے کو ملتا ہے جب تصوف کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ہاں اس بات کا بیان بھی ضروری ہے کہ اسی وقت شعرا کے درمیان نظریاتی اختلافات پیدا ہو چکے تھے کہ مے وشراب اور ان جیسے الفاظ کا استعمال معشوقِ حقیقی،اس کے جلال و جمال کی توصیف اور اس تک پہنچنے کی راہ میں حائل مشکلات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔اس دور کے بہت سے شعرا نے اس نظریاتی اختلاف کو نظم بھی کیا ہے اور اپنا مسلک ومشرب بھی بتا دیا ہے۔چنانچہ محمود شبستری نے اپنی کتاب ”گلشن زار“ میں ان نظریاتی اختلافات اور شبہات کا جواب کیا خوب دیا ہے:

جہان چون زلف و خط و خال و ابروست   کہ ہر چیزی بہ جای خویش نیکوست
تجلی، گہ جمال و گہ جلال است   رخ و زلف آن معانی را مثال است
صفات حق تعالیٰ لطف و قہر است   رخ و زلف بتان را زان دو بہر است

امام خمینی نے بھی متقدمین سے خوشہ چینی کی ہے لیکن تقلید کی حد تک نہیں۔انھوں نے اپنی بلندی تخیل اور خیال آفرینی سے ان الفاظ کو مختلف معانی و مفاہیم عنایت کیے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عرفانی

مضامین کے بیان میں صنائع و بدائع سے خوب خوب استفادہ کیا ہے ساتھ ہی تمثیلی پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ عشق و عرفان کے مطالب الفاظ کے قالب میں نہیں سما سکتے۔اس مالک حقیقی کی تعریف و توصیف قوت بشری سے باہر ہے۔اس لیے ایسی صورت میں عشق و عرفانیات کے مطالب صریحی طریقۂ اظہار کے ذریعے ممکن نہیں ہیں۔تنہا رمزیت و اشاریت ہی ایک ایسا واحد وسیلہ ہے جس کے ذریعے اہل سیر و سلوک یہ مفاہیم بیان کر سکتے ہیں۔

ان کی دانست میں می جوش محبت اور شراب معرفت ہے، جسے نوش کرنے کے بعد عاشق ذاتِ وجود مطلق میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔یہی درحقیقت بے خودی اور محویت کی کیفیت ہوتی ہے اور بادۂ صافی سے مراد ایسا عشق ہے جو وصل کی لذت اور فراق کے الم دونوں سے خالی ہو۔جہاں ادراک اور لذت و الم کا احساس کھو چکا ہو اور یہی می سچی محویت ہے جو دل کے خانقاہ سے عقل کی راہ کو مسدود کر دیتی ہے۔چنانچہ میخانہ وہ دارالجنوں بن جاتا ہے جہاں عقل کے ٹھہرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

به می بربند راهِ عقل را از خانقاهِ دل
که این دارالجنون هرگز نباشد جای عاقل ها

اور شراب سے مراد وہ ذوق و وجد اور کیف و حال ہے جو محبوب حقیقی کے جلوے سے غلبۂ محبت کے دوران سالک کے دل پر طاری ہوتا ہے اور اس کو مست و بے خود کر دیتا ہے۔اس شراب کے آثار جملہ موجودات میں پائے جاتے ہیں مگر انسان میں قابلیت اور استعداد کی زیادتی کے سبب زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اکثر افراد انسانی بیابان عشق میں سرگشتہ محبوب حقیقی کی تلاش میں حیران و سرگرداں نظر آتے ہیں۔ان میں ایسے مرشد و رہنما کی جستجو رہتی ہے جو محبوب حقیقی کے وصال تک ان کی رہنمائی کرے اور انھیں خودی کی قید سے باہر نکالے، چنانچہ وہ ذوق و وجد جو تجلی ذاتی سے پیدا ہوتا ہے اور ہستی کی قید سے باہر نکال کر فنا کی طرف لے جاتا ہے، اسے اہل عرفان شراب طہور کا نام دیتے ہیں۔

یہاں پر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ مختلف ادوار میں شاعروں، صوفیوں اور عارفوں نے می و شراب اور میخانے کی مختلف تعابیر اور ان میں سے ہر ایک کے لیے مختلف درجات بیان کیے ہیں۔لیکن ان سب کا مطلوب و مقصود ان الفاظ سے بادۂ طہور اور قرب پروردگار ہے اور مستی و مدہوشی سے مراد وہ حالت و کیفیت ہے جب انسان خود کو ذات باری تعالی میں فنا کر کے بقائے دوام حاصل کر لے۔

مقام محو سلوک کی بلندترین منزل ہے جہاں پہنچ کر عارف کے اوپر تمام رموز و اسرار منکشف ہو جاتے ہیں لیکن اگر ساقی کے روح افزا ہاتھوں سے ساغر مل جائے تو عاشق صحو بعد المحو کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے جو سلوک کی آخری منزل ہے جب مدہوشی کے بعد ہوشمندی اور مستی کے بعد ہوشیاری حاصل ہو جاتی ہے۔اس

عظیم مرتبے تک بہت کم افراد کی رسائی ہوتی ہے بلکہ یہ منزلت صرف اسی کو حاصل ہوتی ہے جس پر معشوق کی خاص نظر عنایت ہو۔

همهٔ می زدگان هوش خود از کف دادند
ساغر از دست روان بخش تو هوشیارم کرد

جذب و سوز عرفانیات کا ایک اہم باب ہے۔جہاں عاشق معشوق کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے نظر آتا ہے۔وہ خود کو اس کی ذات میں فنا کر دینے کو ہی زندگی کا ماحصل سمجھتا ہے۔امام خمینی نے اپنے تخیل کی پرواز اور ادراک کی قوت نیز محاکاتی انداز اور اشاریت اور ایمائیت سے کافی حد تک استفادہ کیا ہے جس سے قنوطیت کے بجائے رجائیت کی جلوہ فرمائی نظر آتی ہے۔اپنی ایک رباعی میں کہتے ہیں:

گر بر سر کوی تو نباشم، چه کنم؟
گر والهٔ روی تو نباشم چه کنم؟
ای جان جهان به تار موی تو اسیر
گر بستهٔ موی تو نباشم چه کنم؟

اس کے باوجود وہ ایک حساس دل رکھتے ہیں اور قوم و ملت سے غافل نہیں ہیں۔ان کی شاعری کو بلا تکلف تعمیری اور پیغامی شاعری کہا جا سکتا ہے۔انھوں نے عشق و محبت کو ہی اپنی شاعری کی بنیاد قرار دیا لیکن عشق و محبت کو عرفانیات کی آنچ دے کر اس طرح پیش کیا کہ اس سے انسانی سیرت کی تعمیر کا کام لیا جا سکے۔اس طرح عشق و محبت کو ایک نہایت پاکیزہ اور بلند مقام عطا کیا جس میں پستی، نفس پرستی اور مبتذل جذبات کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔انھیں اپنے عشق اور عاشق پر اتنا اعتبار ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جب تک وہ ساتھ رہے گا دنیا کی کوئی شے اسے گزند نہیں پہنچا سکتی اور جب تک اس کی معیت رہے گی کم و کیف کے عوارض سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

تا دوست بود تو را گزندی نبود   تا اوست غبار چون و چندی نبود

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ یورپ کی مادہ پرستی اور سیاسی و معاشرتی خامیوں کو محسوس کر چکے تھے اور چاہتے تھے کہ ملت اسلامیہ کو اس غلط راستے سے بچا کر اسلامی زندگی کی بلندیوں پر لا کھڑا کریں۔ان کے یہاں آفاقیت ہے جس کی بدولت انھوں نے تمام دنیا کو آزادی کا پیغام دیتے ہوئے غلامی کی لعنت سے خبردار کیا۔یہ شاعرانہ خلوص ہمیں بہت کم شعرا کے یہاں نظر آتا ہے۔

امام خمینی کے اشعار میں می و شراب اور میخانے جیسے الفاظ کے مفاہیم تک رسائی کے لیے ایک آفاقی نظر کا ہونا ضروری ہے۔جیسا کہ ان کے اشعار کے مطالعے سے بھی یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ

اس سلسلے میں ان کا مذہب یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی معرفت کے بغیر انسانی زندگی کا وجود لایعنیت کے مترادف ہے جس کی بارگاہ خداوندی میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ان کے نزدیک دین کا تصور دین کے ٹھیکے داروں، ریاکار اور ظاہر دار زاہدوں اور صوفیوں کے برخلاف انسان کے باطن کی آزاد منشی اور پاکی سے عبارت ہے۔ درحقیقت زہد سے مراد دنیا اور لذت دنیا سے اعراض ہے مگر ریاکار زاہد محراب میں رہتا ہے اور اس کا دل طلب دنیا میں لگا رہتا ہے جس کی انھوں نے بار بار مذمت کی ہے۔

صدر اول کے صوفیوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی تھی کہ وہ دنیا اور شہوات دنیا سے دور رہتے تھے اور صدق دل سے اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔انھیں معلوم تھا کہ زہد کے حقیقی معنیٰ ماسوی اللہ سے اعراض کے ہیں جو ایک جامِ عرفان کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

برگیر جام و جامۂ زہد و ریا درآر　　محراب را بہ شیخ ریاکار واگذار

دوسری جگہ کہتے ہیں:

ساقی بروی من درِ میخانہ باز کن　　از درس و بحثِ زہد و ریا بے نیاز کن

سلوک کی زبان میں مرشد و رہنما کو پیر مغاں، پیر طریقت، پیر می فروش، پیر میکدہ، پیر خرابات، پیر گلرنگ، پیر پیمانہ کش، پیر دردی کش اور شیخ ما بھی کہتے ہیں۔ پیر مغاں حافظؒ شیرازی کی طبع زاد ہے۔ بزرگ اہلِ عرفان اور سالکان معرفت قائل ہیں کہ عرفان و سلوک کی دنیا میں پیرِ مغاں سے مراد حضرت علی ہیں جو عاشقوں کے سالار ہیں۔ امام خمینی نے بھی ایک شعر میں انھیں پیر مغاں کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

دلدادۂ میخانہ و قربانی شربیم　　در بارگہِ پیرِ مغان پیر غلامیم

حافظؒ شیرازی نے بھی پیرِ مغاں سے حضرت علی کی ذات مراد لی ہے:

منم کہ گوشۂ میخانہ خانقاہِ من است　　دعای پیر مغان وِردِ صبح گاہِ من است

دعائے پیر مغاں سے حضرت علی کی مشہور دعا" دعائے صباح" مراد ہے جسے حافظ شیرازی اپنی حیات معنوی کے دوران ہر صبح کو پابندی سے پڑھا کرتے تھے۔(فرہنگ دیوان امام خمینی، ص 98)

امام خمینی نے دانستہ طور پر شریعت و طریقت کی بات کی ہے اور جو مذہب کے نام پر لوٹ کھسوٹ، ناامنی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے اس کو مورد مناقشہ قرار دیا ہے اور خود کو ایک ایسے رند سے تعبیر کیا ہے جو سوز و ساز عالم سے بہرہ بردار اور دولت عشق سے سرشار ہے جو ہر قسم کی مذہبی اور سیاسی مصلحت سے کوسوں دور ہے۔

آن کہ دل بگسلد از ہر دو جہان درویش است　　آن کہ بگذشت ز پیدا و نہان درویش است
خرقہ و خانقہ از مذہب رندان دور است　　آن کہ دوری کند از این و از آن درویش است
نیست درویش کہ دارد کُلہِ درویشی　　آن کہ نادیدہ کُلاہ و سر و جان درویش است

حلقۂ ذکر میارای، کہ ذاکر یار است　　آن کہ ذاکر بشناسد بہ عیان درویش است
ہر کہ در مجمع کسان دعوی درویشی کرد　　بہ حقیقت نہ کہ با ورد زبان درویش است
صوفی ای کو بہ ہوای دل خود شد درویش　　بندۂ ہمّت خویش است، چہ سان درویش است

گویا امام نے خود کو مصلحت اندیش زاہدوں، ظاہر داروں اور ریاکار واعظوں سے می اور میخانے کے ذریعے جدا کیا ہے۔اور ظاہر داری اور ریاکاری کے مقابلے میں می و شراب اور میخانے کو پیش کیا ہے۔ یہاں پر ان کے ظاہری معانی مقصود نہیں ہیں جیسا کہ بزرگ عرفا جیسے حافظ شیرازی، عطار نیشاپوری اور بہت سے عظیم فقہا جیسے ملا محسن فیض، ملا احمد نراقی اور میرزا حبیب مجتہد خراسانی وغیرہ نے بھی ان الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن ان کی مراد اور مطلوب قرب حق اور قرب باری تعالیٰ ہے۔

بطور خلاصہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ می و شراب اور میخانے جیسے الفاظ قرن ششم ہجری تک ایک وسیع معانی اور مفاہیم سے روشناس ہو چکے تھے۔اس وقت تک شراب سے مراد وہ نشاط انگیز شے تھی جو انسان کو مدہوش اور بدمست کر دیتی تھی اور میخانے سے مراد وہ جگہ تھی جہاں شرابی شراب و کباب میں مشغول ہوتے تھے، لیکن عرفانیات کے باب میں ان الفاظ کے معانی میں کافی وسعت اور تنوع پیدا ہوگیا اور شراب و میخانے ذات حق تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ قرار پائے۔آخر میں ان کی اس غزل پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

بوی گل آید از چمن، گویی کہ یار آن جا بود
در باغ جشنی دل پسند از یاد او برپا بود
بر ہر دیاری بگذری، بر ہر گروہی بنگری
با صد زبان، با صد زبان، در ذکر او غوغا بود
آن سرو دل آرای من، آن روح جان افزای من
در سایۂ لطفش نشین کاین سایہ دل آرا بود
ان تارہا را پارہ کن، وین دردہا را چارہ کن
آوارہ شو آوارہ کن، از ہر چہ ہستی زا بود
بردار این ارقام را، بگذار این اوہام را
بستان ز ساقی جام را، جامی کہ در آن "لا" بود

☆☆☆☆☆

Maulana Irshad Husain
Purana Pura, Post- Kurthijafarpur,
Dist. Mau U.P -275305,
Mob. 8896740346

ہندو پاک میں تفسیر اور اس کا اسلوب

سید مرتضیٰ حسین (صدر الافاضل)

مکہ قدیم الایام سے عرب کا مرکزی شہر تھا۔اس کی دو خصوصیتیں اسے دنیا کے دوسرے شہروں سے ممتاز کرتی تھیں۔ایک خانۂ کعبہ کا وجود دوسرے حبشہ و ہند و سندھ و شام کے تاجروں کی سالانہ منڈی کا اجتماع۔حج کے موقع پر دور دراز کے بت پرست، صابئ، یہود و نصاریٰ مذہبی رسوم اور تجارتی مقصد کے لیے یہاں جمع ہوتے تھے۔مذہبی چرچے، مقامی قصے، سماجی تبادلہ، افکار و مشاہدات اور مختلف اقوام سے روابط کی تجدید عمل میں آتی تھی۔مکہ کا قدیم تاریخی اور سماجی نظام جیسا بھی تھا، مختلف طاغوتی قوتوں اور استعماری طاقتوں کے ہاتھوں ایک بڑے تصادم سے اس وقت دو چار ہوا جب ابرہہ نے یمن کے اقتدار اعلا کی نمود و نمائش کے لیے مکہ پر حملہ کیا تھا اس وقت مکہ سے زیادہ خانۂ کعبہ تباہی و بربادی کے قریب نظر آتا تھا۔

عین اس سیاسی و استعماری بحران کے موقع پر نور حق چمکا اور ابراہیم بت شکن کے خانوادہ عالی سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمت خدا بن کر نمایاں ہوئے اور دیکھتے دیکھتے لوگوں کے لیے قبلۂ دل و جان بن گئے۔حضرت ابوطالب نے کہا:

حملۂ ابرہہ کو چالیس سال گزرے تھے کہ محمد امین و صادق کے وزنی کردار نے پورے معاشرے کو ہلا دیا۔امیوں کی بستی، خیال باف شاعروں کی آبادی اور خانہ جنگی میں مبتلا قبائل میں یہ چرچا عام ہوگیا کہ عبداللہ کا فرزند اور ابوطالب کا بھتیجا کہتا ہے کہ اس پر کلام خدا اترتا ہے۔وہ پڑھنے لکھنے کی دعوت، بن دیکھے اللہ کو ماننے کی ہدایت اور دیوی، دیوتا، طاغوت اور وہمی خداؤں کا انکار کرنا سکھاتا ہے۔

وحی کا نزول مکے میں ہوا، عقیدۂ توحید کا درس، اخلاق کی تعلیم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سبق شروع ہوا، ثواب وعقاب، حشر و نشر کی بات ہوئی۔ پہلے تو شہر والوں نے سنا، پھر اس کا چرچا غیروں تک پہنچا، حج کے موقع پر دور دراز سے آنے والے تاجروں، قوموں، سیاستدانوں، مختلف مملکتوں کے مختلف النوع عقائد و افکار کی ترویج کرنے والوں، رنگارنگ عقیدے رکھنے والوں نے بھی بات سنی، کسی نے تعجب کے ملے جلے انداز سے خبر سنائی، کسی نے تمسخر و طعن سے قصہ سنایا، کچھ لوگوں نے ہمدردوں کی زبانی واقعات سنے اور کچھ خوش نصیبوں کو آیات قرآن سننے اور ان کا مدعا سمجھنے کا بھی موقع ملا۔ایسا بھی ہوا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آیات کی تلاوت فرماتے اور ان

کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے دیکھے گئے۔یوں آغاز نزول وحی کے زمانے سے آیات کا مطلب مختلف زبانوں اور مختلف لہجوں میں بیان ہونا شروع ہوگیا۔ان میں کچھ ذمہ دار ترجمان ہوں گے جن کے نام آگے چل کر سب نے سنے، سلمان فارس کے، بلال حبشہ کے اور صہیب روم کے تھے، ان کی غیر عرب زبانوں سے واقفیت کا تقاضہ ہے انھوں نے اپنے ہم زبانوں کو بات سمجھائی تو قرآن کی تفسیر کا دوسری زبانوں میں ہونا یقینی ہے۔اسی طرح یہود و نصاریٰ جو عبرانی و سریانی، حبشی زبانوں سے واقف تھے۔

وحی کے نزول کو ابھی پانچ برس بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ رسول اللہؐ نے ایک گروہ جو سو سے زیادہ زن و مرد پر مشتمل تھا حبشے بھیج دیا، اس وفد نے نئی زمین، نئے ملک، نئی قوم حبشے والوں میں جا کر قرآن اور اس کی دعوت کا چرچا کیا۔نجاشی نے قریش کے نمائندوں کی شکایت کے جواب میں رسول اللہؐ کے بھائی اور مہاجرین کے سربراہ حضرت جعفر ابن ابی طالبؑ کو دربار میں طلب کیا۔اس وقت دربار میں ارکان سلطنت، علمائے نصاریٰ اور نمائندگان مشرکین عرب جمع تھے۔بادشاہ نے جعفر سے پوچھا تمھارا نیا عقیدہ کیا ہے؟ انھوں نے سورۂ مریم کی آیتیں تلاوت فرمائیں، بادشاہ نے جواب میں کہا کہ اس کے عقیدے میں حضرت عیسیٰؑ اور مریمؑ ایسی ہی ہیں جیسے محمدؐ کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ نجاشی کے دربار میں عربی جاننے والے کم اور حبشہ کی زبان جاننے والوں کی کثرت تھی۔بادشاہ کی زبان بھی عربی نہ تھی اس لیے ترجمان اسلام نے جو آیتیں پڑھی تھیں اس کے ترجمہ وتفسیر کے لیے مقامی زبان ہوگی۔

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کا آغاز، نزول قرآن کے وقت سے دو مقاصد کے تحت ہوا ایک تزکیۂ نفس جسے خود سازی کہہ لیجیے، یہ کام خود رسول اللہؐ نے انجام دیا اس پر دلیل ہے۔

دوسرے غیر عربی زبانوں اور غیر ملکی افراد کے لیے افہام معانی وتفسیر مطالب کی خاطر جس کا غیر معتبر ذریعہ غیر مسلم اور معتبر ذریعہ مسلمان تھے۔مسلمانوں پر واجب تھا کہ پیغام خدا اور احکام رسول دوسروں تک پہنچائیں۔آنحضرت روحی لہ الفدا نے یمن اور متعلقہ عرب علاقوں میں اپنے آدمی بھیجے اور حبشہ میں اپنا بھائی بھیجا جو مدت تک وہاں قرآن اور اس کی تعلیمات کا بیان کرتا رہا، اس سے مسلمانوں کو تفسیر کے لیے سنت کا حوالہ ملا۔

قدیم تاریخ عرب کے واقف کار جانتے ہیں کہ سندھ و ہند، بلکہ ساحل بحر عرب و ہند کے رہنے والے مدتوں سے تجارتی سفر کرتے اور دیبل و سورت و کھمبات کی بندرگاہوں سے عربوں اور ہندی اقوام سے گوناگوں روابط تھے۔

اسلام کی توسیع کے ابتدائی زمانے میں یہ تاجر اسلام کی تعلیمات کی خبریں لے کر برصغیر میں آچکے تھے اور جب ابتدائی خلافت میں قصدار اور کابل و ملتان و دیبل و الرور میں مسلمان تاجر یا سیاست داں یا مبلغ یا فوجی وفود آئے تو انھوں نے قرآن بھی پڑھا اور پوچھنے والوں یا دوستوں کو اس کے معانی بھی بتائے، اس وقت ان کا لہجہ حملے کے بجائے دوستانہ اور جدل کے بجائے صرف پیام پہنچانے والا تھا۔

تاریخی حوالے بتاتے ہیں کہ سندھ میں مسلمانوں کی عزت کی جاتی تھی، مسلمان سندھ کے علاقوں میں آباد تھے

اوران کا مرکز حکومت ''منصورہ'' نامی نو آباد شہر تھا جہاں تیسری صدی ہجری میں ایک عرب خاندان حکومت کرتا تھا۔ 270ھ/ 883ء میں عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز (1) نامی حکمراں نے اپنے پڑوسی ہندو راجہ مہروک بن رائک/ رائق والی ''الراء'' کی فرمائش سے قرآن مجید کی تفسیر لکھوائی، بزرگ بن شہریار کے عربی سفرنامے ''عجائب الہند'' (2) کی روایت کے مطابق یہ کام ایسے عراقی الاصل عالم نے انجام دیا جو سندھ میں پلا بڑھا تھا، تفسیر کی زبان ''ہندیہ'' لکھی ہے۔ ہندیہ سے مراد، سنسکرت بھی ہو سکتی ہے جو یہاں کی علمی زبان تھی اور سندھی بھی مراد لینا ممکن ہے جو وہاں کے عوام کی بولی تھی۔ یہ تفسیر کم از کم برصغیر میں پہلی نامکمل اور گم شدہ تفسیر ہے جو بزرگ بن شہریار کے زبانی حوالے پر تاریخ تفسیر نویسی کا جز بنی۔ بظاہر یہ تفسیر سادہ افہام و ابلاغ کے لیے لکھی گئی ہوگی۔

محمود غزنوی کی فتح ہند سے پہلے اور بعد ہمیں کسی تفسیر کا نام نہیں ملتا، صرف یہ معلوم ہے کہ سید محمد اسماعیل بخاری تفسیر کے بہت بڑے عالم اور لاہور میں درس قرآن کے مدرس تھے۔ ان کی وفات 448ھ/ 1056ء میں ہوئی (3) اب تک مسلمانوں کے پاس بڑی تفسیریں لغوی اور روایتی مباحث سے آگے نہیں بڑھی تھیں۔ شیخ ابو جعفر طوسی (متوفی 460ھ) جاراللہ زمخشری (متوفی 538ھ) اور فخرالدین رازی (متوفی 606ھ) کی تفسیروں نے استدلال و فلسفہ و عقائد کے تفاصیل کا راستہ دکھایا، اور برصغیر میں مسلمانوں کو ریاست و سیاست کے تجربوں سے دو چار ہونے کا موقع ملا۔ ثقافت نے قدم جمائے اور فکر نے انگڑائی لی۔ درس تفسیر و مباحث کے مکتب کھلے تو نظام اعرج دولت آبادی، قمی نیشاپوری نے غرائب القرآن لکھی (غالباً یہ کتاب دکن میں 730ھ کے حدود میں لکھی گئی) اس میں رازی سے بحث ہے۔ پھر نوراللہ شوستری شہید ثالث (متوفی 1019ھ) نے بیضاوی پر حاشیہ کے علاوہ متعدد موضوعات پر الگ الگ تفسیری بحثیں لکھیں، یہاں سے مقامی مسائل اختلافی نے تفسیر کا ایک نیا موڑ لیا۔

ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی 1167ھ) وہ نامور مصنف ہیں جنھوں نے تفسیر کے تقلیدی دور کو نئی فکر اور سیاسی و سماجی رخ پر لانے کی طرف قدم بڑھایا۔ ان کی کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر اور حجۃ البالغہ نے نئی بحثوں کا آغاز کیا۔

تیرہویں صدی میں انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے، اب تک مسلمانوں کی علمی زبان عربی اور فارسی تھی اور ان کے علوم و تصانیف انھیں زبانوں میں تھے۔ عربی و فارسی زبان میں لکھی ہوئی تفسیروں کے مخاطب بھی مسلمان تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس عہد کی تفسیر میں ہندو فلسفہ و افکار و تاریخ نیز سیاسی و ثقافتی رجحانات کا کوئی اثر نہیں ملتا۔

خلاصہ یہ کہ تیسری ہجری سے گیارہویں ہجری تک برصغیر میں تفسیر کا مقصد تھا:

(1) اپنوں اور غیروں تک قرآن اور اس کا سادہ مفہوم پہنچانا مگر مخاطب مسلمان تھے۔

(2) اختلافی مذاہب، عقائد و فقہ پر روشنی ڈالنا اور اپنے مذاہب کی تائید۔

(3) صرفی نحوی، قرأتی بحث اور ربط آیات و سورات پر گفتگو۔

(4) نسبتاً کلامی فلسفہ اور ادبی بحث، مفسرین کی آرا و مباحث، مفصلات میں شیعہ و سنی مجادلے۔

(5) عرفانی و صوفی تفسیر

(6) تفسیر کی زبان عربی یا فارسی ہونا چاہیے۔

انگریزوں کی آمد سے دو اثر نمایاں ہوئے ایک تو عیسائیوں نے اپنی کتابیں عوام کے لیے لکھنا اور چھاپنا شروع کیں جن میں مسلمانوں پر حملے تھے، وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانا چاہتے تھے۔ دوسرے انھوں نے مغربی اور ہندوستانی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے اور اس پر اعتراضات کرنے کی مہم شروع کی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو دفاع کا انتظام کرنا پڑا۔

یہاں پر یہ بات واضح رہے کہ میں عربی سے کسی دوسری زبان میں ترجمے کو تفسیر اس لیے قرار دیتا ہوں کہ اس میں قرآن کے الفاظ سے پردہ اٹھا کر غیر عرب کو مطالب کے چہرے دکھائے جاتے ہیں۔ دوسرے ترجمہ کرنے والے اپنی معلومات کو مفہوم قرآن سمجھ کر کبھی حاشیے اور کبھی متن میں قوسین کے ساتھ بیان کرتے ہیں جیسے قدیم ترین عرب مفسرین کا عمل تھا۔

ابھی تک ہندی، سنسکرت اور سندھی پنجابی میں ترجمے کو بے ادبی بلکہ حرام سمجھا جاتا تھا لیکن جب انگریزوں نے ہندوستانی زبان اور رومن رسم الخط میں قرآن کا ترجمہ چھاپا تو مسلمان مجبور ہوئے اور انھوں نے بھی پہلے اپنے عوام کے لیے پھر دوسروں کے جواب میں اردو ترجمے، تفسیریں اور مقدمات تفسیر کا آغاز کیا۔ اس کام میں شہرت سرسید احمد خاں بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو حاصل ہوئی۔ وہ انگریزی افکار و ثقافت سے مرعوب ہوئے اور کہا کہ ہمیں یورپ سے ٹکر لینے کے بجائے مفاہمت کی راہ اختیار کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ انگریز فاتح تھا اس سے ''کچھ لو اور کچھ دو'' کی بنیاد پر برابری کے ساتھ صلح ممکن نہ تھی اس لیے تفسیر پر ذہنی شکست کی ایک چھاپ لگی اور کتاب مقدس سے قرآن کو ہم آہنگ کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ سرسید نے ''مکاتبات الخلاقان'' (4) اور تحریر فی اصول التفسیر (5) پھر براہ راست تفسیر و مباحث آیات اردو میں لکھنا شروع کر دیے جس سے پورے ملک میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ انگریزوں نے اسے خوش آمدید کہا اور مسلمانوں نے اسے مسترد کیا۔ اسی دور میں سید جمال الدین اسد آبادی ہندوستان آئے اور انھوں نے سرسید احمد خاں کے افکار کے خلاف تقریر و تحریر کے ذریعے مسلمانوں کو ہوشیار باش کی صدا دی۔ سرسید کی تفسیر نے علما میں ایک نئی لہر پیدا کی اور شیعہ سنی دونوں نے ان کے جواب میں کام شروع کیا۔ اسی کو ہم فن تفسیر میں نہضت کا دور کہتے ہیں۔ اس کے دو ستون تھے، حالات سے مفاہمت قرآن کے ذریعہ اور دوسری بات مسلمانوں کی بیداری و استقلال قرآن کے ذریعہ۔

مفاہمت کی طرف لے جانے والوں کے قائد چراغ علی و سرسید تھے اور ان کی مخالفت میں فن تفسیر میں

عبدالحق حقانی اور سید علی محمد تاج العلما آگے آگے تھے۔ عرب میں اس وقت محمد عبدہ، رشید رضا اور شیخ جواد بلاغی کا موقف بھی نئے افکار سے تصادم اور ان کی تردید کے ساتھ دفاعی انداز کے بجائے مقابلہ کی للکار کا لہجہ آیا۔ مسلمان بیداری کے نئے دور میں داخل ہوئے۔ مصر و عراق کے علما نے اسلام کی توانائی کا اعلان کیا اور مسلمان میدان میں اترے تو برصغیر کے مسلمانوں نے بھی انگڑائی لی، یہاں کے جوانوں اور یورپ کے تعلیم یافتہ لوگ بھی طاقت آزمائی کے لیے تیار ہوئے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کے اشعار نے عوام کو دعوت تدبر فی القرآن دی:

تو ہمی دانی کہ آیین تو چیست؟ زیر گردون سرّ تمکین تو چیست؟
آن کتاب زندہ قرآنِ حکیم حکمت او لایزال است و قدیم
نوع انسان را پیام آخرین حامل او رحمۃ للعالمین
از جہان بانی نوازد ساز او مسند جم گشت پا انداز او
گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اور دوسری جگہ کہا:

رمز قرآن از حسینؑ آموختم
ز آتش او شعلہ ہا اندوختم

قرآن کو اساس ماننے کا عقیدہ عمل میں آیا اور کچھ عرصے بعد پاکستان قائم ہوا۔ قیام پاکستان سے پہلے برصغیر میں تفسیر نویسی کے رجحانات جو کھل کر سامنے آئے وہ کم از کم یہ ہیں۔ بارہویں صدی ہجری سے چودھویں صدی تک غلامی اور آزادی کا عہد ہے۔ اس دور میں پہلے:

(1) استعماری افکار کے دباؤ اور اس کے رد عمل کا اظہار ہوا۔
(2) اتحاد ملت اور دشمن سے مقابلے کی تیاری کا عمل شروع ہوا۔
(3) تفسیر کا لہجہ بدلا، اسلوب بیان اور انداز فکر میں تبدیلی آئی۔ مفاہمت و دفاع کا تیور ابھرا۔
(4) اسلام کے نظام حکومت اور اس کے مسائل پر بحث چھڑی تو قرآن کے نظام سیاست، قرآن کے نظام حکومت، قرآن کے نظام عدل، قرآن مجید کے نظام اقتصاد پر بحث و نظر نے وسعت حاصل کی اور مفسرین نے ان موضوعات و مسائل پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھا اور قرآن کا مطالعہ نئے سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے ضروری بھی تھا کیونکہ قرآن مجید ہی مسلمانوں کی اصولی رہنما کتاب ہے۔

پاکستان کے قیام نے فکر کو ایک نیا افق دیا اور قرآن مجید کا مطالعہ دو الگ زاویوں سے شروع ہوا۔ ایک سر سید کا دبستان دوسرے سید جمال الدین اسدآبادی کا دبستان۔ کم و بیش نصف صدی سے اس انداز میں کام ہو رہا ہے۔ علامہ شیخ عبدالعلی ہروی تہرانی اور علامہ اقبال پھر ان کے بعد والوں نے اہل علم کو جو دعوت دی تھی،

اس نے پھیلاؤ اور گہرائی حاصل کی اور اس وقت پاکستان میں تفسیر پر بڑی تیزی سے کام ہو رہا ہے۔

پندرہویں صدی ہجری کا سورج، انقلاب اسلامی ایران کو سلام کرتا ہوا مسلمانوں کے افق پر ابھرا۔ یہ انقلاب خالص اسلامی نظریات کی ان درسگاہوں سے اٹھا ہے جہاں صدیوں سے موت کو لبیک کہی گئی مگر دوسرے نظریات زندگی کو قبول نہیں کیا گیا۔ جن لوگوں نے صرف قرآن و رسول و آل رسول کی ثقافت و فکر سے عہد وفا باندھا ہے غیر کی بیعت تو کیا ہاتھ میں ہاتھ دے کر بھی جینا گوارا نہیں کیا۔ اس انقلاب میں قرآنی تعلیمات اور تفسیر کے قرآنی مطالب کو ذہنوں میں جاگزیں کرنے کا سب سے بڑا دخل ہے۔ یہ انقلاب اور بحمدہ تعالیٰ اس کی سینتیس سالہ کامیاب زندگی اور عملی مظاہرے نے دنیا کو مشاہدات کے ذریعے سمجھا دیا کہ اسلام زندہ و پایندہ دین و نظام زندگی و سیاست و ریاست ہے اور قرآن اس کی اساس ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ اسلامی انقلاب قرآن مجید کی ایک عملی تفسیر ہے جس کا حیرت آفریں اثر پوری دنیا پر عموماً اسلامی دنیا پر خصوصاً اور پاکستان پر اس کے نظریاتی مملکت ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔

میں برصغیر میں قرآن پر تفسیری عمل کا ایک جائزہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پیش کر چکا ہوں۔ یہ کتاب اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ کے نام سے چھپ چکی ہے۔ احباب اسے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اس مقالہ میں میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ برصغیر کے مسلمانوں نے ترجمہ و تفسیر کا کام، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں اس قدر کیا ہے کہ ارباب نظر کو اہمیت معلوم رہے۔

فارسی چونکہ اہل علم اور عوام کے لیے ایک بڑے طبقے کی زبان تھی اس لیے پہلے تفسیر و ترجمہ کا کام فارسی میں ہوا، فارسی تراجم قدیم زمانہ سے بارہویں صدی تک کتنے ہوئے؟ اور کس کس نے لکھے؟ بہت مشکل سوال ہیں لیکن عام دسترس میں ایک وہ ترجمہ ہے جو اس وقت کتب خانہ حضرت امام رضا علیہ السلام میں موجود ہے اور اسی کے مطابق "غرائب القرآن" یعنی تفسیر نیشاپوری کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ فہرستوں میں "مجمع البیان" طبرسی کا خلاصہ فارسی میں خواجگی شیرازی نے ہندوستان میں لکھا (6)۔ خالص ہندوستانی عالم قاضی جون پوری، شہاب الدین دولت آبادی نے "بحر مواج" کے نام سے تفسیر لکھی جو چھپ چکی ہے۔ اس میں نحو، عقائد، اور فقہ حنفی پر بحث ہے۔

پھر بڑی تفسیر نور الدین نعمت اللہ شافعی نے "نعمت عظمیٰ" کے نام سے کی جس کا ایک نسخہ لاہور کے کتب خانہ حائری میں آج بھی موجود ہے۔ میں نے اسٹوری اور علی نقی کے حوالے سے اپنے مقالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (7) میں اس تفسیر تک رسائی سے پہلے اسے نعمت خان عالی کی تصنیف قرار دیا ہے جو درست نہیں ہے۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ (متوفی 1176ھ) کا ترجمہ "فتح الرحمن بترجمۃ القرآن" (متعدد طباعات) پھر ان کے بیٹے کی فارسی تفسیر (مطبوعہ) اور اس کے بعد بہت ضخیم اور مفصل تفسیر سید ابوالقاسم حائری (متوفی 1324ھ) اور ان کے بیٹے سید علی حائری (متوفی 1360ھ) نے لکھی جس کی بیس جلدوں سے زائد کی اشاعت کا مجھے علم ہے اور

ستائیسویں جلد سورۂ قمر کی آیت 10 تک میں نے قلمی دیکھی ہے۔ یہ تفسیر پاکستان میں فارسی تفسیر کے سلسلے کی اہم ترین خدمت ہے،اس کا نام ''لوامع التنزیل'' ہے۔

عربی میں تفسیری کام کا مختصر جائزہ لیا جائے تو اہم ترین تفسیروں میں جو دستیاب ہیں ان میں ''تفسیر مہائمی یعنی تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان بعض ما یشیر الی اعجاز القرآن'' ہے جس کے مولف مخدوم علی مہائم بمبئی (متوفی 835ھ) ہیں یہ کتاب فلسفہ و عرفان میں ابن عربی، فقہ میں شافعی دبستان کی نمائندگی کرتی ہے۔(8) دوسری اہم اور مفصل فلسفیانہ تفسیر ''منبع عیون المعانی'' ہے جس کے مولف ہیں شیخ مبارک بن شیخ خضر ناگوری (متوفی 1001ھ)۔ یہ تفسیر نایاب ہے۔ مجھے اس کے کامل نسخے کا سراغ ایک سال قبل مولانا آغا مہدی صاحب نے دیا یہ تفسیر ممتاز العلما کے کتب خانہ لکھنو میں ہے۔

تیسری بڑی تفسیر ''التفسیر المظہری'' تالیف قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی (متوفی 1225ھ) ہے جو دہلی میں چھپی ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کی ''فتح البیان فی مقاصد القرآن'' پہلی مرتبہ بھوپال سے 1291ھ، دوسری مرتبہ بولاق سے 1307ھ میں چھپی ہے۔ انھیں مصنف کی دوسری مختصر تفسیر ''نیل المرام فی احکام القرآن'' بھی ہندو مصر میں چھپی ہے۔ ''تفسیر القرآن بکلام الرحمن'' آیت سے آیت کی تفسیر، ثناء اللہ امرتسری نے لکھی ہے، یہ بھی چھپی ہے۔

احکام و فضائل اہلبیت پر بھی تفسیریں لکھی گئی ہیں جن میں ادبی شان کی تفسیر ''روائح القرآن'' مفتی محمد عباس نے فضائل میں لکھی اور لکھنو سے 1277ھ میں شائع ہوئی اور دوبارہ چھپنے کے قابل ہے۔

''سواطع الالہام'' فیضی ابن شیخ مبارک کی مکمل تفسیر قرآن عربی میں بشرط حروف غیر منقوطہ ایک ادبی تحفہ ہے، جو 1002ھ میں لکھی گئی اور 1306ھ میں لکھنو سے چھپی۔

مشکلات آیات، علوم قرآن، توحید و نبوت و امامت فی القرآن کے موضوعات پر عربی میں کم و بیش سو کتابیں مطبوعہ صورت میں مل سکتی ہیں جس سے تفسیری رجحانات کی نشاندہی ممکن ہے۔

برصغیر میں سب سے اہم کام انگریزی میں ہوا، ہندوستان کے انگریزی داں طبقے کا خیال تھا کہ انگریز اپنے اقدامات میں معذور ہیں، ہمارا فریضہ ہے کہ ہم انگریزی میں قرآن کی تفسیر لکھیں تاکہ وہ ہمارا نقطہ نظر سمجھ سکیں چنانچہ یہ مہم شروع ہوئی۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی، مرزا ابوالفضل جنھوں نے راڈویل اور نولڈ کی طرح قرآن بہ ترتیب نزول تیار کر کے ترجمہ کیا تو ملک میں ہنگامہ ہوگیا۔ دوسرا ترجمہ انھوں نے بہ ترتیب نزول لکھا۔ شیخ بادشاہ حسین نے ایک طویل مقدمے کے ساتھ تفسیر اہل بیتؑ کے ساتھ ترجمہ کیا۔ اسی طرح متعدد حضرات نے کام کیا۔ عمومی طور پر یہ تفسیریں پسند کی گئیں:

(1) تفسیر عبداللہ یوسف علی، طبع لاہور

(2) تفسیر مرزا مہدی پویا و میر احمد علی، طبع کراچی

(اس موقع پر توجہ دلانا ضروری ہے کہ کچھ عرصے سے انگریزی اور دوسری مغربی و افریقی زبانوں میں قادیانیوں نے ترجمہ و تفاسیر کی جو مہم شروع کی وہ اسلام کے خلاف اسی قسم کی سازش ہے جیسے بہائی کیا کرتے ہیں۔ اہل دانش و بینش کو محتاط رہنا چاہیے اور اس کا سد باب کرنا ضروری ہے) یوں تو ہندی، پنجابی، پشتو، گجراتی، سندھی وغیرہ میں بھی منظوم و منثور ترجمے اور تفسیریں موجود ہیں مگر اہم کام اردو میں ہوا ہے۔ انگریزی اردو میں بھی تفسیر نویسی برصغیر میں ہی ہوئی۔ عربی و فارسی میں تفسیر تقلیدی تھی مگر اردو میں عموماً غرض و غایت طے کر کے تفسیریں لکھی گئیں۔

ان کا پہلا مقصد تھا اپنوں میں قرآنی تعلیمات سے دلچسپی پیدا کرنا۔ دوسرا مقصد تھا مخالفین قرآن کے شبہات کا جواب، جو بعد میں مختلف نظریات و افکار و تعلیمات میں بدل گیا۔ تیسرا مقصد تھا لفظی پھر رواں معنی خیز ترجمہ اور متوسط اعلا درجے کی تبلیغات اور آخر میں سیاسی، سماجی اور نظام زندگی کے ہر پہلو کی تشریح قرآن مجید کی روشنی میں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ تفسیر اردو میں جدت اور خالص جدت، یعنی نفی حدیث اور قبول سخن غیر کی بات سرسید احمد خاں نے کی جس نے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ایک دبستان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دوسرا دبستان علمائے دین کا ہے جس کی روش اور اسلوب الگ ہے۔ روایتی اور جدلی، عرفانی اور سادہ فلسفی بھی۔ آزادی کی بات بھی ہے اور دوسرے معاملات بھی۔ ہم اس وقت ان تفسیروں کی فہرست نہیں دینا چاہتے، یہاں صرف اسالیب و رجحانات کا تذکرہ کر کے مقالہ ختم کرنا مقصود ہے۔

(1) عموماً مفسرین کا اسلوب سادہ زبان اور سادہ مطالب کا بیان ہے۔ ایسی تفسیریں مقبول و مشہور ہوئیں۔

(2) طویل تفاسیر میں بحث اور رد اعتراضات اور مسلک کا بیان تو ہے مگر انداز بیان بھاری پن لیے ہوئے نہیں ہے۔ اس قسم کے مفسرین میں عبدالقادر دہلوی، نذیر احمد، تاج العلما علی محمد، محمد قلی خاں کان پوری، مقبول احمد، حافظ فرمان علی، امداد حسین کاظمی، عبدالحق حقانی، عمار علی سونی پتی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، اشرف علی تھانوی، امداد علی مترجم قرآن و خلاصۃ المنہج، مولانا محمود حسن و شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا راحت حسین صاحب گوپال پوری مصنف تفسیر انوار القرآن اور مولانا ابوالاعلی مودودی کے نام سر فہرست ہیں۔

تفسیر نویسی کا کام ہو رہا ہے اور اسلوب بدل رہا ہے۔ انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کے بعد جہاں جہاں امکان و استدلال کی بات کی جا رہی تھی اب وہاں وجود اور تجربوں کے حوالوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور سب دیکھ رہے ہیں کہ اردو تفسیر کا دور آنے والا ہے۔

☆☆☆☆☆

قاضی عبدالودود کے خطوط نثاراحمد فاروقی کے نام

محضر رضا

ادیبوں اوردانش وروں کے خطوط کئی اعتبار سے ہماری علمی ،ادبی اورتہذیبی تاریخ کا اہم ماخذ ہیں۔ اکثران سے دقیق اورپیچیدہ قسم کے مسائل کا بھی سد باب ہوا ہے۔خطوط کا مطالعہ نہ صرف یہ کہ ہم کومکتوب نگار کے افکارونظریات اورشخصیت سے باخبر کرتا ہے۔بلکہ اس کے علمی محرکات اورشخصی تعمیر میں معاون افراد واسباب کا پتہ بھی دیتا ہے۔خطوط کی اپنی تاریخی معنویت بھی ہے۔اپنے عہد کی علمی ،ادبی ،سیاسی ،سماجی حلقوں کی سرگرمیاں، دانش وروں کاطریقۂ کار، ان کے باہمی روابط، اہم کتابوں اوردستاویزوں کے متعلق معلومات بھی خطوط کا حصہ ہوتے ہیں۔خطوط میں کچھ ایسی پتے کی باتیں بھی مل جاتی ہیں جوان کی خودنوشت سوانح عمری یاان کے متعلق لکھی گئی تحریروں میں بھی نہیں ملتیں۔اس کے علاوہ ان کےتصورات کے ساتھ ساتھ وہ تاثرات بھی سامنے آجاتے ہیں جووقتی ہوتے ہوئے بھی ان کی سوانح اورسیرت کے بعض ممتازگوشوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔دانشوروں سے متعلق بعض حقائق کا پتہ ان کی مستقل تصنیفات سے نہیں چلتا،ایسا بھی نہیں کہ مصنف ان کوپردۂ راز میں رکھنا چاہتا ہےلیکن کسی وجہ سے ان کی پیش کش بھی نہیں ہوتی۔مثلاً غالب،سرسید،مولاناابوالکلام آزاداوربعض دیگر مشاہیر کی زندگی کو اگرسامنے رکھیں تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ان کی شخصیت کے نہایت اہم پہلوؤں کا سراغ انھیں تحریروں سے ملاہے جنھیں ہم خطوط کانام دیتے ہیں۔

قاضی عبدالودود کاشماراردواورفارسی کےممتاز محققین میں ہوتا ہے۔ان کی تحریروں سے جہاں ادبی تحقیق کی روایت مستحکم ہوئی وہیں تحقیق کے اصول بھی مقرر ہوئے۔ان کے خطوط کا مطالعہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس سےعلم وتحقیق کے بہت سے تاریک پہلوروشن ہوئے ہیں۔ان خطوط میں عبارت آرائی اور تصنع کادخل نہیں۔ انشاپردازی کے بجائےمقصدیت پرزورہےاوراس بات کی شعوری کوشش ملتی ہے کہ کم سےکم الفاظ میں مطالب اداہوجائیں۔ذاتی احوال کے متعلق بہت کم گفتگو کرتے ہیں۔اگرکسی نے دریافت ہی کرلیا توبڑے اختصارکےساتھ اتنا لکھنا کافی ہوتا ہے کہ”طبیعت ابھی خراب ہے“۔آداب والقاب اوردعائیہ کلمات ان کےکسی خط میں نظر نہیں آتے۔ روزاول سے ہی وہ اپنے مخاطب کے لیےکوئی حرف خطاب متعین کرلیتے ہیں اورزیادہ ترعزیزی، محبّی ،یاشفیق مکرم ہوتا ہے۔جواب نہایت پابندی سے دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات ظاہرہوتا ہے کہ خط پڑھتے ہی جواب تحریر کردیا گیاہے۔بقول پروفیسر نذیراحمد”ان (قاضی عبدالودود) کاساراوقت تین کاموں کے لیےمخصوص تھا۔مطالعۂ کتب، دانش وروں کےعلمی سوالوں کے جوابات،دوستوں کی علمی مجلسوں میں شرکت،بظاہر یہ تین مختلف کام ہیں۔لیکن حقیقت

میں یہ ان کے ایک ہی ذوق کی تسکین کی الگ الگ صورتیں ہیں۔اوراس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تحقیق کی جس دنیامیں مقام حاصل کیا تھااس میں آئندہ نسل کی نمائندگی دیکھنا چاہتے تھے اوراپنے خطوط کے ذریعے نووارد ین کے ذوق تحقیق کومہمیز کرتے رہے۔تشنگان علوم کے واسطے ان کی شخصیت کسی عالیشان کتب خانے سےکم نہ تھی۔یوں توکوئی اجنبی شخص بھی خط کے ذریعے ان سے کوئی سوال کرتا تو جواب دینا اپنا فرض عین سمجھتے تھے اوراکثر مسلسل کئی خط جواباً لکھتے لیکن پروفیسر نثاراحمد فاروقی کے ساتھ ان کے مراسم کی نوعیت بالکل جداگانہ تھی۔نثاراحمد فاروقی کے نام ان کے خطوط انجمن ترقی اردو ہند دہلی کی لائبریری میں محفوظ تھے اوراب راقم کی کتاب ُمکاتیب قاضی عبدالودوُد کاحصہ ہیں۔ان خطوط کے مطالعے سے یہ ظاہرہوتا ہے کہ قاضی صاحب اورنثاراحمد فاروقی کارشتہ ایک شفیق استاد اورلائق شاگرکا تھا۔نثاراحمد فاروقی ان لوگوں میں ہیں جن کو قاضی صاحب نے سب سے زیادہ خط لکھے ہیں۔ نثاراحمد فاروقی کی ادبی زندگی کا جائزہ لیاجائےتومعلوم ہوگا کہ ان کی ادبی خدمات پرقاضی صاحب کے مراسم کی گہری چھاپ ہے۔مصحفی،میراورغالب سے دونوں ہی کی وابستگی اخیرعمر تک برقراررہی۔ان موضوعات پرنثاراحمد فارقی نے جو کچھ بھی لکھاہےان میں کافی اطلاعات قاضی صاحب کی فراہم کردہ ہیں۔نثاراحمد فاروقی قاضی صاحب کی علمیت اوران کی تحقیقی نظر کے قائل تھےاورقاضی صاحب بھی ان کی سچی لگن کے معترف تھے۔اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”آپ اُن چندنوجوانوں میں ہیں جن سے مجھے بڑی امیدیں ہیں، دنیاکےاورلوگ مثلاً آپ کے ایک رشتےدارکیا کرتے ہیں اس سے مجھے بحث نہیں اورنہ ان کی کسی حرکت سے، بہ شرطیکہ اس کااثر مجھ پرنہ ہو،مجھے رنج ہوتا ہے،لیکن آپ کی کسی نامناسب حرکت سے خواہ اس کامجھ پراثر ہویانہ ہومجھے تکلیف پہنچتی ہے“۔(۱)

قاضی صاحب کی ایک کتاب کی طباعت میں تاخیر کےسبب ان کے لہجے میں جو برہمی ہے اس کو بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے،لیکن ان کا یہ جملہ کہ”آپ ان چندنوجوانوں میں ہیں جن سے مجھے بڑی امیدیں ہیں“ محض طبیعت کی روانی میں نکلا ہوا جملہ نہیں واقعی قاضی صاحب ان کی طرف سے بہت پرامید رہتے تھے۔وہ نثاراحمد فاروقی کی تحریروں کابڑی باریک بینی سے مطالعہ کرتے اوربےٹوک اپنی رائے کااظہار کرتے تھے۔نثار احمد فاروقی کوبھی ان کی رائے کابڑی بےصبری سے انتظار رہتا تھا۔جومقامات قاضی صاحب کےنزدیک محل نظر ہوتے تھے وہ ان کی نشان دہی کرتے۔میرتقی میرؔ سے نثار احمد فاروقی کی ادبی دلچسپی کسی سے پوشیدہ نہیں ”میریات“ پران کا کام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔انھوں نے اپنےکسی مضمون میں لکھا کہ میر لفظ”انداز“ کو اسلوب کےمترادف کےطورپراستعمال کرتے تھے۔قاضی صاحب کو نثاراحمد فاروقی کی یہ تحقیق درست نہیں معلوم ہوئی توایک خط لکھ کراس کااظہاربھی کردیا۔وہ لکھتے ہیں:

> ”مجلس“(تازہ شمارہ،ص۱۰۶)میں آپ کا یہ خیال کہ میر نے لفظ”انداز“ = ”اسلوب“

استعمال کیا ہے، صحیح نہیں ہے۔ وہ اپنے اسلوب خاص کو انداز کہتے ہیں‘‘(۲)

رسالۂ پگڈنڈی میں نثار احمد فاروقی کا مضمون شائع ہوا تو قاضی صاحب کو اس میں چند باتیں محلِ نظر معلوم ہوئیں لیکن انھوں نے ساری باتوں کی طرف اشارہ نہ کر کے صرف املا کے متعلق ہدایات کیں، ممکن ہے آئندہ کسی خط میں اس مضمون کے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہو لیکن جو خطوط دستیاب ہیں ان میں پھر اس موضوع سے متعلق گفتگو نہیں ملتی۔ خط کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

’’آپ کے خط کے جواب میں ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اس کے بعد پگڈنڈی میں آپ کا مضمون دیکھا۔ آپ کو زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ بعض باتیں محلِ نظر ہیں۔ فی الحال صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ فرمایش اور اس قبیل کے الفاظ ’’ی‘‘ سے لکھے جاتے ہیں، انھیں ہمزہ سے لکھنا غلط محض ہے۔ نہ یہ ایران کا قدیم املا ہے نہ جدید‘‘(۳)

خط کے مضمون سے ظاہر ہے کہ قاضی صاحب اس مضمون کے متعلق اور گفتگو کرنا چاہتے تھے، نہ معلوم ان کو اس کا موقع ملا بھی یا نہیں۔ اگر وہ باتیں بھی سامنے آجاتیں تو یقیناً ہماری معلومات میں اضافے کا باعث ہوتیں۔ قاضی صاحب املا کے مسائل سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ صحیح املا پر زور دیتے تھے۔ رشید حسن خاں کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں املا کے مسائل پر زیادہ گفتگو ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ خود رشید حسن خاں کو اس موضوع سے غیر معمولی دلچسپی تھی جو بعد میں مستقل کتابی صورت میں ظاہر ہوئی اور یقینا انھوں نے قاضی صاحب سے ان مسائل پر تبادلۂ خیال کیا ہوگا۔ نثار احمد فاروقی کے نام خط میں لفظ ’’ہندوستان‘‘ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

’’اردوئے معلّٰی کے تبصرے کے بارے میں جو کچھ لکھ چکا ہوں اس پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اصل لفظ ’’ہندوستان‘‘ ہے اور ہندستان اس کا مخفف ہے جیسے ’’اگر‘‘ کا مخفف ’’گر‘‘ ہے۔ یہ املا کا سوال نہیں آپ جس طرح چاہیں لکھیں۔ میں خود ’’ہندوستان‘‘ لکھتا ہوں۔ آپ کے خط میں ’’کھوج‘‘ مونث استعمال ہوا ہے حالاں کہ یہ باتفاق مذکر ہے۔‘‘(۴)

لفظ ’’ہندوستان‘‘ کے سلسلے میں ان کی رائے رشید حسن خاں سے مختلف ہے۔ رشید حسن خاں اس لفظ کو بغیر ’’واو‘‘ کے لکھنے کو زیادہ درست مانتے ہیں۔

قاضی صاحب کو مخطوطات سے خاص دلچسپی تھی۔ اگر انھیں کوئی ایسی کتاب دکھائی دیتی جو ان کی دلچسپی کا مرکز ہو تو وہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک سرسری طور پر دیکھتے اور اس سے متعلق ایک تحریری یادداشت تیار کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیتے۔ انھوں نے بہت سے کتب خانوں کا اس طرح جائزہ لیا تھا۔ اپنے ایک مکتوب میں ذکر کیا ہے کہ ’’لکھنو یونی ورسٹی کے کتب خانے کو میں نے بہ غور دیکھا ہے اور وہاں کی اہم کتابوں کی ایک

یادداشت بھی میرے پاس موجود ہے۔‘‘ یہ یادداشتیں محض ان کے ذاتی استفادے کے لیے مخصوص نہیں تھیں بلکہ ان کی افادیت عام تھی۔ اگر کسی نے ایسی کتاب کے متعلق کچھ سوالات لکھے تو اس کے جواب کے ساتھ یہ بھی لکھ دیتے تھے کہ میرے پاس اس کتاب سے متعلق اپنی لکھی ہوئی ایک یادداشت موجود ہے، آپ چاہیں تو میں اسے مستعار بھیج سکتا ہوں۔ نثار احمد فاروقی پر تو ان کی شفقتیں اتنی تھیں کہ اگر انھیں کوئی مضمون درکار ہوتا اور قاضی صاحب کے پاس وہ مضمون نہ ہوتا تو وہ انھیں دوسرے ذرائع سے حاصل کر کے بھی بھیج دیتے تھے۔ یقیناً یہ ان کی اخلاقی بلندی اور کشادہ ظرفی کی مثال کہی جا سکتی ہے۔ نثار احمد فاروقی کو قاضی صاحب کا تحریر کردہ ایک مضمون ’’مصحفی و آتش‘‘ درکار تھا۔ اس کے حصول کا ایک ذریعہ قاضی صاحب تھے۔ انھوں نے قاضی صاحب سے ان کا یہ مضمون مانگا لیکن قاضی صاحب کو تلاش کے باوجود اپنا وہ مضمون نہ ملا تو لکھتے ہیں:

’’میں نے صدائے عام کا وہ شمارہ جس میں مصحفی و آتش شائع ہوا تھا، ڈھونڈھ نکالا لیکن دیکھتا ہوں تو اس میں سے یہ مضمون نکال لیا گیا ہے۔ میں نے خود ہی ایسا کیا ہوگا اور اس وقت بالکل یاد نہیں کہ کہاں رکھا ہے۔ تلاش سے نہ ملا تو صدائے عام کا وہ شمارہ کسی دوسری جگہ سے منگوا کر آپ کو بھیجوں گا۔‘‘(۵)

مذکورہ خط میں قاضی صاحب نے مضمون کے گم ہو جانے کا ذکر کیا ہے جو ان کے گھر سے باہر نہیں ہے۔ گھر میں کسی مضمون یا کتاب کا اس طرح گم ہو جانا جو باوجود تلاش بسیار کے نہ ملے، حیران کن بات معلوم ہوتی ہے۔ مضامین ہی نہیں ان کے پاس آنے والے خطوط بھی اکثر گم ہو جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے بعض خطوط میں لکھا ہے کہ ’’آپ کا خط ملا تھا لیکن جواب لکھنے کے لیے ڈھونڈھتا ہوں تو نہیں ملتا براہ مہربانی اپنے سوالات دوبارہ تحریر کریں۔‘‘ لیکن میری حیرت کا تدارک مختار الدین احمد کے ایک مضمون ’’قاضی عبدالودود‘‘ سے ہوا جس میں انھوں نے قاضی صاحب کے کمرے کا حال بیان کیا ہے:

’’جاڑے کا زمانہ تھا۔ وہ ایک بڑے کمرے میں مسہری پر نیلے رنگ کی ڈریسنگ گون پہنے لیٹے تھے۔ کمرے کی الماریاں کتابوں کے بوجھ سے جھکی پڑی تھیں۔ میز پر، دریچے پر، قالین پر، کرسیوں پر تمام کتابیں ہی کتابیں دکھائی دیتی تھیں۔ اخبارات اور رسائل بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ جس مسہری پر وہ لیٹے تھے اس پر اس دن کا ’’اسٹیٹسمین‘‘ ’’انڈین نیشن‘‘ کچھ اور رسالے اور کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کمرے میں کئی سوٹ کیس رکھے تھے۔ کوئی کھلا ہوا اور کسی کے پٹ آدھے کھلے آدھے بند تھے، کتابیں اور کاغذات وہاں سے بھی جھانک رہے تھے۔ قریب کی ایک تپائی پر گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی کی ایک جلد، SWAN کی ایک پرانی دوات جس میں کسی زمانے میں اصلی روشنائی ہوگی اور ایک پرانا فاونٹین پن رکھا ہوا تھا۔

فاونٹین پن تو یہ پہلے رہا ہوگا، اب تو اسے معمولی ہولڈر کی جگہ استعمال کیا جارہا تھا۔ نب پر مختلف قسم کی سیاہیوں کی اتنی دبیز تہ جم گئی تھی کہ اس سے سیدھے طور پر لکھنا ناممکن تھا اس لیے انھیں نب کو پلٹ کر لکھنا پڑتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کی گفتگو کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ ان کے ذہن اور دماغ کو کتابوں کی بے ترتیبی اور کاغذات کے انتشار سے دور کا بھی تعلق نہیں۔''(٦)

کتابوں، رسائل اور فائلوں کی اس بھول بھلیاں میں کسی مضمون یا خط کا گم ہو جانا معمولی ہے اور اس کا ملنا بخت رسا کا مرہون منت سمجھنا چاہیے۔ مذکورہ خط کی ایک تحقیقی اہمیت یہ بھی ہے کہ قاضی صاحب نے جس مضمون کا ذکر کیا ہے ان کے مجموعہ مضامین اس سے خالی ہیں اور ان کے مقالات کی جو فہرستیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں بھی یہ مجھے نظر نہیں آیا۔

قاضی صاحب بہت تحقیق کے بعد ہی کسی مسئلے پر قلم اٹھاتے تھے۔ بغیر تحقیق قلم کو ہاتھ لگانا ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ تحقیق کے بعد جب وہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتے تھے تو اس کے اظہار میں بڑی بے باکی سے کام لیتے تھے۔ وہ خلاف واقعہ کسی کے بیان کو پسند نہیں کرتے تھے اور حقیقت کو ظاہر کرنا اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ ان کا تحقیقی منشور اگر کچھ تھا تو صرف راست گوئی۔ اشتر وسوزن کے پیش گفتار میں انھوں نے اپنے مسلک کو بڑی صفائی کے ساتھ واضح کر دیا ہے۔

''وولتیر کا قول ہے کہ وہ لوگ جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں ہم پر حق رکھتے ہیں تو صرف یہ کہ ہم ان کے متعلق راست گوئی سے کام لیں۔ اس پر یہ اضافہ کرنا چاہیے کہ زندوں کا حق بھی ہم پر اس سے زیادہ نہیں۔''

یہ جملے صرف روانی قلم کا نتیجہ نہیں، ان کی ہر تحریر سے اس کا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اس بیان پر عمل پیرا اور ثابت قدم تھے۔ انھوں نے جانب دارانہ یا معاندانہ جذبات کے زیر اثر قلم کو حرکت نہیں دی اور حقیقت سے پرے کسی بیان کی تصدیق نہیں کی۔ حقیقت کے اظہار میں انھیں اس بات کی مطلق فکر نہ ہوتی تھی کہ دوسرا ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی زیادہ سروکار نہیں رکھتے تھے۔ ظاہر ہے اس بات کو ہر ایک پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا اور مخالفانہ جذبات سے متاثر ہو کر مضمون نگاری کی مذموم روایت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اکثر محققین جو دوسروں کو سچ کہنے کی اور سچ سننے کی تلقین کرتے ہیں اپنی مخالفت میں ایک حرف بھی سننا پسند نہیں کرتے، لیکن یہ قاضی صاحب کی اولوالعزمی ہی کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے متعلق بے باک رائے کا اظہار کرتے تھے اپنے متعلق بھی اس طرح کے بیانات سننے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ قاضی صاحب کے مخالفین نے جو مضامین ان کی مخالفت میں تحریر کیے انھوں نے اس کا جواب دینا غیر مناسب سمجھا۔ قاضی صاحب کے ارد گرد طلبہ کا اچھا خاصا حلقہ رہتا تھا، ان کے ہلکے سے اشارے پر جواب

الجواب کا سلسلہ قائم ہو سکتا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے شاگردوں اور رفقا کو ان معاملات سے دور رکھا۔ اس بیان کی دلیل میں یہ اقتباس پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مضمون میں نے نہیں دیکھا لیکن سید حسن عسکری نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر رفیق احمد نے میری کسی تحریر کے متعلق ان کے لفظ میں ''قلم فرسائی'' کی ہے۔ میں ان سے واقف ہوں اور مطلق مجھے یہ جاننے کی فکر نہیں کہ انھوں نے کیا لکھا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ انھوں نے احتشام حسین کو خوش کرنے کے لیے ''قلم فرسائی'' کی ہے۔ اس کی انھیں ضرورت ہوگی اور اس کی صورت یوں نکل آئی کہ 'تحریک' میں میرے اور ان کے اسلوب کا مقابلہ کیا گیا تھا، اس کا مجھ سے دور کا تعلق بھی نہ تھا، مگر پیدا کر لینے میں کون سی دشواری ہے۔ آپ جواب چاہیں لکھیں میں نے آپ سے اس کی تحریک نہیں کی۔ آپ از خود اس کے تعلق سے لکھنا چاہتے ہیں تو میں مانع نہ ہوں گا۔''(٧)

جس طرح وہ اپنی تحریر کو ادب اور تحقیق کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیتے تھے اسی طرح وہ نثار احمد فاروقی سے بھی یہی توقع کرتے تھے اور ان کو اس کی تلقین بھی کی ہے:

''میرا مشورہ یہ ہے کہ کسی سے تعلقات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں اس کے بارے میں لکھتے وقت طبیعت پر قابو رکھیے اور علمی معاملات میں عصبیت سے مطلق کام نہ لیجیے۔ اگر آپ ایسا نہ کر سکے تو اس سے آپ کو نقصان پہنچے گا دوسروں کو نہیں۔''(٨)

قاضی صاحب نثار احمد فاروقی میں اردو ادب کا مستقبل تلاش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ ان کی ہر تحریر کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتے تھے۔ بعض جگہوں پر انھوں نے نثار احمد فاروقی کو ایسے قیمتی مشورے دیے ہیں جو آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ کسی متن یا رسالے کی ترتیب میں حوالہ جات کا اہم کردار ہوتا ہے۔ ایک ذمہ دار مرتب سے اس کی امید کی جاتی ہے کہ وہ کسی حوالے کو پوشیدہ نہ رکھے بلکہ پوری ایمان داری سے اس کی وضاحت کرے۔ اس سے جہاں مرتب کی احتیاط پر حرف آتا ہے وہیں بعض گمراہیوں کو بھی راستہ مل جاتا ہے۔ نثار احمد فاروقی نے 'دہلی کالج میگزین' کا میر نمبر شائع کیا جس کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی، یہ رسالہ آج بھی میر شناسی میں بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے اس رسالے کے تعلق سے جس بات کی طرف نثار احمد فاروقی کی توجہ مرکوز کرائی ہے وہ یقیناً بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ لکھتے ہیں:

''دہلی کالج میگزین کا مخصوص نمبر ملا شکریہ، میں مستقل اپنی رائے آئندہ ظاہر کروں گا۔ اس وقت صرف اس قدر لکھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے کئی مضامین چھپے ہوئے، کتابوں یا دوسرے رسالوں سے لیے ہیں اور اس کا اعتراف نہیں کیا، (یہ یاد نہیں کہ اثر صاحب کو مضمون کے بارے میں آپ نے یہ بتایا ہے یا نہیں کہ ان کی کتاب سے لیا گیا ہے) اس سے ناواقف لوگ سمجھیں گے کہ سب

کچھ آپ کا فراہم کردہ ہے۔"(۹)

قاضی صاحب نے کسی موضوع پر مستقل کوئی کتاب تو قلم بند نہیں کی لیکن ان کے تحقیقی مضامین ہی بڑی بڑی کتابوں کا بھرم توڑنے کے لیے کافی تھے۔ یقیناً آج اردو تحقیق کو جو پایہ اعتبار حاصل ہے اس میں قاضی صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ وہ صرف پائے کے محقق ہی نہیں بلکہ تنقیدی بصیرت کے بھی مالک تھے۔ ان کی تنقید میں ذاتیات، بدگوئی، عصبیت اور ہٹ دھرمی کا کوئی شائبہ نہیں۔ وہ شخصیت کو مختلف پہلوؤں سے دیکھنے کے عادی تھے جس سے ایک پہلو کی کمزوری دوسرے پہلو پر اثر انداز نہیں ہوتی مثلاً غالب کو بہ حیثیت محقق ایک چھوٹا انسان سمجھتے ہیں لیکن وہ غالب کی شاعرانہ عظمت کا دل سے اقرار کرتے ہیں اور غالب شناسوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ محمد حسین آزاد کو بھی بحیثیت محقق تسلیم نہیں کرتے لیکن ان کی انشا پردازی کے معترف ہیں۔ شادؔ عظیم آبادی سے متعلق ان کی رائے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے۔"کہ شاد کی تحریروں میں حقیقت بہ قدر نمک ہوتی ہے۔" لیکن شاد کی شاعری کے وہ قائل تھے۔ اپنے تبصرے"شاد کی کہانی شاد کی زبانی" کی ابتدا یہاں سے کرتے ہیں:

"یہ پوچھا جائے کہ صوبہ بہار کا سب سے بڑا اردو گو شاعر کون ہے، تو کچھ لوگ راسخؔ کا نام لیں گے، لیکن تعجب نہیں اگر اکثریت شادؔ کے حق میں رایے دیں، ان کا شمار ہندوستان کے ممتاز غزل گویوں میں ہے۔"

وہ ہمیشہ علمی اختلاف کے قائل رہے۔ مصنف کی صرف انھیں کوتاہیوں کی نشان دہی کرتے تھے جس میں ان کو حقیقت کے علی الرغم کچھ دکھائی دیتا تھا، اس فعل میں کسی قسم کی ہٹ دھرمی کو دخل نہیں تھا بلکہ یہ اعلان عام تھا کہ اگر کسی نے ان باتوں کو غلط ثابت کر دیا تو میں اپنی بات کو واپس لے لوں، گا اس میں کسی قسم کی جرح نہ ہوگی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب انھیں کوئی لغزش نظر آجاتی ہے تو وہ اس پر سخت الفاظ میں تنقید کرتے تھے۔ اس موقع پر کسی قسم کی رعایت اور رواداری سے کام نہیں لیتے تھے۔ فرہنگ آصفیہ اور تذکرۂ سرور کے تبصرے اس کی نظیر ہیں۔ اس طرح ان کی تنقید تخریبی نہیں بلکہ تعمیری کہی جا سکتی ہے۔ وہ صرف معائب پر ہی نظر نہیں رکھتے محاسن پر بھی ان کی نظر رہتی ہے۔ لیکن چوں کہ وہ توصیفی یا تاثراتی مضامین لکھنے کے عادی نہیں تھے بلکہ ان کا نصب العین ادب کو اغلاط سے پاک کرنا تھا، اس لیے ان کا زیادہ سروکار اغلاط سے ہی رہتا تھا۔ جس طرح جسم کا بیمار حصہ ہی طبیب کے معائنے کا مرکز ہوتا ہے، صحت مند حصے سے اس کو چنداں سروکار نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ خواہ اس کو خوردہ گیری سمجھیں لیکن حقیقت میں یہی اغلاط شماری اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس سے متن زیادہ صحت مند ہو کر قاری تک پہنچا۔ وہ ادب کو زیادہ سے زیادہ اغلاط سے مبّرا دیکھنا چاہتے تھے، اسی وجہ سے جہاں وہ قدیم متن کی تصحیح پر زور دیتے تھے وہیں نئی کتابوں پر بھی تحقیقی تبصرے لکھتے تھے۔ ان کے اس عمل سے تصنیف، تالیف اور ترتیب کا کام کرنے والے حضرات پہلے سے زیادہ محتاط رہنے لگے۔ بقول سید حسن

عسکری ایک مرتبہ امتیاز علی عرشی نے ان سے کہا کہ"میں صرف ایک شخص سے ڈرتا ہوں اور وہ یہی آپ کے قاضی صاحب ہیں" قاضی صاحب اسی روایت کو نئی نسل میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ وہ طلبا کی ہر ممکن مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ان کے استفسار کا بڑی فراخ دلی سے جواب دیتے تھے۔ تا کہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں اور تحقیق کی روایت جس کے وہ امین تھے ان کی ذات پر منتہی نہ ہو۔

ایک خط میں نثار احمد فاروقی کی تقرری پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن نثار احمد فاروقی کی شادی کی خبر ملنے پر جو خط لکھا ہے وہ خاص توجہ کا طلب گار ہے جس میں ان کی قلبی وابستگی کا نسبتاً زیادہ اظہار ہوا ہے، لکھتے ہیں:

"شادی کی مبارک باد عابدی صاحب نے میری طرف سے دی ہوگی۔ آپ نے مجھے اطلاع تک نہ دی، نہ شریک ہوسکتا تو مبارک بادی کا تار تو بھیج ہی سکتا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے ہوتا ہی کیا، مگر دنیا میں بہت سے بے کار کام انسان کرتا ہے۔"(۱۰)

قاضی عبدالودود کے خطوط علمی اور تحقیقی اعتبار سے ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط میں ذاتی گفتگو نہ ہونے کے برابر ہے، زیادہ تر علمی استفسارات کے جواب ہیں یا کوئی علمی مسئلہ موضوع گفتگو ہے۔ ان خطوط کا یکسوئی اور باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ خطوط عام توجہ کا مرکز نہیں ہو سکتے، ادب کے قارئین جن کو تحقیق سے سروکار ہو ان کے لیے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حواشی:

۱۔ مکاتیب قاضی عبدالودود، ص ۴۸۴ مرتبہ محضر رضا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۶ء
۲۔ ایضاً، ص ۴۶۸
۳۔ ایضاً، ص ۴۵۷
۴۔ ایضاً، ص ۴۶۱
۵۔ ایضاً، ص ۴۴۶
۶۔ یادگارنامی قاضی عبدالودود، ص ۳۰ مرتبین نذیر احمد/مختارالدین احمد/شریف حسین قاسمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۲۰۰۰ء
۷۔ مکاتیب قاضی عبدالودود، ص ۵۰۱
۸۔ ایضاً، ص ۴۶۳
۹۔ ایضاً، ص ۸۵۔۴۸۴
۱۰۔ ایضاً، ص ۵۰۰

☆☆☆☆☆

Dr. Mahzar Raza
161/ 21 First Floor, Jogabai Main Road,
Jamia Nagar, New Delhi -110025,
Mob. 09910907110, 09717392516,
E-Mail: rizvi.mahzar@gmail.com

سرودیش وِرتّانت سَنگرہ

(اکبر نامہ کا سنسکرت ترجمہ)

راجیش سرکار

عالمی ادب میں فارسی تاریخوں کے سنسکرت تراجم غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں لیکن بد قسمتی سے علم وادب کا یہ پرروشن باب موجودہ دور تک مکمل نہیں ہوسکا ہے۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ایک طویل مدت تک دونوں ہی جماعت کے زبان شاس ایک دوسرے سے دور رہے ہیں۔اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں بھی داخل ہوئیں لیکن فارسی زبان کو یہاں کی قومی زبان ہونے کا رتبہ بھی حاصل ہوا۔اسی طرح دارالسلطنت دہلی اور مغلیہ عہد میں ایک بڑی تعداد میں سنسکرت کتابیں فارسی زبان میں منتقل ہوئیں جن میں رامائن، مہابھارت، پنچ تنتر، اوپنیشد، لیلاوتی، راج ترنگی، اتھرو وید، تاجک نیل کنٹھی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں سنسکرت کی سیکڑوں کتابیں فارسی میں منتقل کی گئیں وہیں فارسی کتابوں کے سنسکرت تراجم بھی ہوئے ہوں، اس سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔ہاں عباسی خلفا کے دور میں ابوریحان بیرونی کے ذریعے بہت سی سنسکرت کتابیں عربی زبان میں منتقل ہوئیں لیکن فارسی کے حوالے سے ایسی بات سننے کو نہیں ملتی۔سنسکرت کے فارسی تراجم کا حال بیان کرنا بہت دشوار کام نہیں ہے لیکن فارسی کے سنسکرت تراجم کا حال بیان کرنا سمندر سے موتی نکالنے کے مترادف ہے۔سنسکرت کی وہ پہلی کتاب کون سی تھی جسے فارسی کا جامہ پہنایا گیا؟ اس سلسلے میں ابوالفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں کچھ اطلاعات فراہم کی ہیں لیکن اس کے طرز بیان نے اسے سلجھانے کے بجائے اور بھی الجھا دیا ہے۔آئین اکبری کے پہلے باب کے آئین چونتیس میں ابوالفضل نے فن تحریر اور فن مصوری کے عنوان سے دربار اکبری میں کیے گئے تراجم پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اس نے ترجمہ شدہ کتاب کا نام زِج جدید میرزائی اور مترجم کا نام گنگا دھر قلمبند کیا ہے۔یہ گنگا دھر اس کتاب کا مترجم تھا یا اس کی زیرنگرانی وہ ترجمہ کیا گیا تھا اس سلسلے میں بات بہت واضح نہیں ہوتی۔حالانکہ یہ کتاب ابھی تک فراہم نہیں ہوسکی ہے۔(آئین اکبری انگریزی ترجمہ،ص 110)

ویسے تو دربار اکبری میں درجن بھر سے زائد کتابیں شہنشاہ اکبر کے ذوق وشوق اور اس کے حکم سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں لیکن وہ کتاب جسے فارسی سے سنسکرت میں منتقل ہونے کا افتخار حاصل ہوا وہ ابوالفضل کی

اکبر نامہ ہے جسے سنسکرت میں دو ناموں سے جانا جاتا ہے، ایک تو اکبر نامہ اور دوسرے سرودیش ورتّانت سنگرہ۔

اکبر کے ذوق وشوق اور سنسکرت سے دلچسپی کی ترجمانی کرنے والی جن کتابوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں ان میں سرودیش وِرتّانت سنگرہ کا نام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔یہ ترجمہ اکبر کے حکم سے متھلا کے عظیم فلسفی اور عالم پنڈت مہیش ٹھکّر کے ذریعے وجود میں آیا۔یہ کتاب ان کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ابوالفضل کے اکبر نامے کے پہلے باب کا مختصراً ترجمہ ہے اور یہ بھی صرف چھتیسویں فصل تک ہی ہے۔یہ ترجمہ کب اور کس وقت ہوا اس کا بین ثبوت نہیں ملتا۔مصنف خود لکھتا ہے کہ اکبر کے چونتیسویں یوم تخت نشینی کے موقع پر واقعات بابری کا فارسی ترجمہ مرزا خان رحیم نے بادشاہ اکبر کی خدمت میں پیش کیا۔اس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ عبدالرحیم خان خاناں نے ترکی زبان کی اس کتاب کا فارسی ترجمہ 997ھ میں اکبر کے سامنے پیش کیا اور یہ 997ھ/ 10 نومبر 1588ء کو شروع ہوا۔اس طرح اس کی تصنیف کا ابتدائی دور نومبر 1588ء کے بعد اور انتہائی دور 1601ء ہے، جب اکبر نامہ مکمل طور پر وجود میں آچکی تھی۔جب کہ اس کے پہلے باب جس کا ترجمہ مہیش ٹھکّر نے کیا ہے طے شدہ طور پر اس سے قبل (1445ء) کی تصنیف ہے۔غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ 1588 سے 1595ء کے درمیان کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ اس زمانے کی تمام تاریخی کتابوں جیسے اکبر نامہ، آئین اکبری، منتخب التواریخ، طبقات اکبری، ماٰثر رحیمی اور تزک جہانگیری وغیرہ میں مہیش ٹھکر کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن عہد وسطی کے فلسفے اور متھلا کی علاقائی تاریخوں میں پنڈت مہیش ٹھکر کا ذکر تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔جس کے مطابق انھیں دربار اکبری میں بڑی عزت ومکرمت حاصل تھی۔صوبۂ بہار میں بادشاہ نے اپنے عزیز عالم کے لیے الگ سے متھلا راج قائم کیا تھا۔بادشاہ نے حاجی پور سے ترہُت کو جدا کرکے اس کا گورنر مہیش ٹھکر کو بنایا تھا۔فلسفۂ گوتم بدھ کے معروف عالم پکش دھر مِشر نے اپنی ایک کتاب میں ٹھکر کا ذکر کیا ہے اور اس کے والدین کا نام دھیرا اور چند بتایا ہے۔

سرودیش وِرتّانت سنگرہ کے مخطوطات

اس تصنیف کے پہلے مرتب سُبھد رجھا نے دیباچہ لکھتے ہوئے جن مخطوطات کی بنیاد پر اس کتاب کو ترتیب دیا ہے ان کا بیان کیا ہے۔ان کے مطابق دنیا میں اس کے صرف دو مخطوطے ہی حاصل ہوسکے ہیں۔

لندن: ان کی اطلاع کے مطابق اس تصنیف کا ایک مخطوطہ لندن کامن ریلیشن لائبریری کے Mackenzic Collection میں موجود ہے۔(Mss. No. 2775, Edde. Cat. Sanskrit Mss. Part 7, 1904. 1573 No. 4106) اس نسخے پر ایک مہر بھی لگی ہے جو دسمبر 1833 پڑھی جاتی ہے۔اس نسخے میں 228 صفحات ہیں اور یہ کامل ہے۔

کلکتہ: اس کا دوسرا نسخہ گورنمنٹ سنسکرت کالج کے کتب خانے میں دستیاب ہے۔یہ نامکمل ہے جس

میں صرف 68 صفحات ہی ہیں ۔قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ لندن کے نسخے کی کاپی ہے ۔اس کتاب کے تین نام چلن میں ملتے ہیں جس میں اکبر چرِتم نام کا استعمال ہندی کے مشہور ادیب چند دھر شرما گلیری نے وہم کی وجہ سے کیا ہے ۔ دیگر دو ناموں میں سے اکبر نامہ اور سرو دیش وِرتّانت سنگرہ میں سے دوسرا عنوان زیادہ درست معلوم ہوتا ہے ۔مرتب کی اطلاع کے مطابق لندن والے نسخے کی پشپکا میں اس کا عنوان سرو دیش وِرتّانت سنگرہ درج ہے ۔

سرو دیش وِرتّانت سنگرہ کے دستیاب ہونے کی اپنی ایک دلچسپ تاریخ ہے ۔تصنیف کے بعد سے تقریباً پونے تین سو سال تک یہ گرانمایہ کتاب اہل سنسکرت سے پوشیدہ رہی ۔گزشتہ صدی کی آخری دہائی میں مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں، دارالعلوم اور کتب خانوں میں محفوظ قلمی کتابوں کی ایک فہرست تھیوڈور آفریکٹ نے شائع کی ۔(Catalogus Catalogrum, Vol. 1, P- 7016 By Theodar) اس کے بعد اس کا مختصر ذکر وِنسنٹ اِسمتھ نے اکبر سے متعلق اپنی معروف کتاب میں کیا ہے ۔لیکن گفتگو آگے نہ بڑھ سکی ۔آفریکٹ کی بنیاد پر New Catlogus Catlogorus میں بھی اس کا ذکر ہے ۔لیکن اس سے پہلے ہی 1928ء میں ہندی وِشوکوش نے اس کا اور اس کے مصنف کا ذکر کر دیا تھا ۔اس کے بعد اس پر کوئی بھی گفتگو نہیں ہوئی ۔اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے گفتگو پنڈت چندر دھر شرما گُلیری نے کی تھی ۔انھوں نے بنارس سے شائع ہونے والے رسالے ناگری پرچارنی پتّرِیکا (رسالہ) میں سنسکرت میں اکبر کا جیون چرِتر کے عنوان سے شائع ہوئے اپنے ایک مقالے میں کتاب اور مصنف کا ذکر کیا ہے ۔اس تعارفی مقالے میں انھوں نے کتاب کا نام اکبر چرِتم لکھا ہے اور بتایا ہے کہ اس عہد کے حاکم دربھنگہ ریاست سر کامیشور سنگھ نے کتاب کا ایک نسخہ مائیکروفیلم کے ذریعے لندن سے منگایا ہے جسے مشہور ہند شناس ڈاکٹر سر گنگا ناتھ جھا نے ترتیب دیا اور اسے شائع کرنے کی سعی و کوشش میں مصروف تھے لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر ان کے عہد میں یہ کتاب شائع نہ ہوسکی ۔چندر دھر شرما گلیری نے اپنے مقالے کے ذریعے ہندی داں طبقے کو اس کتاب سے روشناس کرایا ۔ اسی طرح ڈاکٹر امر ناتھ جھا نے اپنے مقالے کے ذریعے انگریزی داں طبقے کو اس سے واقفیت دلائی ۔

سرو دیش وِرتّانت سنگرہ کی موجودہ ترتیب و اشاعت

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ یہ کتاب گنگا ناتھ جھا اور امر ناتھ جھا دونوں ہی کی کوششوں کے باوجود شائع نہ ہوسکی تھی بلکہ ان کے تقریباً پچاس سال بعد مشہور و معروف ہند شناس اور محقق ڈاکٹر سُبھدر جھا نے دربھنگہ ریاست کے شاہی کتب خانے اور کلکتہ یونیورسٹی میں موجود دونوں نسخوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ۔لیکن اس نایاب کتاب کو علمی حلقوں سے مکمل طور پر روشناس کرانے کا سہرا نوجوان محقق ڈاکٹر پرتاپ مشرجی کے سر گیا ۔ان کا آبائی وطن متھلا ہے جو کہ ماضی میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہ چکا ہے ۔لیکن بنارس میں قیام پذیر ہیں ۔آپ بنارس میں ”اکھل بھارتیہ مسلم سنسکرت پراچیہ سودھ سنستھان“ کے بنیاد گزار اور نگراں بھی ہیں ۔ساتھ ہی مسلمان اور سنسکرت کے

موضوع پر نہایت ایمانداری سے تحقیق میں مصروف ہیں ۔

اس طرح ڈاکٹر پرتاپ مشرجی کو یہ کتاب ریاست دربھنگہ کے کتب خانے میں حاصل ہوئی ۔ان کی اطلاع کے مطابق ان کے ایک عزیز دوست ڈاکٹر پُشکر آنند جو کہ ملکۂ ریاست دربھنگہ کے حکم سے کچھ دنوں کے لیے ان کی کسی عزیز خاتون کو سنسکرت کی درس و تدریس کے لیے مقرر تھے ۔انھیں کی سعی و کوشش سے یہ کتاب شاہی محل سے مطبوعہ صورت میں فراہم ہوئی ۔

سرو دیش وِرتّانت سنگرہ کی اشاعت ڈاکٹر سُبھدر جھا کی زیر نگرانی ریاستِ دربھنگہ کے حاکم آخر جناب مہاراج ڈاکٹر سر کامیشور سنگھ کے زیر اہتمام قائم کی گئی ایک علمی و فرہنگی انجمن ”میتھلی بھاشا یوم اِتہاس پرکاشن نِدھی“ کے مالی تعاون سے یونیورسٹی پریس پٹنہ یونیورسٹی سے شائع ہوئی ۔لیکن اس کے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ طابع اور ناشر کے درمیان قیمت کو لے کر تنازع پیدا ہوگیا ۔چنانچہ طابع نے تمام نسخے کوڑے میں پھینکوا دیے ۔معروف مورخ ہیتھو کر جھا کو جب یہ خبر ہوئی تو ان کے ایما پر ڈاکٹر پرتاپ مشرا نے اس دوکان سے ایک کاپی حاصل کی اور آج وہی نسخہ موجود اور رائج ہے ۔

سرو دیش وِرتّانت سنگرہ کے پوری دنیا میں دستیاب دو نسخوں کی بنیاد پر یہ پہلی ترتیب تھی جسے ڈاکٹر سبھدر جھا نے تیار کیا تھا ۔دیباچے کی اطلاع کے مطابق اس کے صفحات درست نہ تھے جسے آپ نے بڑی محنت و مشقت سے درست کیا ۔ساتھ ہی اٹھارہ صفحے کی ایک مکمل تاریخ بھی لکھی ہے جو اس کتاب کو سمجھنے میں معاون ہے ۔

چونکہ اس کتاب میں چھتیس باب ہیں اس لیے تمام ابواب کے موضوعات کو فہرست میں بیان کیا گیا ہے ۔اس کتاب کے آخر میں دو فہرست دی گئی ہے، جن میں کتاب میں موجود تاریخی ناموں کو الفبائی ترتیب کے مطابق درج کیا گیا ہے ۔ چھ صفحات پر مشتمل دوسری فہرست میں غیر سنسکرت الفاظ کو مع صفحات بیان کیا گیا ہے ۔اصل نسخے کی غلطیوں کو ویسے ہی رہنے دیا گیا ہے ۔ترتیب دیتے وقت ڈاکٹر سبھدر جھا جی کو کئی غلطیاں نظر آئیں جن کے لیے کتاب کے آخر میں دو صفحے کا غلطنامہ بھی لگایا گیا ہے ۔اس کے باوجود کئی اغلاط رہ گئی تھیں جنھیں ڈاکٹر پرتاپ مشرجی نے بڑی لگن سے دوبارہ اصلاح کر کے ترتیب دیا ۔

قابل غور بات یہ ہے کہ پنڈت مہیش ٹھکّر نے ترجمے کے وقت اکبر نامہ کی کئی غیر ضروری باتوں کو چھوڑ دیا ہے، لیکن اس کے بغور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکبر نامہ کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے ۔سرو دیش وِرتّانت سنگرہ کا آئین اکبری کے انگریزی ترجمے سے تقابلی مطالعے سے بھی بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں ۔

مغربی طرز پر لکھی گئی تاریخوں کی بات کی جائے تو جہاں تک مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کلھن کی ”ترنگی“ کے بعد دوسری تصنیف ہونا چاہیے اور اگر فارسی سے سنسکرت میں ترجمے اور مسلمانوں کے عہد کی بات کی جائے تو شاید ابھی تک یہ پہلی اور آخری کتاب ہے جس کو منظر عام پر لانے کی پہلی کوشش ڈاکٹر سبھدر جھا نے کی تھی اور

اسے ڈاکٹر پرتاپ مشرا نے عام لوگوں سے روشناس کرایا۔

سرودیش ورِتّانت سنگرہ کی سنسکرت ادب میں دریابی سے اس کی اہمیت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر پرتاپ مشرا اور ''اکھل بھارتیہ مسلم پراچیہ شودھ سنستھان'' نگواں، بنارس کی مہتمم ڈاکٹر پانڈے صاحبہ نے ڈاکٹر سبھدر کی کوششوں کو بہت سراہا ہے۔ اس طرح کے کاموں سے محققین اور دانشمندوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

Dr. Rajesh Sarkar
Assistant Prof. Dept. of Sanskrit,
B.H.U. Varanasi-221005,
Mob. 08853688609, 07348067704
E-mail: sarkar.bhu09@gmail.com

سعید نفیسی کی کہانی اذان مغرب (فارسی) کا خلاصہ

دربند ایران کا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ اسّی سال پہلے مغرب نے اس پر قبضہ کرکے اسے ایران سے الگ کر دیا تھا۔ جب سے مغرب نے اس پر قبضہ کیا ہے یہاں کے گرجا گھر آباد ہیں اور مسجدیں ویران ہوگئی ہیں۔ ستر سال کے ایک بوڑھے علی قلی (موچی) کو اذان کی آواز سے حد درجہ عشق تھا، اس لیے اس نے مسجد خان کے پاس اپنا گھر بنالیا تھا تاکہ اذان کی آواز سنتا رہے مگر اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوئی۔

ایک دن ملا رجب علی مکتب دار دیلمقانی اپنے چچا زاد کا ترکہ وصول کرنے کے لیے دربند آیا اور علی قلی کی دوکان پر اپنی ٹوٹی ہوئی جوتیاں سلنے کو دیں۔ علی قلی نے اس سے پہلا سوال یہ کیا کہ کیا تم اذان دے سکتے ہو؟ اس نے کہا کہ ضرور دے سکتا ہوں یہ سن کر اس کو بہت خوشی ہوئی اور دو اشرفیوں کی ایک تھیلی جو اس کی نانی نے اس کی ماں کو شادی کے وقت دی تھی، وہ دونوں اشرفیاں بلاکر رجب علی کو نذرانے کے طور پر پیش کر دیں اور کہا کہ آج مغرب کے وقت مسجد خان کے مینار سے اذان کی آواز بلند کرو۔ اسی آواز کو سننے کے لیے میری روح اٹکی ہوئی ہے۔

مغرب کا وقت ہوا، ملا رجب علی مسجد خان کے مینار پر پہنچا اور اللہ اکبر اللہ اکبر کی آواز بلند کی۔ جیسے ہی اذان ختم ہوئی علی قلی کی روح جسم سے پرواز کرگئی۔ لوگوں نے بلدیہ کے خرچ سے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا کیونکہ وہ دونوں اشرفیاں جو اس نے اپنے کفن کے لیے محفوظ رکھی تھیں ملا رجب علی کو دے چکا تھا۔

اذان مغرب کے ذریعے سعید نفیسی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مغرب ہمیشہ اسلام کا دشمن رہا ہے چنانچہ جب سے مغرب نے دربند پر قبضہ کیا ہے یہاں کے گرجا گھر آباد ہیں اور مسجدیں ویران ہیں۔ اب مسجد کے مینار سے اذان کی آواز بلند نہیں ہوتی۔ مغرب اہل ایمان کا امتحان لے رہا ہے۔ اُسے خوب معلوم ہے کہ مومن کو مسجد سے وہی نسبت ہے جو مچھلی کو پانی سے ہوا کرتی ہے۔ (خلاصہ از مولانا ارشاد حسین)

☆☆☆☆☆

تاریخِ افواجِ بھوپال المعروف بہ تاریخ سلطانیہ انفنٹری (قلمی)
ایک تعارف

انوار صمدانی امروہوی

کسی بھی قوم کی بقا اس کے علمی آثار میں پنہاں ہوتی ہے، انھیں علمی آثار میں ایک تاریخِ افواجِ بھوپال المعروف بہ تاریخ سلطانیہ انفنٹری بھی ہے۔ قبل اس کے کہ زیر تذکرہ تاریخ پر خامہ سرائی کی جائے مناسب ہوگا کہ مولف تاریخ افواج بھوپال کے کچھ احوال قارئین کے سامنے پیش کر دیے جائیں۔

اس تاریخی مخطوطے کے تخلیق کار، بھوپال کے مشہور و معروف مصنف علامہ ملا رموزی ہیں جنھوں نے اردو ادب میں ایک نئے اسلوب و نگارش کی بنا ڈالی اور علمی دنیا میں اپنا لوہا منوایا نیز موصوف نے تحریک گلابی اردو سے بھوپال کا ادبی ماحول بھی گلابی کر دیا۔

ملا رموزی کا پورا نام محمد صدیق تھا۔ آپ کے والد کا اسم گرامی عنایت اللہ خاں المعروف بہ محمد صالح تھا۔ (یہ بات آپ کے عزیز رفعت رموزی صاحب نے فون پر مجھے بتلائی تھی) ملا رموزی کی پیدائش شہر بھوپال کے چھاؤنی ولایتیان میں ۲۱ر مئی ۱۸۹۶ء کو ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھوپال ہی میں حاصل کی۔ ڈاکٹر محمد نعمان خاں بھوپالی (دہلی) فرماتے ہیں:

> ''ملا رموزی ۲۱ مئی ۱۸۹۶ء مطابق ۷ر ذی الحجہ ۱۳۱۳ھ کو بھوپال میں پیدا ہوئے، یہیں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر کانپور کی مشہور علمی درس گاہ دارالعلوم الٰہیہ سے فاضل الٰہیات کی اعزازی سند حاصل کی۔ ملا صاحب کے اساتذہ میں مولانا حسرت موہانی (م:۱۹۵۱ء) عبدالحلیم شرر صدیقی (م:۱۹۲۶ء) علامہ آزاد سبحانی اور علامہ محوی صدیقی کے نام شامل ہیں۔'' (بھوپال میں اردو انضمام کے بعد ص ۲۰۶)

> ''وہ شروع شروع میں محمد صدیق جوان کا اصلی نام تھا، کے نام سے لکھتے تھے پھر یہ محمد صدیق توحیدی کے نام سے لکھنے لگے اور آخر میں انھوں نے ملا رموزی کا قلمی نام اختیار کرلیا۔'' (ایضاً ص ۲۱۲)

'کیا قافلہ جاتا ہے' کے مولف نصر اللہ خاں (م:۱۹۷۶ء) ملا صاحب کی علمی شخصیت اور قدر و منزلت کے بارے میں اس طرح گویا ہیں:

> ''ملا رموزی باغ و بہار آدمی تھے، ایک زمانہ میں ملک میں کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جس میں ملا صاحب کا مضمون نہ چھپتا رہا ہو۔ (بھوپال میں اردو انضمام کے بعد)

راقم السطور کے پاس بھی روزنامہ ’’ندیم بھوپال‘‘ کے ابتدائی شمارے موجود ہیں نیز دیگر رسائل و جرائد بھی ہیں جن میں ملا رموزی کے مضامین اور شعری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ نصر اللہ صاحب آگے رقم طراز ہیں:

’’ملا صاحب ویسے تو سارے ہندوستاں میں مشہور تھے لیکن بھوپال اگر اپنے تال (تالاب) کی وجہ سے مشہور تھا تو اس کی شہرت کا باعث ملا صاحب بھی تھے۔‘‘ (بھوپال میں اردو انضمام کے بعد)

پروفیسر رشید احمد صدیقی (م: ۱۹۷۷ء) ملا رموزی کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ملا صاحب کی تصنیفات بعض حیثیت سے بے مثل ہیں۔ ان کو ایسی ایسی ظرافتیں بھی سوجھ جاتی ہیں جہاں بہ مشکل کسی کی رسائی ہوسکتی ہے، جو نہایت درجہ دلکش اور پُر لطف ہوتی ہیں اور جہاں تک ہر شخص کا پہنچنا آسان نہیں ہے۔‘‘ (بھوپال میں اردو انضمام کے بعد، ص ۲۰۵)

شوکت رموزی ملا رموزی صاحب کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

’’کچھ کتابیں غیر مطبوعہ ہیں جن کے مسودے مکمل اور بہتر حالت میں موجود ہیں۔‘‘

لفٹننٹ کرنل عبدالعزیز صاحب اپنے خط مکتوبہ ۳۰/اپریل ۱۹۵۰ء (قلمی، غیر مطبوعہ) میں ملا صاحب کے علم اور ان کے مختصر تعارف میں لکھتے ہیں:

’’حضرت ملا رموزی علمی، ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ البتہ ان کے اس خصوصی کمال سے شاید لوگ کم واقف ہوں کہ ان کی نگاہ فوجی اور جنگی مسائل میں بھی کمال کا درجہ پائے ہوئے ہے۔‘‘

اردو ادب بالخصوص گلابی اردو کا یہ درخشندہ ستارہ ۱۹۵۲ء میں ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اور اپنی علمی ضیاؤں سے ہمیشہ کے لیے ادبی دنیا کو روشن کرگیا۔

’’ایسا کچھ کرکے چلو تم کہ بہت یاد رہو‘‘

تعارف مخطوطہ تاریخ افواج بھوپال بخط ملا رموزی

ماہ اپریل ۲۰۱۶ء کے آغاز میں احقر اور برادر صغیر بایزید سلّمہ قدیم کتب اور دیگر پرانی اشیا کی تلاش میں بھوپال پہنچے تو ہمیں وہاں کے ایک دلال کی معرفت چند کتب بہ قیمت مل گئیں۔ یہ تمام کتب کباڑ کی شکل میں تھیں۔ بھوپال سے ہم اپنے وطن امروہہ ان کتب کو لے آئے اور ان کا مطالعہ شروع کیا تو ہمارے سفر کی تکان کافور ہوگئی۔ ان کتب میں تاریخ افواج بھوپال المعروف بہ تاریخ سلطانیہ انفنٹر ی بھی تھی۔ اس وقت ہمارے والد گرامی الحاج جناب توفیق احمد قادری چشتی مرحوم (۹/اگست ۲۰۱۶ء) ماہر نوادرات و مخطوطات باحیات تھے۔ اس تاریخ کے حوالے سے ہم نے کتب بینی شروع کی تو دیکھا ملا صاحب کی اس تاریخ کا کسی بھی مورخ نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا اس تاریخ کا تعارف اور اہمیت قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔

تاریخ افواج بھوپال المعروف بہ تاریخ سلطانیہ انفنٹر ی نواب محمد حمید اللہ خاں مرحوم کے زمانہ میں لکھی گئی

تھی، نواب صاحب خود ایک سپاہی اور کمانڈر تھے۔ کرنل سردار عبدالعزیز نواب صاحب مذکور کو اپنے خط مکتوبہ ۳۰/اپریل ۱۹۵۰ء میں کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’میں نے اس جذبۂ وفاداری سے بھوپال سلطانیہ انفنٹر ی کی حضورِ معلیٰ کے عہد تک کی خدمات جنگ کی ایک مختصر تاریخ کرائی ہے کہ موجودہ انقلابات اور آنے والے انسان بھوپال کی صد سالہ خدمات جنگ اور محترم فرمان روایانِ بھوپال کے جنگی کرکٹر کو فراموش نہ کرسکیں۔ اس تاریخ کے اردو، ہندی اور انگریزی ایڈیشن شائع کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔‘‘

کرنل عبدالعزیز مخطوطے کے صفحہ ۱/ پر تحریر فرماتے ہیں:

’’پس اپنے بزرگوں کی بھی سپاہیانہ اور جاں نثارانہ سیرت مجھے ملی اور میں اپنے اس خاندانی تاثر سے شروع عمر ہی سے فوجی زندگی کا شائق تھا۔ الحمدللہ کہ حضور قدر، قدرہ اعلیٰ، حضرت نواب محمد حمید اللہ خان بہادر بالقابہ کی خسروانہ مرحمت و شفقت سے مجھے اپنے پیدائشی ذوق کے مطابق فوجی زندگی میں داخل ہونے کا موقع ملا۔‘‘

زیر نظر مخطوطہ کے صفحہ ۳/ پر کرنل عبدالعزیز فرماتے ہیں:

’’مذکورہ بالا ارادہ کو تحریر میں لاتے وقت مجھے خاص خوشی یہ ہے کہ میرے عظیم ذمہ دارانہ کاموں کے پیش نظر اتنی عظیم یادگار کتاب کی تالیف کے لیے مجھے میرے ملک ہی سے ایک ایسا صاحب قلم مل گیا جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں ملا رموزی کے نام سے مقبول و مشہور ہے۔‘‘

کرنل صاحب اپنے مذکورہ خط مکتوبہ ۳۰/اپریل ۱۹۵۰ء میں لکھتے ہیں:

’’اس تاریخ کی تحریر کے لیے میں نے ملا رموزی کی خدمات کو حاصل کیا ہے جو آل انڈیا فیم کے اہل قلم ہیں۔ ان کو جنگی نفسیات و معلومات پر جو عبور حاصل ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ ہمارے مختصر سے ریکارڈ کو انھوں نے اپنے معلوماتی اضافوں سے بیش قیمت تاریخی اہمیت دی۔ انھوں نے ہمارے دیے ہوئے وقت کی قلت کے باوجود بے شمار اخباروں، کتابوں اور مختلف تحریروں سے ’تاریخ افواج بھوپال‘ کا اتنا عظیم اور نادر ذخیرہ فراہم کرلیا ہے...... اگر حضور معلیٰ کی سرپرستی حاصل ہوگئی تو ملا رموزی بھوپال کی سہ صد سالہ فرماں روائی کی عہد بہ عہد فوجی تاریخ مرتب کردیں گے۔ ان کے دماغ کی جس صلاحیت کو میں نے بے حد پسند کیا ہے کہ انھوں نے تاجدار بھوپال اور افواج بھوپال کو تمام ہندوستان کا مسئلہ بنادیا ہے اور انھوں نے اپنے ہر حاشیہ میں بھوپال اور فرمانروائے بھوپال کا جذبہ بے تعصب دکھایا ہے۔

حضور عالی (نواب حمید اللہ خاں صاحب) کے احکام اور ہدایات کو حاصل کرکے اس عظیم تاریخ کو مزید اضافوں اور حواشی سے مزین کیا جائے۔‘‘

ذہن نشین رہے کہ مذکورہ خط کرنل عبدالعزیز صاحب نے نواب حمید اللہ خاں صاحب کو ۳۰/اپریل ۱۹۵۰ء میں اس تاریخ کو لکھنے کے لیے تحریر کیا تھا۔ چنانچہ ملا رموزی کی خدمات مذکورہ تاریخ کے لیے کرنل صاحب نے حاصل کی۔ انھیں خدمات کا صفحہ ۳/ پر اعتراف فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’شاید لوگ کم واقف ہوں کہ ان کی نگاہ فوجی اور جنگی مسائل میں بھی کمال کا درجہ پائے ہوئے ہیں (ہے)۔‘‘

کرنل صاحب ملا رموزی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’میں موصوف کا شکر گزار ہوں کہ موصوف نے اس تاریخ کی تدوین میں کمال درجہ فوجی واقفیت اور خلوص عمل سے میری امداد فرمائی۔‘‘ (مخطوطہ تاریخ افواج بھوپال از ملا رموزی ص ۴)

۱۹۵۰ء میں کرنل عبدالعزیز صاحب نے اس کتاب کو تیار کرانے پر اپنی جیب خاص سے ایک ہزار روپے خرچ کیے تھے، مزید خرچ کے لیے نواب صاحب کو عرضی دی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

’’میں نے اپنی گنجائش سے تقریباً ایک ہزار روپیہ اس تاریخ کی لکھائی، اس کے ذخائر کو اخباروں، کتابوں اور دفاتر سے تلاش کر کے فراہم کرنے پر صرف کیا ہے اور اس سے زیادہ کے لیے میری مقدرت نے جواب دے دیا۔ ہماری کوشش ادھوری بلکہ ناکام رہے گی جب تک حضور معلیٰ اس تاریخ کو ملاحظہ فرما کر ہماری اعانت اور سرپرستی نہ فرمائیں گے۔

اس لیے میری پُرجوش التماس ہے کہ ہماری تاریخ کے ان صفات پر بین الاقوامی شہرت کے برطانوی لیڈروں کے قلمی ریویو حضور معلیٰ کے ذریعہ حاصل کر کے اس تاریخ کو آنے والوں تک پہنچا دیا جائے۔ اس کی عبارت اور واقعات کو موجودہ حالت کے عین مطابق اس اہتمام سے لکھا ہے کہ موجودہ عہد کے عوام متاثر ہوں۔‘‘

ملا رموزی اپنی اس قلمی غیر مطبوعہ تاریخ کے صفحہ ۲۱/ پر رقم طراز ہیں:

’’مجھ سے دسمبر ۱۹۴۹ء میں کام کے آغاز کو کہا گیا اور اپریل ۱۹۵۰ء میں ختم کر دینے کو۔‘‘

ملا صاحب نے صرف پانچ ماہ میں اس ضخیم تاریخی کتاب کو مکمل کر دیا تھا، لہٰذا مخطوطے کے صفحہ ۲۱/ پر ملا صاحب رقم طراز ہیں:

’’اب ان پانچ ماہ میں مجھے اس تاریخ کے لیے جس ترتیب و تصدیق کی برسوں فرصت درکار تھی اور جس کے ریکارڈ کی سرکاری صحت لیے ہوئے فراہمی کے سلسلے بجائے ایک کام کے دو کام کرنا پڑے یعنی ایک تاریخ لکھنا، دوسرے واقعات تاریخ کا بھی فراہم کرنا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے شبانہ روز کی دماغ سوز محنت میں مبتلا ہونا پڑا اور فوجی دفتر کی چند سطری اطلاع پر مجھے جغرافیہ، مقامات جنگ

اور اطلاعات جنگ کے لیے انبار انبار اخباروں میں کھونا پڑا۔‘‘

صفحہ ۲۲ پر اس طرح لکھتے ہیں:

’’یہ تمام مشکلات اس لیے پیش آئیں کہ مجھے پلٹن کی طرف سے صرف ایک ڈائری مرتبہ جناب میجر عبدالرؤف خاں صاحب دی گئی تھی جس کے ضروری حواشی اور متعلقات کی فراہمی کے لیے مجھے جناب ابرار احمد صاحب دیے گئے تھے۔‘‘

ملا رموزی اس تاریخی مخطوطے کے آخری عنوان ’’ختم کتاب اور میدان جنگ‘‘ صفحہ ۲۲۱ پر رقم طراز ہیں:

’’آج کے ’سلطانیہ انفنٹری‘ بھوپال کی ازاول تا آخر داستان ختم ہو رہی ہے۔‘‘

مخطوطے کے آخری صفحہ ۲۲۵ پر کتاب کا اختتام ملا صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’’سلطانیہ انفنٹری کے افسران اور سپاہی دن و رات سنگین تانے کھڑے ہیں...... ریاست بھوپال اور ہندوستان کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہوئے تھے۔ آج اسی سلطانیہ انفنٹری کی اس کتاب کے آخری دنوں میں بھی وہ اپنے بھوپال اور اپنے ہندوستان کے بے قصور انسانوں اور اپنی مرکزی حکومت ہند کی جانثاری کے لیے گولی کھانے اور گولی چلانے کے لیے اسی میدان میں کھڑے ہوئے ہیں جہاں کے لیے سر دینے کا ان کے اسلاف اور خود انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ پس سلطانیہ انفنٹری کے اس وفادارانہ کردار پر میں ان جملہ افسران اور سپاہیوں کو مبارک باد کہنے پر اس کتاب کو ختم کرتا ہوں۔‘‘ (اپریل ۱۹۵۰ء، ملا رموزی)

ملا صاحب اس تاریخ کے لکھنے یا عالم وجود میں لانے کے محرک اول جناب کرنل عبدالعزیز صاحب کو بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’آخر میں جناب گرامی لفٹننٹ کرنل سردار عبدالعزیز خاں صاحب کمانڈنٹ سلطانیہ انفنٹری بھوپال کو شکریہ کے ساتھ مبارک باد دیتا ہوں کہ وہ اس ’فوجی تاریخ‘ کے محرک اول ہیں‘‘ (صفحہ ۲۳، مخطوطہ تاریخ افواج بھوپال)

مذکورہ حوالوں کی روشنی میں معلوم ہوا کہ اس تاریخ کا علم کسی محقق کو نہیں تھا یا نہیں ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب نے ۲۰۱۶ء میں ایک مونوگراف ’ملا رموزی‘ مرتب کر کے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی سے شائع کیا ہے۔ اس میں بھی تاریخ افواج بھوپال کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ علمی حلقے میں ملا صاحب کی اس تاریخ کا دور دور تک تذکرہ نہیں ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب موصوف سے اس سلسلے میں فون پر گفتگو ہوئی تھی تو آنجناب نے فرمایا کہ یہ تاریخ غیر مطبوعہ ہے۔ اس سلسلے میں ملا رموزی صاحب کے صاحب زادے جناب رفعت رموزی صاحب نے فون پر راقم السطور سے اس تاریخ کے عکس کی خواہش ظاہر کی تھی اور آپ کو میرا پتہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے دیا تھا۔

عجیب اتفاق ہے کہ تاریخ افواج بھوپال ملا صاحب نے اپریل ماہ میں ہی مکمل کی تھی اور اپریل ماہ ۲۰۱۶ء میں ہی ۶۶ ربرس کے بعد احقر کو بھوپال سے ہی اس کا نسخہ بہ قیمت دستیاب ہوا۔

بقول کرنل عبدالعزیز صاحب کہ اس عظیم تاریخ کو مزید اضافوں اور حواشی سے مزین کیا جائے۔ یہ مکمل مخطوطہ خود ملا صاحب کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ باقی حالات اہل تحقیق پر چھوڑے جاتے ہیں۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید　　　　کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

علامہ اقبالؔ

کیفیت مخطوطۂ مذکورہ:

نام	:	تاریخ افواج بھوپال المعروف بہ تاریخ سلطانیہ انفنٹری
مولف وکاتب	:	ملا رموزی
کتابت	:	اپریل ۱۹۵۰ء
صفحات	:	۲۳۴
کاغذ	:	مشینی
سائز کاغذ	:	33x15cm
سائز متن	:	30x20cm
زبان	:	اردو
خط	:	نستعلیق
روشنائی	:	سیاہ

راقم السطور کی دانست میں یہ ملا صاحب کی مرتب کردہ تاریخ افواج بھوپال کا واحد نسخہ ہے۔ اس کا کوئی دوسرا نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔

نوٹ:

تاریخ افواج بھوپال کاغذ کے ایک طرف (One Side) لکھا ہوا ہے۔ (انوار صمدانی)

☆☆☆☆☆

Anwar Samadani
Near Jinon Wali Masjid, Amroha- 244221
Mob. 9557441990, 9319581037
E-Mail: anwar.sa@rediffmail.com

لالہ بشیشر پرشاد وارؔ کا انیسویں صدی عیسوی کا بنارس

وسیم حیدر ہاشمی

یوں تو اُنیسویں صدی عیسوی کے مہتم بالشان شاعر و ادیب لالہ بشیشر پرشاد متخلص بہ وارؔ کا نام بہت مشہور نہیں ہے پھر بھی ان کی ایک کاوش بعنوان ''تحفۃ الاحباب بنارس'' کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو راقم السطور کا یہ خیال پایہ تکمیل کو ضرور پہنچتا ہے کہ موصوف کا نام اس دور کے کلاسیکی ادب میں سنہری حروف میں لکھے جانے کا مجاز ہے۔ ہر چند کہ راقم کو اب تک موصوف کی صرف درج بالا کتاب سے استفادہ کرنے کا شرف حاصل ہے مگر ان کے ایک بیان پر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کئی دیگر کتب بھی سپرد قلم کی ہیں۔ لالہ بشیشر پرشاد کے ایک بیان کے مطابق بنارس کے میلوں ٹھیلوں اور دیگر علوم کے متعلق اس کتاب سے قبل بھی کئی کتب زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں (۱)۔

لالہ بشیشر پرشاد کی صحیح یوم ولادت کا ذکر کہیں دستیاب نہیں مگر متذکرہ کتاب میں ہی اپنے والد کی وفات کے ذکر کے موقع پر خود رقم طراز ہیں:

''۔۔۔سمت ۱۹۰۹ مطابق ۱۸۵۳ عیسوی اس جہان گذراں سے بعمر پنجاہ و پنج سالگی کہ ان دنوں ایام زندگی راقم سطور کے قریب بیس برس گزر گئے تھے، انتقال فرمایا اور کاشی باش دوامی پایا۔۔۔''۔(۲)

لالہ بشیشر پرشاد کے درج بالا بیان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موصوف کی ولادت ۱۸۳۳ء کے قریب ہوئی ہوگی۔ متذکرہ کتاب بعنوان تحفۃ الاحباب بنارس، جس میں انیسویں صدی کے بنارس کی عکاسی نہایت جاذب و جالب انداز سے کی گئی ہے، کی وجہ تالیف کے تعلق سے لالہ بشیشر پرشاد فرماتے ہیں:

''خاکسار بشیشر پرشاد متخلص بہ وارؔ راقم سطور خدمت میں ژرف (تر و تازہ، عمیق) نگاہان، دریا ہے (ئے) صولت و عالی دماغان فلک مرتبت کے وجہ تالیف کتاب عرض پرداز ہے۔ اگرچہ حال کی تصنیفات و تالیفات سے کئی کتابیں و رسالے مثلاً علم الٰہیات (علم حکمت کی ایک قسم جس میں علم الٰہی سے متعلق بحث مقصود ہوتی ہے) میں بشن پوران ہے۔ بشن رئیس کا ترجمہ اور دوسری کتاب مجموعہ اوصاف کہ جس میں راقم کے قصیدے اور نثر مدیحہ ہیں اور تیسرے بیانات کہ اکثر جلیسوں (جلسوں) میں پڑھے گئے کہ جس کو انگریزی میں لکچر کہتے ہیں اور چوتھے اخلاق ناصری کا ترجمہ بطور انتخاب کہ منجملہ اس کے کتاب ادب اطفال ہے اور پانچویں منشیات منبع الابحار اور بھی کئی رسالے علم و ہنر کے بنائے گئے۔ اگر (مگر) یہ کتاب میں نے اول میں بنسبت وطن کی جدائی کے دوران بنارس کے تحفہ دینے کو کہ میرا وطن ہے بنائی اور اس سبب سے نام اس کا تحفۃ الاحباب بنارس رکھا۔ مقصود اس

کتاب سے یادگار ہے، نہ کسی کی فرمائش ہے نہ کسی کا اصرار ہے۔ اول مقدمہ اس کا دیکھنا مقدم ہے، حقائق موجودات کا بہت سا بیان ہے۔ انواع نوادرات کی کان ہے۔ اردو بول چال کی نئی ٹکسال مغربی سخن کے سکہ تازہ ضرب کامل عیار جدید ہیں اور باقی پانچ باب میں رسم خط کے قواعد اور اس کی تحقیق کہ لڑکوں کے لیے بہت مفید ہیں اور بھی علاوہ اس کے کئی طرح کے ذکر اذکار اس میں مذکور ہیں۔ بہر حال مفصل بتفصیل دیکھنے سے معلوم ہوگا۔ اب امید صاحب نظروں سے یہ ہے کہ اگر اس گلزار میں کہیں غلطی کا خار دیکھیں تو خطا پوش ہو کر قلم کے بیلچہ سے اصلاح دیں۔ کس (اس) لیے کہ تصنیف کرنے والے سے مبصر کی عقل زیادہ لڑتی ہے، کیوں کہ وہ بہ آسانی کل مضمون پر واقف ہو جاتے ہیں اور عقل کا خاصہ باریک بینی کا ہے، جو باتیں کہ مصنف سے چھوٹ جاتی ہیں اس پر نظر پڑتی ہے۔ علاوہ اس کے یہ ظاہر ہے کہ ایک آدمی کی عقل برابر ہزار آدمی کے نہیں ہو سکتی، پس سوائے اس کے کہ وے لوگ اپنی مہربانی سے عیب پوشی فرما دیں دوسرا چارہ نہیں۔ اب شروع کتاب کا تبرکاً و تیمناً بنارس کے حال لکھنے سے کہ جو زادبومِ (مادر وطن) راقم سطور ہے، کرتا ہوں۔" (۳)

درج بالا کلمات رقم کرنے کے بعد مصنف بنارس کے تعلق سے اپنے خیالات کے بیان کا آغاز کرتا ہے۔

وجہ تالیف کے بعد متذکرہ کتاب کا باقاعدہ آغاز مصنف نے اسی کتاب کے حاشیے پر شائع لالہ مِتُن لعل متخلص بہ آفرینؔ کی تقریباً تین ہزار اشعار پر مشتمل ایک طویل منظوم فارسی مثنوی بعنوان "کاشی اِستُت" کے تعارف اور اس کے خواص سے کیا ہے۔ اس سے قبل آفرین کا تعارف کرایا گیا ہے۔ آفرینؔ کے تعارف میں موصوف نے تمام احوال اردو کے بجائے خالص فارسی میں درج کیے ہیں، جس سے اس بات کا اندازہ بھی بخوبی ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے فارسی داں بھی تھے۔ آفرینؔ کی صلاحیتوں کے تعارف میں ان کا پہلا جملہ ہی ان کی فارسی دانی کا غماز ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"افصح الفصحا، ابلغ البلغا، مرکز محیط کیاست، شاعر شیرین زبان، ناظم فصاحت بیان، موجدِ سخن ہای نو آئین، لالہ متن لعل آفرینؔ۔" (۴)

موصوف کے پورے بیان کو پڑھنے کے بعد قارئین اس حقیقت سے کما حقہٗ واقف ہو جاتے ہیں کہ لالہ بشیشر پرشاد، آفرینؔ کی صلاحیتوں اور انداز بیان سے حد درجہ متاثر تھے۔ وارؔ رقمطراز ہیں کہ آفرینؔ کا تعلق کایست قوم سے تھا اور وہ الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ خود بشیشر پرشاد وارؔ کے والد کے دوست تھے، جو بنارس کے محلہ کبیر چورا میں آبسے تھے۔ آفرین کو جواں سال فرزند کی ناوقت موت کا جانکاہ صدمہ جب برداشت نہ ہو سکا تو اس غم کو غلط کرنے کی غرض سے وہ بنارس آ گئے۔ بنارس آنے کے بعد آفرینؔ بیشتر یہاں کی گلیوں اور سڑکوں پر گھوما کرتے اور اسی دوران انھوں نے یہ مثنوی نظم کی۔ لالہ متن لعل آفرینؔ کے بیٹے کا نام چونکہ کاشی پرشاد تھا، غالباً اسی مناسبت سے انھوں نے اپنے بیٹے کا نام اس مثنوی کے ساتھ جوڑ دیا۔

یہاں لالہ بشیشر پرشاد کے بنارس کا تذکرہ تحفۃ الاحباب بنارس کی روشنی میں مقصود ہے۔ اگر قارئین غور فرمائیں تو انھیں احساس ہوگا کہ گویا ان کی آنکھوں کے سامنے انیسویں صدی عیسوی کے بنارس کے مناظر بتدریج

پردہ سیمیں کے مانند آنکھوں کے سامنے سے گزرتے جاتے ہیں۔ چونکہ متذکرہ کتاب کی زبان انیسویں صدی عیسوی کی ہے اس لیے راقم السطور نے ضرورت کے لحاظ سے مصنف کے استعمال شدہ چند الفاظ کو رائج الوقت زبان میں اس طرح تبدیل کر دیا ہے کہ جملے قدرے آسان، سلیس اور رواں ہو جائیں اور کتاب کی زبان کے متن پر کچھ خاص اثر نہ پڑے۔ ویسے یہ کتاب اخیر کے پانچ مختلف ابواب کے ساتھ کل ۶۴/عناوین پر مشتمل ہے۔ ان پانچ ابواب میں ۲۷/ذیلی عناوین بھی ہیں۔ تحقیقات خط، آلات خوش نویسی کے علاوہ انگریزی، چینی، فارسی اور ہندی کے خطوط، دیوناگری وغیرہ کا بیان اور حروف کی بناوٹ وغیرہ کا ذکر شامل حال ہے، جن میں سے بنارس کا حال "تمام شد مقدمہ" کے عنوان پر ختم ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ عناوین بنارس کی خصوصیات وغیرہ سے الگ ہیں اس لیے ان کا ذکر حذف کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ مضمون کی طوالت سے بھی گریز کیا جا سکے۔ اس مضمون میں پیش ہیں کتاب کے وہ چنندہ حصے جو مضمون کے عنوان پر صادق آتے ہیں۔

بیان عمارات ساحل گنگ:

بیان خوبی عمارت دلکشا، و گھاٹ ہائے فرح افزا ساحل گنگ کے سخن کو آب و رنگ بخشی جاتی ہے کہ دریائے برنا سے دریائے اَسیَ تک پانچ کوس کا واسطہ ہے، برابر سنگین راستہ ہے۔ عمارات ایسی بلند، باعظمت و شکوہ ہیں، یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوہ در کوہ ہیں۔ اوج کے بیان سے خرد کوتاہ ہے، زینوں سے ثابت ہوتا ہے۔ برجوں کی خوبی دیکھ کر عقل کو حیرت ہے، فلک پر برج و کواکب کو غیرت ہے، اسی شرم سے آفتاب دوازدہ برجوں میں دورہ کرتا ہے اور اس کی خوبی پر غور کرتا ہے۔ اگر کسی کو بھی اس کے ہم پایہ دیکھتا، نہ گھومتا، کسی جا ٹھہرتا بلکہ غیرت حجاب سے سر شام ڈوب جاتا ہے۔ شفق سے ثابت ہوتا ہے کہ خون کھاتا ہے۔ فرشتہ و حور غسل کو آتے ہیں، ساحل دریا پر جلوۂ نور دکھلاتے ہیں۔ دریائے سخن دل میں جوش مارتا ہے اور اس مختصر کتاب میں نہیں سماتا ہے۔ اگر ایک حال لکھوں تا عمر اسی میں صرف کروں۔ مبالغے سے نہیں کہتا، کوئی قدرداں آزما کے دیکھ لے، یا زمانہ مجھے فرصف دے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔۔ تمام شہر میں باغ ہزار سے زیادہ ہے، خوبی ان کی خزاں میں بہار سے زیادہ ہے۔

حال درون شہر:

سبحان اللہ، عجب شہر دلکشا ہے و عجیب خطہ روح افزا ہے، راستہ، گلی کوچہ سنگ بستہ ہیں، کدورت سے رفتہ (پاک) ہیں۔ ازبس شفاف ہیں، مثل دل آئینہ دلوں کے صاف ہیں۔ مکاناتِ سنگین پنج محلے، ست محلے بنے ہیں، متصل ملے ہوئے ازبس گھنے ہیں۔ ہر ایک پتھر نقش و نگار سے سجا ہوا ہے، سنگ تراشانِ فرہاد فن کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔ بیان بلندی کا لامکان ہے، آسمان زمین ہے، زمین آسمان ہے۔ دولت و حشمت سے اندرون مالا مال ہے، رفعت و شوکت سے بیرون، باجاہ و جلال ہے۔ استحکام ایسا ہزار برس مرمت نہ کیجیے کچھ پروا نہیں، ایک خشت بھی جا سے بے جا

نہیں۔ ہر سُکنائے شہر یہاں کا وضع دار، خوش گو، یوسف جمال، خوش پوشاک، خوش خو، روزمرہ صاف، تقریر شفاف۔ بازار ایسے ہیں کہ ہفت اقلیم کی چیزیں جو چاہو سو ملتی ہیں اور ارزاں قیمت کو بکتی ہیں۔ جوہری بازار کا کیا بیان کروں، دید کے لائق ہے، ہر شخص اس کی سیر کا شائق ہے۔ ہر ایک جوہری خوش وضع، جامہ گھیر دار ڈھاکے کی ململ پہنے ہوئے، پگڑی باندھوں کے پیچوں کی باندھے ہوئے، ایسی خوش وضعی سے بیٹھے رہتے ہیں کہ اول خریدار انھیں کو دیکھ کر بھڑک جائے، یہی دل میں آئے کہ جو قیمت مانگیں دے دیجیے، جواہر لے لیجیے۔ دل ان کی صورت دیکھ کر دُرِ غلطاں ہو جاتا ہے۔ اس بازار سے باہر ہونے کو کب جی میں آتا ہے۔ جوہر سیروں اور منوں تُلوا لیجیے۔ بازار کیا کہوں، دریائے معدن کہنا چاہیے۔ سونا بازار کہ جو 'بھیرَ و بازار' کر کے مشہور ہے، اشرفیوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ زعفران کا کھیت ہے۔ 'ٹھٹھیری بازار' میں اگر جا کر کھڑے ہو جیے (جائیے) تو ایک عالم کی صنعت کو دیکھ لیجیے۔ برتنوں پر ایسی نقاشی کی جاتی ہے کہ کب تصور میں آتی ہے۔ 'چاندنی چوک' میں اس طرح دُکان صف بہ صف بنی ہیں کہ گویا حسینوں کی صف کھڑی ہیں۔ ہزاروں اہل حرفہ (چھوٹے کاروباری) انواع و اقسام کی چیزیں لیے کھڑے رہتے ہیں، خریدار تاک لگائے اڑے رہتے ہیں۔ ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں۔ زر قیمت دونی چوگنی دے دیتے ہیں۔ دو گھڑی دن رہے سے وہ آدمیوں کی کثرت ہوتی ہے کہ اندیشے کو نہ جانے سے حسرت ہوتی ہے۔ 'کنج گلی' کی کیا تعریف کروں، دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'بند رابن کی کنج گلی' نقل ہے اور یہ اصل ہے۔ اس کُنج گلی میں ہفت اقلیم کے کپڑے، دیبائے رومی، اطلس فرنگی، مخمل کاشانی، دوشالہ کشمیری کا انبار ہے۔ مشرو گلبدن، کمخواب کہ جو اس شہر میں خوب بنتا ہے، طومار ہے۔ 'نئے چوک' کی نئی شان ہے، صرف بزاز کی دُکان ہے۔ کپڑا سب ولایتی بانا ہے۔ تمام شہر کے وضعدار خریدار کا دو گھڑی دن رہے سے وہاں تھانہ ہے۔ عجیب کیفیت رہتی ہے۔ فروخت کا یہ حال ہے کہ شام تک اگر کسی بزاز کی دکان پر ایک دھجی تلاش کیجیے تو ملنا محال ہے۔ 'ترلوچن بازار' میں غلّے کا بیوپاری ہے۔ جدھر دیکھو ادھر انبار در انبار ہے۔ خدانخواستہ درصورت گرانی ہفت اقلیم میں ارزانی ہو جائے، اس قدر غلہ وانی ہے کہ بارہ برس اگر زمین بے کاشت رہے تو ساکنان رُبع مسکوں کو کافی ہے۔ 'بشیشر گنج' میں ہفت اقلیم کے اثمار، برنج (چاول) ملتے ہیں۔ 'دال کی منڈوی' (دالمنڈی) جنس حسن پر دال (بمعنی دلالت کرنا یعنی دلیل ہے)، سودائے عشق سے مالا مال ہے۔" (۵)

یہ تو تھا درون شہر کا حال کہ جیسا لالہ بشیشر پرشاد نے آنکھوں دیکھا، بیان کر دیا۔ اس کے بعد مختلف عناوین کے تحت حلوائی، کچوری والے، خوانچہ والے، مطب، موسیقی دانان (ڈھولک، ستار، شہنائی، پکھاوج وغیرہ) بنارس، عالمان علوم فن، دانشوران وغیرہ کے احوال نہایت جاذب و جالب انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ جا بہ جا مقفیٰ و مسجع نثر (جو کہ ترقی پسند تحریک اور مابعد جدیدیت کے بعد ناپید ہو گئی ہے) میں بنارس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں کہ قاری خود کو اُنیسویں صدی کے باوضع شہر بنارس میں محسوس کرتا ہے۔ انداز بیان ایسا کہ کلاسیکی فکر رکھنے والوں کے ذہن تازہ ہو جائیں۔ مگر افسوس کہ اس مختصر مضمون میں درج بالا تمام عناوین کا بیان ممکن نہیں

چنانچہ اختصار کی راہ اختیار کرتے ہوئے چند دلچسپ و دل نشیں عنوان کے ذکر کے ساتھ مضمون کو تمام کرتا ہوں۔ جن کا آغاز خوردنی اشیا سے ہوتا ہے۔

داس حلوائی:

داس حلوائی کی 'محلہ بی بی ہٹیا' میں دُکان ہے۔ شیرینی اس کی لذت بخش، مذاق جان ہے۔ سب مٹھائیوں کا بیان اس مختصر میں امکان نہیں مگر اس نے ایسا پیڑا بنایا کہ جس نے کھایا تمام عمر داس یعنی غلام رہا۔

درباری حلوائی:

اسم بامسمیٰ نے کہ متصل 'چاندنی چوک' کے 'ناریل بازار' میں دُکان کرتا ہے، ایک مٹھائی کو اس انداز سے بنایا کہ ہفت اقلیم کے حلوائیوں کا دربار مدّا کیا۔ بڑے بڑے امیر امرا، زیر دکان دھیان لگائے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہی دربار ہے۔

سِنگھ کچوری والا:

جو قریب 'مچھر ہٹہ' کے دوکان کرتا ہے، اس نے ایسی کچوری ایجاد کی کہ تمام دنیا کے پکانے والوں کو کچّا کر دیا۔ سوندھی ایسی ہوتی ہے کہ واہ جی واہ، اور نرم ایسی ہوتی ہے کہ سبحان اللہ۔ سیروں کھا جائیے، آسودگی نہیں ہوتی۔ ہاتھ سے اُٹھانا محال ہے اور دانت لگانا کیا مجال ہے۔۔۔ لچھمن داس، زرگر قوم کا، اپنے باعث فخر یگانہ ہنر ورکہ ہاتھوں اس کے سیم نقرہ نثار ہے۔ محبت اس کی معشوقوں کے گلے کا ہار ہے۔ ایسی چمپا کلی بناتا ہے کہ باغ میں چمپا رشک کھاتا ہے۔ اس فن میں وہ ید بیضا دکھایا کہ معجزۂ کوہ طور یاد آیا۔ دوکان طلا و نقرہ کی کھان۔ سونا اگر چہ بالخاصیت گرم ہے مگر یہاں نرم ہے۔ جو ذرا اس سے کڑا ہُو، ساتھی پیروں پڑا۔ تول کر لیتا ہے۔ بے تول دیتا ہے۔ دست زرزیر بساط گنج خیز علاوہ اس کے مرصع کار جواہر نگار ہے۔ میناسازی کا وہ کام بنایا کہ قدرتی رنگ دکھایا۔ بڑی باتوں سے لاعلم، اور اخلاق حسنہ سے باعلم۔ بابو لعل گندھی یعنی عطر فروش کی 'سرچوکھنبہ' دکان ہے، معطر ساز مشام جان ہے۔ ایسا عطر بناتے ہیں کہ تمام زمانے کے گندھی رشک کھاتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ کوئی کپڑوں میں لگائے، ہزار شب دھلوائے، وہی خوشبو پائے، حتیٰ کہ کپڑا پھٹ جائے۔ اس کی بَتی بنا کر جلائے تو عنبر کی بو آئے۔۔۔ گوپی تنباکو والے نے کہ جو متصل 'ٹھٹھیری بازار' کے دکان کرتا ہے، ایسا تنباکو بنایا کہ کا ہے کو اس طرح کا پینے میں آیا۔ شروع سے آخر تک ایک رنگ جلتا ہے، تمام بنارس اس کا دَم بھرتا ہے۔ جو ایک دفعہ دَم لگائے، مزاج دھواں دھار ہو جائے۔۔۔ اگر چہ اس شہر میں شہنائی بجانے والے ایک سے ایک استاد ہیں اور روز نئی ایجاد کرتے ہیں مگر میاں کھنکھن بند مادھو نوبت نواز نے شہنائی کا ساز ایسا بجایا کہ کسی پر اس کا راز نہ کھلا کہ سوز ہے یا ساز ہے۔ بیشک، یہاں سے بہتر شہنائی دنیا میں نہیں بجتی، اگر ہو بھی تو یہاں کی تقلید ہے۔ (ہر چند کہ مبالغہ، کلام کا

حسن تصور کیا جاتا ہے مگر یہ مبالغہ نہیں۔اس کی نا قابل تردید مثال بھارت رتن استاد بسم اللہ خانصاحب مرحوم تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔)

بھگت ڈھولک نواز:

اگرچہ عطائی ہے مگر اس کی طبیعت کی ایسی رسائی ہے کہ بڑے بڑے کسبیوں نے معرکہ میں جَھپ کھائی۔ جس وقت ڈھولک بجاتا ہے، ایک نمونہ سحر سامری دکھلاتا ہے۔بڑے بڑے گوّیے بجیوں کو فرو دست رکھا۔

کلن سنگھ جی:

کامنہ چنگ (ستار جیسا ایک ساز) ایسا اعلیٰ بجایا کہ سب ساز پر مالا بجاۓ کبیر چورہ کے رقاص جس وقت گھنگھرو بجاتے ہیں معجزہ دکھاتے ہیں۔اہل مجلس کے دل زیر پامل ڈالتے ہیں۔تمام اَنگ ناچتا نظر آتا ہے۔گردش دست، دلاوروں کا دل ہاتھ سے لیے لیتی ہے۔بتانا (ہاتھ، پانوں، کاندھے، گردن اور آنکھوں سے اشارہ کرنے کو'بتانا' کہتے ہیں) اس کمال کو پہنچا کہ معنی مضمون کو اشارہ میں بتلایا۔(۶)

اس کے بعد کمپنی سرکار کے انگریز افسروں کے بنارس پر قبضہ اور اس شہر کو خوبصورت اور جدید بنانے کا ذکر بھی نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔انگریزی سرکار کا بنارس میں بڑے بڑے اسکول، کالج، چھاپا خانہ، ہسپتال کھولنا اور زمینوں کے عوض ان کے مالکان کو زیادہ سے زیادہ رقم معاوضے میں دینے کا ذکر ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی:

(۱)''تحفۃ الاحباب بنارس'' لالہ بشیشر پرشاد وار، مطبع بنارس لایٹ پریس، باہتمام پنڈت گوپی ناتھ ،۱۸۷۰ء، پہلی دفعہ ۱۰۰۰ جلد

(۲) ایضاً صفحہ ۲ — (۳) ایضاً صفحہ ۳۰

(۴) ایضاً صفحہ ۴ تا ۳ — (۵) ایضاً صفحہ ۲

(۶) ایضاً صفحہ ۸ تا ۶ — (۷) ایضاً صفحہ ۱۲ تا ۱۶

نوٹ: تحفۃ الاحباب بنارس کی سن طباعت ۱۸۷۰ء ہے جبکہ کتاب کے اختتام پر کاتب نے ۱۸۷۳ء لکھا ہے۔پتہ نہیں کیوں؟

☆☆☆☆☆

Waseem Haider Hashmi
B.10/43, Krim Kund, P.O. Shivala,
Varanasi- 221001, Cell: 9451067040
E-Mail: whh55bhu@gmail.com

احوال و آثار کنور بدری کرشن فروغ سکندرآبادی

محمد آصف

کنور بدری کرشن فروغ قصبہ سکندرآباد ضلع بلندشہر صوبہ اتر پردیش کے ایک رئیس، علم پرور اور معزز کایستھ گھرانے میں ۱۹۱۲ سمبت/ ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے۔جناب بینی کرشن، رئیس سکندرآباد ضلع بلندشہران کے والد تھے۔راجہ گوپال کرشن ان کے پردادا تھے جنھوں نے ۱۸۰۳ء میں گورنمنٹ انگلشیہ اور ریاست گوالیار کے مابین اپنی اعلیٰ لیاقت سے صلح کرائی تھی جس کے صلہ میں گورنمنٹ انگلشیہ نے راجہ کے خطاب سے سرفراز کیا۔

منشی بنولال بھٹناگر صاحب میر منشی لفٹیننٹ گورنر پنجاب فروغ کے حقیقی نانا تھے جو غالبؔ کے عزیز شاگرد اور فارسی کے معروف شاعر منشی ہرگوپال تفتہؔ کے چچازاد بھائی تھے۔فروغ کے پدری و مادری دونوں گھرانوں میں علم وادب کی شمعیں روشن تھیں، ان کے آباواجداد اپنی علمی لیاقت اور بالغ نظری کے سبب ہر دور میں انتظامیہ کے شعبوں اور علم وادب کی بزم آرائیوں میں نمایاں مقامات کے حامل رہے۔جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہوا تو علم وادب کی محفلیں جو درباری سرپرستی اور داد ودہش کی بدولت پرنور تھیں، سیاہ پوش ہوگئیں۔اس پرآشوب دور میں جب کہ مشترکہ ادبی وثقافتی روایت بھی وقت اور حالات کی صلیب پر تھی، مسلم سلاطین کی پروردہ ایسی خود دار نسلیں بھی تھیں جن میں اس گم گشتہ روایت کی رمق تاہنوز باقی تھی۔حضرت فروغ سکندرآباد کے ایک ایسے ہی ذی وقار خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔

حضرت فروغ کی ابتدائی تعلیم حسب دستور گھر پر ہوئی اور میر امیر علی صاحب متوطن سکندرآباد ضلع بلندشہر، جو فارسی زبان کے نہایت قابل، مُستند اور فاضل استاد تھے، ان سے فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد منشی ہرگوپال تفتہؔ سے عروض کے نکات سیکھے اور فن شاعری کی دو کتابیں ''عروض سیفی'' اور ''ایجاز القوافی'' انھیں سے پڑھیں اور جب جہانِ شعروسخن میں قدم رکھا تو تلمذ کا شرف بھی حاصل کیا۔فروغ تخلص بھی انھوں نے ہی عنایت کیا تھا جس کے اعداد سے وہ سال ۱۲۸۶ھ برآمد ہوتا ہے جب کہ فروغ نے گلزار عروض میں قدم رکھا تھا۔فروغ نے اپنے اشعار میں جابجا تفتہؔ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا ہے۔

شاگردِ شہِ سخن وراں ہوں — ذرّہ وہ ہوں، فخر آسماں ہوں
وہ شاعرِ باکمال یعنی — ہر حرف ہے جس کا بحر معنی
ہرگوپال ان کا نام نامی — اور تفتہؔ تخلص گرامی

مضمون جو لکھا انہیں دکھایا مِس کو میں نے کیمیا بنایا
تا شدہ تلمیذِ غالبؔ اوستاد ما فروغ فخرِ دیوانِ قضا شد مطلع دیوانِ ما
کجا تفتہؔ اوستادِ زمن کہ آمد شہنشاہِ ملکِ سخن
خود اُو رفت و آخر کلامش بہ جاست کلامش متین و ردِ حق نماست
سخن درجہان ست و گوینده رفت جہان را بہ تحریرِ خود در گرفت
کجا رفت آن غالبؔ نامور کہ استاد استادِ من شد سمر

حضرت فروغ نے فارسی اور اردو کے علاوہ ہندی، سنسکرت اور انگریزی وغیرہ زبانیں بھی سیکھیں تھیں اور اردو فارسی کے علاوہ ان زبانوں پر بھی کامل عبور رکھتے تھے۔لیکن ۱۸۷۶ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کا رجحان وکالت کی طرف ہوگیا اور ۱۸۸۲ء میں پنجاب سے وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد دہلی میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔

جس زمانے میں جناب فروغ نے دہلی میں قیام کیا گو یہ شہر ویران ہو چکا تھا پھر بھی کہیں کہیں ثقافت وشائستگی اور شعر وسخن کے گرد آلود آثار نظر آہی جاتے تھے۔لوگوں کے دلوں پر دوستداری، وفا شعاری اور خود داری کی جگہ مصلحت پسندی کا غلبہ ہو چلا تھا۔اکثر اصحاب کی بدولت ان کو بڑے بڑے نقصان اٹھانے پڑے۔اس کے بعد وہ دہلی کی علمی و ادبی صحبتوں سے خصوصی طور پر منسلک رہے اور انھیں کی کوششوں سے دہلی میں ''انجمن اِتحادِ سخن'' کی بنیاد پڑی۔جس کی طرف سے ہر ماہ کے آخری ہفتہ میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ماہنامہ ''کمال دہلی'' بھی انھیں کے دست کرم کا ایک ادنیٰ نمونہ تھا۔دہلی کا عظیم الشّان مشاعرہ جو ۲۵ فروری ۱۹۱۱ء کو غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اس شان وشوکت سے ہوا، وہ بھی آپ ہی کی دریا دلی کا طفیل تھا۔

حضرت فروغ ایک ملنسار، بے تکلف، خوش مزاج خلیق اور باوضع رئیس تھے۔ان کا خاندان سکندر آباد میں بڑی جاگیر کا مالک تھا۔اگر وہ چاہتے تو عیش بافراغت کے مزے لوٹ سکتے تھے لیکن بچپن ہی میں مرزا تفتہؔ کی ادبی صحبت کا ایسا اثر ہوا کہ ان کا شاگرد سکندرآباد کی تنگنائے سے نکل کر جہان آباد دہلی کی زلف شکن در شکن کا اسیر بن کر رہ گیا اور پوری زندگی علم وادب کی بزم آرائی اور خامہ فرسائی میں مصروف رہ کر صرف کر دی۔جس کے نتیجے میں حسب ذیل علمی وادبی آثار ان سے یادگار ہیں۔

(۱) نوحۂ وفات ومسدّس شہر آشوب

اس کتاب کو بدری کرشن فروغ کی تخلیقات میں نقشِ اوّل ہونے کا حق حاصل ہے۔یہ مختلف عنوانات کے تحت اردو فارسی منظومات کا مجموعہ ہے۔جس کے کل ۳۲ صفحات ہیں۔یہ مجموعہ نیٹو امپیریل پریس دہلی سے

۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ کا آغاز ''نوحۂ وفات کنور بینی کرشن صاحب رئیس سکندر آباد'' سے ہوا ہے، جو مصنف نے اپنے والد کنور بینی کرشن صاحب کی وفات پر فارسی زبان میں لکھا تھا۔اس کے بعد ''قطعات تواریخ'' کے عنوان سے مختلف فارسی واردو تاریخی قطعات شامل ہیں، جو مختلف عنوان سے مثلاً کسی کی ولادت، وفات، مسجد کی تعمیر اور کتاب کی تکمیل وغیرہ سے متعلق لکھے گئے ہیں۔اس کے بعد ''دہر آشوب'' کو درج کیا گیا ہے۔آخر میں ایک قطعہ اور ایک غزل کو شامل کیا گیا ہے۔

(۲) فروغِ عروض

یہ کتاب نیٹو امپیریل پریس دہلی سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔کتاب کا آغاز مولف کے ذاتی تعارف سے ہوا ہے، اس کے بعد وجہِ تالیف بیان کی گئی ہے۔مؤلف نے اعتراف کیا ہے کہ سیفیؔ صاحب کے فارسی رسالہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔کتاب تین ابواب اور چونتیس فصلوں پر مشتمل ہے۔ارکان و زحافات، بحور اور قوافی پر شرح و بحث کی گئی ہے۔

(۳) ماہنامہ ''کمال دہلی''

یہ ادبی ماہنامہ جناب فروغ کی دریادلی کا نتیجہ تھا۔اس کا پہلا شمارہ جون ۱۹۰۹ء میں سنٹرل پریس دہلی میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔اس کے ایڈیٹر اور پبلشر پیارے لال رونقؔ دہلوی اور چندی پرشاد شیداؔ تھے۔پہلے دو شماروں کے سرورق کی پیشانی پر فروغ صاحب کا قطعۂ تاریخ درج ہے۔

یہ وہ گلدستۂ گلشن ہے کہ جس سے ہرجا آپ ظاہر ہے عجب جاہ و جلالِ دہلی
سال ہجری ہے عیاں میرے ہر اک مصرع سے واہ کیا خوب ہے تالیفِ کمال دہلی

خاص سرپرستوں کے اسمائے گرامی سرِورق پر درج ہیں۔فروغ صاحب کے علاوہ لالہ سری رام اور سائل دہلوی کے اسمائے گرامی بھی لکھے گئے ہیں۔

ماہنامہ ''کمال'' دہلی میں انجمن اتحادِ سخن کی ادبی و شعری روداد اور طرحی غزلیات کے علاوہ مختصر ادبی مضامین اور ادبی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔آخری صفحات ایک مسلسل ناول کے لیے وقف رکھے گئے تھے۔یہ ناول انگریزی زبان کے کسی ناول کا ترجمہ ہوتا تھا۔مجموعی حیثیت میں ''کمال'' دہلی کا بیشتر حصہ مشاعرہ کی روداد پر مشتمل ہوتا تھا۔اس کے بیک کور پر لالہ سری رام کے تذکرہ ''خمخانۂ جاوید'' کا اشتہار ضرور ہوتا تھا۔معلوم ہوتا ہے کہ لالہ سری رام صرف اعزازی سرپرست نہیں تھے بلکہ فروغ صاحب کے اس رسالہ کی مالی معاونت بھی کرتے تھے۔

(۴) مثنوی نورِ نظر

مثنوی ''نورِ نظر'' المعروف بہ فروغِ طور، جناب بدری کرشن فروغ نے اپنے جوان مرگ بیٹے کرتا کرشن کی

یاد میں تصنیف کی تھی جو آفتاب تجارت پریس دہلی سے فروری ۱۹۱۷ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۹۱۶ء ہے۔ مصنف نے تاریخِ اختتام خود موزوں کی ہے

میں نے بھی غرض یہ سال اس کا ہے نورِ فروغ طور، لکھا

فروغ صاحب سکندرآباد کے رئیس تھے لیکن دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ یہاں انھیں سکون کی دولت اور فراغت کی نعمت حاصل تھی اور بیشتر وقت شعری و ادبی مشاغل میں گزرتا تھا لیکن اچانک جوان بیٹے کی ناگہاں موت سے ان پر غم و اندوہ کا کوہِ گراں ٹوٹ پڑا۔

غافل تھا میں جورِ آسماں سے بے فکر تھا حالتِ جہاں سے
دنیا سے نہ تھا مجھے سروکار آزاد تھا مثل سروِ گلزار
جز شعر و سخن نہ کچھ رہا کام گردش تھی فلک کی گردشِ جام
کرتا کرشن اپنا تھا جو فرزند خوش سیرت و نوجواں خردمند
دنیا سے گیا وہ ہائے افسوس اس درد سے کیوں نہ آئے افسوس

کرتا کرشن ۲۴ر جون ۱۹۱۵ء کو ہیضہ کی جان لیوا بیماری میں بیکنٹھ باشی ہوئے۔ وہ شادی شدہ تھے ۳۰ برس کی عمر میں جوانمرگ ہوئے۔ فروغ کے ہمعصروں نے ان کے سانحۂ ارتحال پر دلگداز مرثیے لکھے۔ فروغ صاحب بھی فرزندِ معنوی کے ماتم میں جو خونِ جگر بہاتے تھے، اُسی کو صفحۂ قرطاس پر شعروں کے گہرہائے آبدار کی صورت میں پیش فرمایا:

جب خشک ہو خونِ دل سراسر موزوں ہوتا ہے مصرعۂ تر
تصویرِ خیال مضمحل ہیں یہ شعر نہیں ہیں سخت دل ہیں

''نورِنظر'' کی توجیہ فرماتے ہیں:

فرزند کی یاد میں لکھی ہے اس'' نورِنظر'' کی مثنوی ہے
ہو نورِ نظر جو نام اس کا ہر دل میں رہے مقام اس کا

یہ مختصر مثنوی فروغ نے اپنے نورِنظر کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی رکھنے کی غرض سے لکھی تھی۔ یہ کل ۲۲۳۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس تعداد میں وہ ۲۷۷ اشعار شامل نہیں ہیں جو فروغ صاحب کے مداحوں نے ان کی اور مثنوی کی تعریف میں بطورِ خراجِ تحسین موزوں کیے تھے۔ یہ مثنوی بحرِ خفیف میں لکھی گئی ہے۔

(۵) بزمِ فروغ

کنور بدری کرشن فروغ نے ۱۹۱۸ء میں مطبع مصطفائی دہلی سے اپنا کلیات شائع کیا۔ اس کے

دو حصے ہیں۔ حصہ اوّل فارسی کلام پر مشتمل ہے جس میں غزل، قصائد، قطعات اور رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔ پہلی غزل کا مطلع ہے:

گشتہ مالامال از لعل و گہر دامانِ ما بہترست از کان و دریا دیدۂ گریانِ ما

کلام سے سادگی، متانت اور سلاست نمایاں ہیں۔ قطعات تاریخ برجستہ اور برمحل کہے ہیں اور فنی لحاظ سے فکر کی پختگی کے غماز ہیں۔ قطعات کے علاوہ رباعیات بھی فارسی دیوان کی زینت ہیں۔ اس میں ''نوحۂ وفاتِ بینی کرشن'' کو بھی شامل کیا گیا ہے جو فروغ صاحب نے اپنے والد کنور بینی کرشن رئیس سکندرآباد ضلع بلندشہر کی وفات جنوری ۱۸۸۴ء پر کہا تھا۔

بزمِ فروغ کا دوسرا حصہ اردو کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں اردو غزلوں کی تعداد فارسی غزلوں سے زیادہ ہے۔ بیشتر غزلیں ایسی ہیں جو طرحی مشاعروں میں پڑھی گئی ہیں۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں

پلادے آج خلوت میں ہمیں اے یار تھوڑی سی
مزہ ہو نشہ میں ہوجائے گر تکرار تھوڑی سی
قیامت میں قیامت ہو بپا پھر ان کی ٹھوکر سے
دکھائیں حشر میں اپنی اگر رفتار تھوڑی سی
فروغ آئے گی صورت نوح کے طوفاں کی دنیا میں
اگر برسیں کہیں یہ دیدۂ خوں بار تھوڑی سی

بزمِ فروغ حصہ دوم میں غزلیات کے علاوہ قطعات، رقعات شادی، سہرے اور ایک مسدّس شامل ہیں۔

(۶) گوہرِ عرفانِ فروغ

یہ ہندو مذہب کی مقدس کتاب ''بھگوت گیتا'' کا منظوم فارسی ترجمہ ہے اور اِسے فروغ صاحب کی ادبی وشعری تخلیقات میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں عباسی پریس ترکمان دروازہ، دہلی سے شائع ہوئی۔

فروغ صاحب نے یہ کتاب ۶۴ برس کی عمر میں اس وقت تصنیف فرمائی جب ان کی پیرانہ سالی اور بیٹے کی ناگہاں موت کے غم نے ان کی کمر توڑ دی تھی اور قلبی سکون کا شیرازہ منتشر کردیا تھا۔ ''گوہرِ عرفانِ فروغ''، واقعی قابل صدرشک ہے۔ انھیں اپنے اس کارنامے پر خود بھی فخر تھا۔

بہ مضمونِ نادر کہ من گفتہ ام ہم از پارسی من سخن گفتہ ام
بہ جا ماند نامم چو اندر جہان از و خود شدم زندہ اندر جہان
بہ انجام ''گیتا'' نمودم تمام مئِ کامرانی در آمد بہ جام

شد اپریل آخر زِ آغازِ او   زِ تاریخِ او بست وہشتم بگو
بہ بستم نومبر شد این اختتام   بہ تعدادِ ابیات و سالِ تمام
بگویم بہ تو مصرعی یاد را   برادر زِ اشعار سالش شمار

یعنی ۲۸/اپریل ۱۹۱۸ء سے فروغ صاحب نے ''گوہرِ عرفانِ فروغ'' کے ترجمہ کا کام شروع کیا اور ۲۰/نومبر ۱۹۱۸ء کو پایۂ اختتام کو پہنچایا۔

ترجمہ سلیس، عام فہم اور رواں فارسی زبان میں کیا گیا ہے۔ ایک ایک شلوک کا ترجمہ دس دس شعروں میں کیا گیا ہے۔ گیتا اٹھارہ ابواب ۶۹۸/ اشلوک پر مشتمل ہے۔ اشلوکوں کا ترجمہ ۱۶۹۵/ اشعار میں کیا گیا ہے۔ آغاز، مدحِ شہنشاہ، سببِ تالیف، دیباچہ اور خاتمہ ۲۳۷/ اشعار میں محدود ہے۔ اس طرح ''گوہرِ عرفانِ فروغ'' میں کل اشعار کی تعداد ۱۹۳۲ ہو جاتی ہے۔

مذکورہ تصانیف کے علاوہ فروغ صاحب نے ''موجِ فروغ'' اور ''مجرّباتِ بدری کرشن'' بھی تصنیف کی ہیں۔ ''موجِ فروغ''، یعنی کایستھ اوتپتی میں کایستھ صاحبان کے مورثِ اعلیٰ سری چترگپت جی مہاراج اور ان کی شاخوں کا حال بالتفصیل، عام فہم، سلیس اور لطیف پیرایے میں نظم کیا گیا ہے۔ ''مجرّباتِ بدری کرشن'' میں فن فوٹوگرافی پر اپنے تجربات اور فنی معلومات اردو میں بیان کی ہیں۔

فروغ صاحب کی علمی و ادبی شخصیت گنگا جمنی تہذیب اور خلوص و محبت کا پیکر تھی۔ وہ دوست نواز، منکسر المزاج اور درد آشنا طبیعت کے بزرگ تھے۔ فارسی کے دلدادہ اور اردو کے عاشق زار تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں مشاہیر ہمعصر شعرا و ادبا کے اسمائے گرامی کثرت سے شامل تھے۔ جن میں لالہ سری رام مولف ''تذکرہ خمخانۂ جاوید''، نواب سراج الدین احمد خان سائلؔ دہلوی، چندی پرشاد شیداؔ دہلوی، پیارے لال رونقؔ دہلوی، بابو مہاراج بہادر برقؔ دہلوی، روشن لال جالبؔ دہلوی، منشی چندر بھان کیفیؔ دہلوی، منشی گوری شنکر قیصرؔ دہلوی تلمیذ حضرت ظہیرؔ دہلوی، منشی سعید الدین تسکینؔ دہلوی، آغا شاعر قزلباش، نواب شجاع الدین تاباںؔ، طالبؔ بنارسی، منشی رحمتؔ بلند شہری اور نوح ناروی وغیرہ سے انھیں خاص ربط تھا۔ ان میں سے اکثر شعرا ''انجمن اتحادِ سخن'' کے ماہانہ مشاعرے میں شرکت بھی کیا کرتے تھے جو دہلی میں ہر انگریزی مہینے کے آخری ہفتہ کو جناب کنور بدری کرشن فروغ صاحب کے دولت کدہ پر ہوتا تھا۔

فروغ صاحب کی سرپرستی میں آراستہ مجلسیں اور مشاعرے عہدِ ماضی کی تاریک یادوں کو روشن کرتے تھے۔ وہ دور دراز کے مشاعروں میں بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ آخر عمر میں جب کہ ضعف و ناتوانی کا ان پر پوری طرح غلبہ ہو چکا تھا، مشاعرہ نوازی کا یہ عالم تھا کہ بلند شہر جو سکندر آباد سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہے، وہاں کے مشاعروں میں تشریف لے جاتے اور اپنا کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کرتے۔

کنور بدری کرشن فروغ کو سلسلۂ غالبؔ کے شعرا میں اس لحاظ سے امتیاز حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کی اس ادبی ثقافتی روایت کے علمبردار اور روحِ رواں تھے، جس کی بنیاد امیر خسروؔ دہلوی نے رکھی تھی اور فیضیؔ نے جس کو وسعت بخشی اور غالبؔ نے مستحکم کیا۔ عمر کے آخری ایام اپنے آبائی وطن سکندر آباد میں گزارے اور یہیں ۱۹۲۲ء میں اپنے مکان کی دوسری منزل سے گر جانے سے ۷۱ برس کی عمر میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

☆☆☆☆☆

منابع و مآخذ:

۱۔ اردو کے ہندو مثنوی نگار، عطاء اللہ پالوی، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، ۲۰۱۲ء
۲۔ بزمِ فروغ (کلیاتِ اردو و فارسی)، مطبع مصطفائی، دہلی، ۱۹۱۸ء
۳۔ کمالِ دہلی (ماہوار ادبی رسالہ)، نیٹو امپیریل پریس، دہلی، جون۔ ۱۹۰۹ء
۴۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔، اپریل، ۱۹۱۱ء
۵۔ گوہرِ عرفانِ فروغ، عباسی پریس، دہلی، ۱۹۲۱ء
۶۔ مثنوی نورِ نظر، آفتابِ تجارت پریس، دہلی، ۱۹۱۷ء
۷۔ نوحۂ وفات و مسدس شہر آشوب، کنور بدری کرشن فروغ، نیٹو امپیریل پریس، دہلی، ۱۸۹۸ء

☆☆☆☆☆

Mohammad Asif
Research Scholar Dept. of Persian,
MANUU, Hyderabad -32,
Mob. 9949690285,
E-Mail: mohammadasifmau123@gmail.com

بہار کے تین قدیم مراکز اور سید قاسمؒ حاجی پوری کی صوفیانہ شاعری

(فارسی شاعری کے تناظر میں)

غلام اختر

حاجی پور صوبۂ بہار کے شمالی علاقے میں واقع ضلع ویشالی کا صدر مقام ہے۔ اس کی تاریخی، سیاسی اور تعلیمی حیثیت کو ظاہر کرنے سے پہلے بہار میں فارسی زبان وادب کے تاریخی خدوخال پیش کیے جاتے ہیں۔

یوں تو پورے ہندستان میں ہی فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت ترکوں اور افغانوں کی مرہون منت ہے، یہی وجہ ہے کہ قطب الدین ایبک سے لے کر سکندر لودی تک اکثر بادشاہوں نے اپنے دربار کی نگرانی میں مالی اعانت سے فارسی زبان میں تاریخیں مرتب کیں، جو ہمارے لیے معلومات کے جواہر پارے ہیں۔ لیکن اس باب میں حاجی پور کا بھی اپنا مقام رہا ہے اور یہ مقام اسے سید قاسم حاجی پوری کی بدولت میسر ہوا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

سلطانوں نے عام لوگوں کی تعلیم وتربیت کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔ اولیائے کرام نے فی سبیل اللہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر عائد کر رکھی تھی۔ چنانچہ صوفیہ کی خانقاہوں میں عربی وفارسی کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ہر خانقاہ کے ساتھ ایک مسجد اور ایک مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ مدرسے میں جو پڑھایا جاتا اسے مسجد میں عملی شکل دی جاتی جس کی زبان فارسی ہوا کرتی تھی۔ گویا فارسی زبان ہندستان میں انھیں نفوس قدسیہ کی علمی تگ ودو کے نتیجے میں پھیلی۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اس زبان کو حکومت کا بھی سہارا ملا۔ وہ بزرگان دین فارسی کو ہی ذریعۂ تبلیغ بنائے ہوئے تھے۔ ہاں کبھی کبھی صوبۂ بہار کی پوربی بھاشاؤں یا کھڑی بولی کا بھی سہارا لے لیا کرتے تھے۔ اگر صوبۂ بہار میں فارسی ادب وشاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ہماری یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گی کہ یہاں بھی انھیں اولیائے کرام کی کاوشیں رنگ لائی ہیں۔

طبقات ناصری کے حوالے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۹۹ء میں محمد بختیار خلجی نے بہار کو فتح کیا اور یہاں مساجد و دارالعلوم قائم کیے۔ بادشاہوں کی اس روش کو زندہ رکھتے ہوئے خلجی حکمرانوں کے امیروں نے بھی مدرسے، مساجد اور خانقاہیں قائم کیں۔ لیکن فارسی زبان و ادب کو فروغ اولیائے کرام کے ہاتھوں نصیب ہوا جو مذہبیات کے ساتھ علم وادب کی دوسری اصناف پر بھی عبور رکھتے تھے۔ فارسی شعر وادب کے مراکز کی حیثیت سے پورے بہار سطح پر (۱) بہار شریف اور اس کے مضافات میں منیر، باڑھ (راجگیر)، (۲) شمالی بہار میں حاجی پور (جو ابھی ویشالی ضلع کا صدر مقام ہے) (۳) اور بھاگلپور کلیدی کردار نبھا رہے تھے۔

☆ پہلا مرکز: بہار شریف

اس سلسلے کی کڑیوں میں ایک اہم اور مرکزی کڑی بہار شریف تھا جو دراصل شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات سے پہچانا جاتا ہے۔ شیخ شرف الدین احمد پٹنہ کے منیر گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مخدوم یحیٰ منیری اپنے وقت کے معروف صوفی بزرگ تھے۔ ان کی والدہ محترمہ بھی تصوف میں بلند مقام رکھتی تھیں۔ شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کو علوم اسلامی کے علاوہ حکمت، شاعری، منطق اور فلسفہ میں بھی مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے مزید تعلیم دہلی کے بزرگ صوفی شیخ نجم الدین فردوسیؒ سے حاصل کی تھی۔ انھوں نے سولہ کتابیں تصنیف فرمائیں جن کا ذکر اکبر بادشاہ کے درباری فارسی عالم ابوالفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں کیا ہے۔ شیخ شرف الدین کے خاندان کے دوسرے بزرگ حضرت احمد چرم پوش تھے، جو صوفی بزرگ ہونے کے ساتھ فلسفی اور شاعر بھی تھے۔ چمڑے کا لباس پہننے کی وجہ سے چرم پوش کہلاتے تھے، فارسی میں ان کا دیوان ہے۔ انتقال غالباً ۱۳۶۴ء میں ہوا۔

اسی زمانے کے ایک بزرگ حضرت مظفر شمس بلخی بھی تھے جو بلخ میں پیدا ہوئے لیکن تعلیم وتربیت سے فارغ ہوکر بہار آکر شیخ شرف الدین احمد سے شرف تلمذ حاصل کیا، بعد میں دہلی آکر مدرسہ فیروز شاہی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی وفات ۱۳۸۶ء میں ہوئی۔

شیخ شرف الدین احمد کے شاگردوں میں ایک معتبر نام شیخ حسین عرف ''نوشۂ توحید'' کا بھی آتا ہے۔ انھوں نے فارسی میں مثنوی لکھی۔ عربی زبان میں فلسفہ وحدۃ الوجود پر ایک کتاب بنام ''حضرت الخمس''، تصنیف کی جس کا ترجمہ بعد میں ان کے لڑکے شیخ حسن نے فارسی زبان میں ''کاشف الاسرار'' کے نام سے کیا۔ یہ کتاب ۱۸۹۶ء میں منظر عام پر آئی۔ بہار شریف اس لیے بھی تعلیم وتمدن کا گہوارہ تھا کہ یہ ایک بڑے عالم شمس الحق بڈھ حقانی کا مولد ومسکن تھا۔

بہار شریف میں ایک اور بزرگ شیخ احمد لنگر دریا کے نام سے ملتے ہیں جو تصوف میں اعلیٰ درجے کے حامل ہیں، انھوں نے ایک کتاب بنام ''مونس القلوب'' تحریر فرمائی جو دراصل ملفوظات ومکتوبات کے طرز واسلوب پر لکھی گئی ہے۔ ان بزرگوں کے علاوہ بہار میں فارسی اور عربی زبان وادب کے دوسرے شعرا وادبا کا بھی سراغ ملتا ہے جن میں ''مناقب الاصفیاء'' کے مصنف شعیب، فارسی لغت ''شرف نامہ'' کے مولف ابراہیم قیام فاروقی اور ''مفتاح الفیض'' کے تخلیق کار شیخ حسن حطامیؒ سرفہرست ہیں۔

☆ دوسرا مرکز: حاجی پور

اس دور میں علم وادب کا دوسرا مرکز حاجی پور کو تسلیم کیا جاتا تھا جو دراصل دینی وعلمی مرکز حسن پور عشری کی شاخ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی اہمیت اس باوقار ومتبحر عالم میر ملک فتح اللہ (ابن بایزید بسطامی) کی موجودگی نے

اتنی بڑھا دی تھی کہ پورے ملک سے طلبا کا جم غفیر اپنی علمی تشنگی بجھانے یہاں آیا کرتا تھا، یہاں تک کہ دہلی جو ملک کا اہم ترین مرکز تھا وہاں سے بھی طلبا حاجی پور آیا کرتے تھے۔

حاجی پور کے تاریخی خدوخال:

حاجی پور دراصل اپنے نام کے اندر ہی اپنی وجہ تسمیہ اور ضمناً تاریخ پیدائش کے ساتھ سیاسی و تاریخی اشارات چھپائے ہوئے ہے۔ بات یہ ہے کہ بنگال کے سلطان شمس الدین عرف حاجی الیاس (دور حکومت ۱۳۴۵ء تا ۱۳۵۸ء) نے دو شہر اپنے نام پر بسایا تھا، ایک حاجی پور اور دوسرا شمس الدین پور۔ حاجی پور تو اب تک حاجی پور ہی کے نام سے مشہور ہے، یہ اور بات ہے کہ ایک خاص فرقے کے لوگوں نے حال ہی میں بڑی تیز سیاسی کوشش کی کہ اس کا نام حاجی پور سے بدل کر ہری پور رکھ دیا جائے لیکن ان کی کوششیں ناکام ہوئیں اور شہر مذکور علیٰ حالہ حاجی پور ہی کے نام سے ہے۔ لیکن شمس الدین پور بعد میں بدل کر سمستی پور ہو گیا جو ابھی بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ بہر حال حاجی پور میں سلطان مذکور نے دریائے گنڈک کے کنارے ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا جو رقبہ ۳۶۰ (تین سو ساٹھ) بیگھہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اس قلعے کے اندر ایک جامع مسجد بھی تھی۔ اس مسجد کے دروازے پر ایک کتبہ اکبر بادشاہ کے دور میں ۱۵۷۸ء میں نصب کرایا گیا تھا۔ حاجی الیاس کا مقبرہ سونپور پل کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔

شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ہمایوں جب ضلع سارن کے راستے بھاگ رہا تھا تو شہر حاجی پور میں اس کی ملاقات سید حسن دانشمند (شاگرد و داماد میر ملک فتح اللہ بن بایزید بسطامی) سے ہوئی، ان سے دعا کی درخواست کی تو انھوں نے اسے شیر شاہ سوری پر ترجیح دے کر دعا کی، پھر جب دوبارہ اس نے حملہ کیا تو فتح یاب ہو کر ہندستان کا بادشاہ بنا اور اس نے بزرگ موصوف کو مدد معاش کے طور پر حسن پور عشری (سارن) اور حاجی پور میں مینا پور کی جاگیریں نذر کیں۔ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے اپنی کتاب ''ہمایوں نامہ'' میں لکھا ہے کہ ہمایوں واپس ہوتے ہوئے حاجی پور سے گزرا تھا جب کہ گنگا کے دوسری طرف شیر شاہ اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔

حاجی پور کی تعلیمی وتہذیبی حیثیت:

جیسا کہ ماقبل میں یہ وضاحت گزر چکی ہے کہ حاجی پور میں میر ملک فتح اللہ (ابن بایزید بسطامی) کا مدرسہ قائم تھا جسے علمی مرکزیت حاصل تھی۔ میر ملک فتح اللہ سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد و اخلاف میں سے تھے، جس کا بیان خادم حسین نے اپنی کتاب ''تذکرہ تاج العلما مع رحلت نامہ'' میں کچھ اس طرح کیا ہے:

''مخدوم سید فتح اللہ عرف میر ملک کہ اکابر کبار آن دیار از فرزندان سلطان عارفین بایزید بسطامیؒ بودند، درخواست نسبت آنحضرت با بنت خود نمودند۔ آنجناب بہ موجب انس الٰہی و حدیث رسالت پناہی ایجاب کردہ عقد شرعی بہ عمل آوردند۔''

میرٹھ سے ہجرت کر کے سید حسن دانشمند میر ملک فتح اللہ کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے آئے۔ میر ملک نے اپنی شاگردی میں قبول کیا۔ دور طالب علمی میں سید حسن سے کچھ خارق عادات کرامتیں صادر ہوئیں جنھیں میر ملک کی کنیز نے دیکھ کر میر ملک سے کہہ دیا۔ وہ یہ کہ رات کو سید حسن دانشمند اپنے سامنے چراغ رکھ کر بیٹھے ہیں، جب غنودگی طاری ہوتی ہے اور ان کا سر جھکتا ہے تو چراغدان خود بخود پیچھے کی جانب ہٹ جاتا ہے اور جب سر پیچھے کی جانب آتا ہے تو چراغ پھر اپنی جگہ پر آجاتا ہے۔ میر ملک نے ان کی کرامت و احوال و کوائف کو اچھی طرح بھانپ لیا اور انھیں یقین ہو گیا کہ یہ اپنے وقت کا ولی کامل ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی لڑکی سے شادی کی پیش کش رکھی۔ سید حسن نے معذرت کر لی اس لیے کہ وہ شادی شدہ تھے اور ایک بچی بھی تھی۔ لیکن میر ملک کا اصرار بڑھتا گیا بہر حال بات یہ طے ہوئی کہ صبح مراقبے کے بعد جو منکشف ہوگا اسی پر عمل ہوگا۔ صبح کو مراقبے کے بعد حکم خداوندی سے سید حسن کی بیوی و بچی فوت ہو گئیں۔ اس کے بعد سید حسن نے میر ملک (ابن بایزید بسطامیؒ) کی بیٹی سے شادی فرمائی۔ شادی کے بعد سید حسن یہیں حاجی پور میں ہی رہ گئے۔ اسی کے بعد ہمایوں کے حق میں دعا کرنے کا واقعہ پیش آیا۔ سید حسن کا انتقال ۹۴۵ھ میں حسن پور عشری میں ہوا اور وہیں ان کا مزار بھی ہے۔ ان کی پانچ اولاد ہوئیں جن میں سے دو سید چندن اور سید عبد الرزاق لاولد فوت ہوئے۔ باقی تین لڑکے (۱) سید احمد (۲) سید مبارک (۳) سید حسین بڑی عمر پائے۔ سید حسن کی تاریخ وفات پر خادم حسین نے اس طرح قطعہ لکھا ہے:

بود شاہی بہ کشور دانش — میر سید شدہ بہ دار فنا
خردم سفت درّ تاریخش — واصل حق شدہ سر علما

سید حسن دانشمند کے تین لڑکوں میں سید مبارک حسن پور عشری میں سکونت پذیر رہے۔ سید حسین بھاگلپور چلے گئے، جب کہ سید احمد اپنے والد سے رخصت کی اجازت لے کر سیاحت کے لیے نکلے اور سفر کے دوران بزرگان دین سے اکتساب فیض کرتے رہے۔ اخیر میں مینا پور حاجی پور تشریف لائے اور انھوں نے یہیں ۹۷۲ھ میں انتقال فرمایا۔ تاریخ وفات ''مشتاق لقا'' سے نکلتی ہے۔

سید حسن دانشمند کے لڑکوں میں بڑی عمر پانے والے مذکورہ تین لڑکوں میں تیسرے لڑکے سید احمد ہیں، جو پیر دمڑیا سے مشہور ہوئے۔ اس کی وجہ خادم حسین یہ بیان کرتے ہیں کہ سید احمد اپنے مریدوں سے نذرانے کے طور پر صرف ایک دمڑی قبول فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کا ایک تاجر مرید سمندری سفر کر رہا تھا کہ اچانک اس کا جہاز سمندر میں ڈوبنے لگا تبھی اس نے اپنے پیر سے استمداد کیا اور منت کر لی کہ نصف مال بارگاہ میں پیش کروں گا۔ ادھر سید احمد عین محفل میں مراقبے میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد اپنی تر آستین باہر نکالی مریدوں کے اصرار پر انھوں نے تاجر کے ڈوبنے اور نجات پانے کا واقعہ بتایا۔ جب ان کا تاجر مرید نصف مال لے کر بارگاہ میں حاضر ہوا تو انھوں نے اس میں سے صرف ایک دمڑی قبول فرمایا تبھی سے پیر دمڑیا کے نام سے مشہور ہو گئے۔

سید احمد کے تین لڑکے ہوئے۔(۱) سید محی الدین عرف امیر بڑھ، یہ بیعت وخلافت کے بعد حسن پور عشری میں اپنے چچا سید مبارک کے ساتھ دادا کے سجادہ نشین ہوئے۔انتقال ۱۱ر محرم ۱۰۱۲ھ میں ہوا۔(۲) سید قاسم حاجی پوری کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔(۳) مخدوم سید محمد عرف پیر دمڑیا ثانی، انھیں پیر دمڑیا ثانی کا خطاب اپنے والد بزرگوار سے ملاتھا۔اس کی وجہ یہ رہی کہ دورطالب علمی میں پڑھائی سے فراغت پا کر عصر کے بعد طلبا کے ساتھ چہل قدمی کو جایا کرتے تھے۔ایک دن ایک کبیر نامی آدمی کی ککڑیوں کے کھیت پر پہنچ کر فرمایا ہمیں ککڑی خریدنا چاہیے۔اس پر مالک زمین کبیر نے عرض کیا ''اس سال ساری ککڑیاں تلخ نکل آئیں۔'' حضرت نے اسی وقت پانی منگوایا، وضوکیا اور دورکعت نماز نفل پڑھی اور کہا اللہ کی قدرت سے ساری ککڑیاں شیریں ہو جائیں گی۔اسی وقت زمین مالک نے ایک ککڑی توڑ کر چکھا تو شیریں تھی۔اس نے ساری ککڑیاں فروخت کر کے روپے نذرانے کی صورت میں حضرت کی خدمت میں پیش کیے تو آپ نے صرف ایک دمڑی قبول فرمائی اور کہا کہ میں نے اپنے والد کی سنت ادا کی ہے۔بعد میں ان کے اندر اپنے والد کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے۔والد سے بیعت وخلافت کے بعد سیر وسیاحت کی اجازت لے کر نکلے اور راجگیر میں مراقبے کی حالت میں شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری سے روحانی فیض حاصل کیے اور انھیں کے حکم پر پٹنہ شہر کے باہر سملی محلہ میں قیام پذیر ہو گئے۔اسی محلے کا نام آگے چل کر پیر دمڑیا محلہ ہو گیا۔آپ کا وصال اسی محلہ میں ۲۵ر ربیع الاول ۱۰۲۴ھ میں ہوا اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔قطعۂ تاریخ وفات ہے:

طایر روحش از جہان فانی   بہ جنان کرد بال افشانی
تاج سر ہای زاہدان برخاست   از جہان شد محمد ثانی

مخدوم سید قاسم حاجی پوری:

مخدوم سید قاسم حاجی پوری کا تخلص قاسم اور لقب صدرالدین، جمال الدین، زبدۃ النقبا، محمود العقبیٰ اور مقتدیٰ اعظم تھا۔ان کے والد سید احمد پیر دمڑیا اور جد اعلیٰ سید حسن دانشمند تھے اور میر ملک فتح اللہ جو بایزید بسطامی کے شہزادے ہیں، ان کے والد سید احمد پیر دمڑیا کے نانا ہیں۔اس طرح سید قاسم حاجی پوری بہ واسطۂ والد بایزید بسطامی کے پرنواسے ہوئے۔انھیں اپنے والد سے بیعت وخلافت حاصل ہوئی اور والد کے انتقال کے بعد خانقاہ مینا پور حاجی پور (ویشالی بہار) کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔انھوں نے چار شادیاں کیں اور ان سے کل نو لڑکے اور سات لڑکیاں ہوئیں۔ان کے لڑکوں میں ایک لڑکا سید عبدالوہاب عرف سید حاجی جہانگیر بادشاہ کا صوبہ دار و پنج ہزاری پنج سوار تھا۔سید قاسم حاجی پوری تصوف میں اعلیٰ درک رکھنے کے ساتھ فارسی شاعری میں ایسا مقام رکھتے تھے کہ ان کے ہم عصروں میں کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا، نیز روحانی عظمت وجلال کی یہ شان تھی کہ ایک روز آپ صبح خواب سے بیدار ہوئے۔آپ کے حجرے کے باہر ایک وسیع وعریض میدان واقع تھا، جس میں ایک حلوائی اپنی

گائے چرا رہا تھا اور وہ آپ ہی کی طرف چلا آرہا تھا۔آپ نے جوں ہی ادھر نظر اٹھائی حلوائی اپنی گائے سمیت خاک کا ڈھیر ہو گیا۔اس کے بعد جب بھی خواب سے بیدار ہوتے تو کسی آدمی کو دیکھنے سے پہلے ہری گھاس پر نظر کر لیتے، گھاس جل کر راکھ ہو جاتی پھر کسی کی طرف نظر فرماتے۔ان کی ہیبت وجلال سے خدام ہمیشہ سہمے سہمے رہتے۔ان کی نظر میں یہ جلال رات بھر دیدار الٰہی کی بدولت آگیا تھا۔

غزلیات قاسم پر ایک طائرانہ نظر

سید قاسم کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے دیہاتوں تک اسلام پھیلایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے فارسی کلام میں جا بجا خوف وخشیت، گناہوں پر شرمساری، شفاعت اور عشق رسول جیسے مضامین ملتے ہیں۔مثال ملاحظہ فرمائیں:

گنہگارم تو یی آمرزگارم   امید عفو دارم با معانی

کلمۂ شہادت کی اہمیت وافضلیت بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہیں:

یک بار کلمۂ تو بہ اخلاص ہر کہ گفت   شد محو آنچہ کردہ ہمہ عمر خود گناہ

شعر مذکور کو ایک حدیث ( ) کی طرف تلمیح بھی کہا جا سکتا ہے۔سید قاسم حاجی پوریؒ کے نعتیہ اشعار پڑھنے کے بعد ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ساتھ ہی ان کی قادرالکلامی کا خاصا ادراک ہوتا ہے۔نعت کا یہ شعر دیکھیے اور عش عش کیجیے:

ہمچو صفات ذات ترا ہیچ کس ندید   بی مثل آفریدہ ترا در جہان اللہ

شعر مذکور سے مترشح مفہوم کی بابت اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ دراصل حدیث کے مفہوم سے مستعار ہے، یا پھر قاسم نے حسّان بن ثابت کے ذیل کے ان دو اشعار کے مفہوم مستعار لیے ہیں:

ترجمہ: اے محبوب! تجھ سے خوبصورت شخص کو میری نظر نے کبھی نہیں دیکھا، بلکہ تجھ سے خوبصورت بچہ کسی عورت نے جنا ہی نہیں۔تو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے، گویا تو ایسا پیدا کیا گیا جیسا تو چاہتا تھا۔

قاسم ایک عارف باللہ شاعر ہیں جو اپنی شاعری عشق مجازی سے شروع کرتے ہیں لیکن ختم عشق حقیقی پر کرتے ہیں۔یا یوں کہیے کہ عشق مجازی کو عشق حقیقی تک پہنچنے کا زینہ تصور کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو:

زاہد بنگر رخ خوبان   راز دیدار حق درین باشد
جلوۂ دیدار خدا قاسما   ہست درین ملک ز خوبان طلب

قاسمؒ نے اپنی شاعری میں مشکل اور منجمد الفاظ کے بجائے آسان اور عام بول چال کے الفاظ استعمال

کیے ہیں۔بلکہ کہیں کہیں ہندستانی زبان کا استعمال بھی ملتا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قاسمؔ زبان کے اندر تجدیدکاری و وضع داری کو نہ صرف یہ کہ روا مانتے ہیں بلکہ اس کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو:

نگاران لاہور و خوبان دہلی — بہ دل کردہ بودند پیوند جانم
فشاند یکی در بغل یاسمینم — نہاند یکی در دہان برگ پانم

مذکورہ بالا اشعار میں ’’برگ پانم‘‘ کی ترکیب نہایت خوب و موزوں ہے، ساتھ ہی ہندستانی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے کہ فارسی شاعری ہوتے ہوئے بھی ہندستانی زبان سے مستفیض ہے۔اسی طرح طالب آملی نے ’’پان‘‘ کا استعمال اپنی فارسی شاعری میں کیا ہے۔بقول صاحب شعرالعجم (شبلی نعمانی) ’’عرفی عمر بھر ہندستان میں رہا اور ایک ہندستانی لفظ ’’جھگڑا‘‘ بطور فارسی استعمال کرتا رہا‘‘۔اس طرح کی مزید جھلکیاں قاسمؔ کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں، جنھیں مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ فرمائیں:

ز حسن شستۂ دھوبی چہ گویم — ازان بی پردہ محبوبی چہ گویم
غرور حسن با جہل پٹھانی — چو گردد جمع نتوان زندگانی
بتان راجپوت و شیخ زادہ — شکیب عاشقان برباد را دہ

مذکورہ بالا اشعار میں استعمال لفظ دھوبی، پٹھان، راجپوت اور شیخ زادہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سید قاسمؔ نے اپنی شاعری میں ہندستان میں مروج اسلامی اور غیر اسلامی برادری کا ذکر کرکے دراصل ہندستانی سماج کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔اتنے ہی پر بس نہیں بلکہ غزلیات قاسم میں دنیا کے مختلف ملکوں اور شہروں کے نام کا ذکر ملتا ہے، جس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ قاسمؔ کی نظر پوری دنیا پر تھی اور وہ ایک صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوررس مفکر بھی تھے۔

اسی طرح نعت رسول میں بھی عشق و محبت کے جواہر پارے ان کے مجموعہ کلام میں بکھرے ہوئے ہیں جنھیں اس مختصر مقالے میں سمیٹنا ممکن نہیں۔قارئین کو ان کے اس شعر سے ان کے نظریات اور عقیدت و محبت کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔ملاحظہ ہو:

قاسما شد غلام شاہ عرب — زان سعید است ہمچو سعد و معاذ

شعر میں مذکور سعد و معاذ دو صحابی کے نام ہیں ایک سعد ابن ابی وقاص ہیں اور دوسرے معاذ ابن جبل جن کا نام بڑے جلیل القدر صحابہ میں آتا ہے۔حاصل یہ کہ سید قاسم حاجی پوری نے اپنی تبلیغی خدمات اور فارسی شاعری کے ذریعے خاص طور سے ضلع ویشالی اور زبان فارسی پر جو احسان کیا ہے اس سے ضلع مذکور بشمول فارسی ادب کبھی اپنی گردن ہلکی نہیں کرسکتا۔غزلیات قاسمؔ کے مطالعے کے بعد سید قاسم حاجی پوری کے لیے حافظؔ کا یہ شعر ذہن کے پردے پر بار بار ابھر کر آتا ہے۔

حاصل عمر نثار رہ یاری کردم — شادم از زندگی خویش کہ کاری کردم

☆ تیسرا مرکز: بھاگلپور

بھاگلپور میں بھی میر ملک فتح اللہ اور سید حسن دانشمند ہی کا علمی، ادبی اور تبلیغی فیضان جاری ہوا۔وہ اس طرح کہ سید حسین ولد سید حسن دانشمند بھاگلپور چلے گئے تھے اور وہاں اپنی خاندانی وراثت میں ملے علم سے لوگوں کو خوب فیضیاب کیا۔ان کا خاندانی علمی سرمایہ جو خلیفہ باغ کی لائبریری میں محفوظ ہے، آج بھی ہمیں دعوت مطالعہ دیتا ہے۔اس علمی و ادبی کارواں کو آگے بڑھانے میں سلسلۂ شہبازیہ کے بزرگوں کا بھی بڑا اہم رول رہا ہے۔

نوٹ:

اس مقالے میں ’’سید قاسم حاجی پوری ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ مع غزلیات قاسم‘‘ مرتبہ ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری (شائع کردہ دی آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ ۱۹۷۷ء) سے خصوصی مدد لی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

Ghulam Akhtar *(Research Scholar),*
Room No. 008-E Mahanadi Hostel,
Jawaharlal Nehru University,
New Delhi 110067, Mob.9958602553,
E-Mail: gavaishalwi@gmail.com

سہ ماہی فیضان ادب

کا اگلا شمارہ پروفیسر نیر مسعود کی حیات و خدمات پر مشتمل ہوگا۔موصوف ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ بیک وقت محقق، ناقد، ادیب، انشاپرداز اور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ لکھنوی تہذیب و تمدن کے چشم و چراغ تھے۔جن حضرات کے پاس ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین/تخلیقات اور خطوط وغیرہ محفوظ ہوں، ان کی کاپی بھیجنے کی زحمت فرمائیں۔ادارہ شکریے کے ساتھ انھیں شائع کرے گا۔نیز قلم کاروں سے بھی گزارش ہے کہ موصوف کی حیات و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل مقالات ارسال فرمائیں تاکہ ادارہ ان کے شایان شان خصوصی شمارہ پیش کرسکے۔

مدینۃ الاولیا بدایوں اور چند اصفیا

مناظر حق بدایونی

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر غلطاں تہہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

زمانۂ قدیم سے شہر بدایوں کو امتیازی شان حاصل رہی ہے۔ہندوستان کے دیگر مقدس مقامات کی طرح یہ شہر بھی ایک متبرک جگہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہاں بے شمار صوفیہ، شعرا اور بزرگان دین آرام فرمارہے ہیں اور اہل اللہ کا مسکن و ماویٰ رہا ہے۔ یہ شہر صوبۂ اتر پردیش کا ایک مغربی علاقہ ہے جو زرخیز ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا دلکش و جاذب ہے۔ ہر دور اور ہر زمانہ میں اس کی مٹی سونا اگلتی رہی ہے اور اس کی خاموش فضا میں علم و ادب، فکر و شعور، عشق و وفا اور کیف و طرب کے ان گنت نغمے بکھرتے رہے ہیں۔ ہفت روزہ اخبار ذوالقرنین بدایوں مطبوعہ ۱۹۵۶ء میں پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ جو لوگ عزت و شہرت کے خواہش مند ہوتے تھے وہ دہلی اور لاہور میں رک جاتے تھے اور جو لوگ گوشۂ عافیت چاہتے تھے بدایوں کا رخ کرتے تھے۔جس کے باعث بدایوں علم و فضل کا مرکز بن گیا تھا اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ کہلاتا تھا۔اسی خوبی اور کمال نے اسے مدینۃ الاولیا اور قبۃ الاسلام ہونے کا شرف عطا کیا۔

سرزمین بدایوں پر دور دراز سے صاحب علم و فضل، ارباب کمال، اور اہل دل تشریف لائے۔اولیائے عظام یہاں کثرت سے مدفون ہیں جنھوں نے اپنے خون جگر سے باغ اسلام کی آبیاری فرمائی اور یہاں ابدی نیند سو رہے ہیں جنھیں پیران بدایوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں پر ان صوفیہ کا ذکر کیا جارہا ہے جن کی یا تو زیارت گاہیں یہاں مرجع خلائق ہیں یا انھوں نے اسے اپنا کارزار بنایا اور وہ اپنی حیات ابدی سے آج تک اور رہتی دنیا تک عوام الناس کو فیض پہنچاتے رہیں گے۔

۱۔حضرت سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ: اصل نام سید سالار مسعود غازی تھا۔اہل بدایوں آپ کو بالے میاں کہتے ہیں۔والد کا نام سالار ساہو تھا۔سلطان محمود غزنوی کے ہمشیر زادہ تھے اور سلسلۂ نسب امیر المسلمین حضرت مولا علی کرّم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔اباو اجداد غزنی سے تعلق رکھتے تھے مگر آپ کی پیدائش اجمیر میں ۴۰۹ھ کو ہوئی اور وہیں نشو نما پائی۔سید ملک آدم غازی کی سرپرستی میں علوم دین و دنیا کی تعلیم حاصل کی۔علم تجوید قرآن اور فن سپہ گری حضرت خواجہ سید عبداللہ غزنوی سے سیکھا۔ظاہری باطنی اشغال میں ہمہ اوقات مصروف رہتے تھے۔جہاد کا شوق بچپن سے ہی دامن گیر تھا۔ہوش سنبھالتے ہی جنگ و جدال میں مصروف رہنے

لگے۔اپنے ماموں محمود غزنوی کے ہمراہ متعدد مرتبہ جنگ میں شریک ہوئے اور سومناتھ کی مہم میں بھی وہ سلطان کی سپاہ میں موجود تھے۔ ۴۲۱ھ میں ایک لشکر کے ہمراہ پندرہ سال کی عمر میں بدایوں تشریف لائے اور وہاں کے راجا چندر پال کو شکست دے کر بدایوں کے قلعے پر قبضہ کیا۔بدایوں کی مہم سے فراغت کے بعد بہرائچ پہنچے اور ۱۴رجب ۴۲۴ھ میں جام شہادت نوش فرمایا۔مزار شریف بمقام بہرائچ، شہر سے تقریباً تین کیلومیٹر دور وسیع اور خوشنما درگاہ کے اندر پختہ واقع ہے۔ ۱۴رجب کو ہر سال نہایت تزک و احتشام کے ساتھ عرس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جیٹھ کے پہلے اتوار کو ہر سال ایک میلہ بھی لگتا ہے جس میں دور دراز سے حاجت مند آکر شریک ہوتے ہیں۔آپ کی کرامتیں اکثر ظہور میں آتی رہتی ہیں۔بیمار آپ کی درگاہ کی زیارت کے لیے آکر غسالہ میں نہاتے ہیں اور بعض خدا کے حکم سے صحت یاب ہوکر جاتے ہیں۔

۲۔خواجہ سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ: خواجہ سید عبداللہ نام میر ملہم لقب اور میراں جی کے نام سے مشہور ہیں۔آپ کی پیدائش غزنی میں ہوئی اور وہیں تعلیم و تربیت اور نشو نما پائی۔وہ حسینی سید تھے اور حضرت شیخ عبدالرحمان محمد کے مرید ہوکر خرقہ خلافت حاصل کیا۔غزنی کے معزز اور برگزیدہ لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔علم تجوید قرآن میں قدرت حاصل تھی اور فن سپہ گری میں یکتائے زمانہ تھے۔جہاد کا شوق رکھتے تھے اس لیے سلطان محمود غزنوی کی سپاہ میں شامل ہوکر متعدد معرکوں میں اپنی شیر دلی اور بہادری کے جوہر دکھائے۔کارہائے نمایاں کے عوض آپ کو سپہ سالار کا منصب عطا کیا گیا۔ایک مرتبہ سلطان کی ہمشیرہ کو ان کے شوہر کے پاس پہچانے کے لیے غزنی سے اجمیر تشریف لائے اور کافی مدت تک وہاں قیام پذیر رہے۔نماز فجر کے بعد مراقبہ کرتے تھے، ایک روز مراقبہ کی حالت میں منکشف ہوا کہ قنوج جانے والے سلطانی لشکر کے چوپائے باربرداری بدایوں میں روک لیے گے ہیں، اسی وقت مراقبہ سے سر اٹھایا اور چند بہادر اور کارآزمودہ مجاہدین کو ساتھ لے کر اجمیر سے بدایوں کی طرف روانہ ہوگئے اور ایک مشکل سفر کے بعد ۴۰۹ھ میں بدایوں پہنچے اور راجا چندر پال کے سپاہیوں کے ساتھ دلیری سے جنگ کرتے ہوئے مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

صاحب تصرف اور صاحب کرامت ہیں۔مزار شریف اندرون شہر شمال کی جانب ایک شاندار درگاہ کے اندر واقع ہے۔آپ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔کوئی بھی پریشاں حال اور ضرورت مند محروم اور مایوس نہیں جاتا۔ کرامات اکثر ظہور میں آتی رہتی ہیں لیکن سب سے زیادہ مشہور واقعہ ایک بھورجی کی لڑکی کا ہے جو محمد تغلق کے عہد میں ہر جمعرات چراغ روشن کرنے کے لیے آپ کے مزار پر آتی تھی۔ایک مرتبہ کہیں سے شیر آگیا اور اس نے لڑکی پر حملہ کردیا۔لڑکی اسی وقت آپ کا نام لے کر چلائی اور شیر اسی وقت خدا کے حکم سے پتھر کا ہوگیا۔

۳۔حضرت میراں ابراہیم ممن دار رحمۃ اللہ علیہ: سید ابراہیم نام تھا اور میراں صاحب ولی مشہور ہیں۔سلطان محمود غزنوی کے سپاہ میں ممن دار تھے۔تیر اندازی اور سپہ گری کے فن میں آپ کا کوئی ثانی

نہیں تھا۔آواز پر تیر چلاتے تھے اور نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا تھا۔صاحب علم وعمل تھے۔حضرت سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ بہ نیت جہاد ہندوستان تشریف لائے اور ۴۲۱ھ میں بدایوں کے قصبۂ سہسوان میں جام شہادت نوش فرمایا۔سہسوان کے شاہ شہدا کہلاتے ہیں۔صاحب فیض وصاحب کرامت ہیں۔آپ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔پنج شنبہ کو لوگوں کا کافی ہجوم رہتا ہے۔مزار شریف قصبۂ سہسوان کی آبادی سے کچھ دور وسیع درگاہ کے اندر بلند و پختہ واقع ہے۔مزار کے نزدیک ہی آپ کے گھوڑے کا مدفن ہے۔جنوب کی جانب بادشاہ جہانگیر کے وزیر کی قبر ہے جس نے درگاہ تعمیر کرائی تھی۔

۴۔حضرت ضیاء الدین مکیؒ رحمۃ اللہ علیہ: ضیاء الدین نام تھا۔پیدائش مکۂ معظمہ میں ہوئی اور وہیں نشوونما پائی تھی۔اسی مناسبت سے ضیاء الدین مکیؒ کہلائے۔وہ حافظ قرآن اور صاحب علم تھے۔جہاد کے شوق میں سلطان محمود غزنوی کی فوج میں شامل ہو گئے اور متعدد مرتبہ اپنی بہادری اور شیر دلی کے جوہر دکھائے۔غازیان نامدار میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ہر لحظہ شہادت کی تمنا دل میں رہتی تھی۔وہ ۴۰۹ھ میں بدایوں آئے اور ایک جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔آپ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔جمعہ کی نماز کے بعد لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہوتا ہے۔آپ کا مزار شریف شہر کے باہر جج صاحب والی کوٹھی کے قریب ایک شاندار اور خوش نما درگاہ کے اندر پختہ واقع ہے۔لوگ اس کو ڈھاک والی زیارت (گاہ) کہتے ہیں۔بالین مزار ڈھاک کا ایک بہت بڑا درخت کھڑا ہے۔پائین مزار سیدّ فرخند علی اور ان کے بھائی مدفون ہیں۔

۵۔حضرت خواجہ ناصر الدین علی شہید رحمۃ اللہ علیہ: علی بن حمزہ نام اور ناصر الدین لقب تھا۔میرانجی صاحب کے چچازاد بھائی تھے۔سلطان محمود غزنوی کے بہادر اور نامبر سواروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔آپ حضرت میراں جی صاحب کے ساتھ ۴۰۹ھ میں بدایوں آکر شہید ہوئے۔آپ کا مزار شریف اندرون شہر فرشوری ٹولہ میں چکر والی سڑک پر ایک خوش نما درگاہ کے اندر پختہ واقع ہے۔اصل مزار تہہ خانے کے اندر ہے۔آپ کے آستانہ پر دور دراز سے لوگ منّت مانگنے آتے ہیں۔کرامات اکثر ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ایک کرامت یہ ہے کہ نیم کے درخت کی ایک شاخ کی پتیاں جو آپ کے مزار پر سایہ فگن رہتی ہیں،ہر موسم میں ہر وقت زرد رہتی ہیں باقی پتیاں موسم کے لحاظ سے رنگ بدلتی رہتی ہیں۔

۶۔حضرت شیخ احمد نہروانی رحمۃ اللہ علیہ: آپ حضرت قاضی حمید الدین کے مرید تھے۔پیشے سے بافندگی کا کام کرتے تھے۔دنیاوی کام سے فراغت کے بعد عبادت میں مشغول رہتے تھے۔حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی فرماتے ہیں کہ ”اگر احمد کی مشغولی کا وزن کیا جائے تو دس صوفیوں کی مشغولی کے برابر ہوگی۔“ آپ صاحب کرامت ہیں اور کرامات اکثر ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ان میں سے قابل ذکر یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا آپ اپنا کام کرتے کرتے از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔کام بند ہو جاتا لیکن کپڑا بغیر آپ کی

موجودگی کے بنتا جاتا تھا۔

۷۔حضرت غازی احسن رسالہ دار رحمۃ اللہ علیہ: آپ بانکے میاں کے نام سے مشہور ہیں اور اصل نام غازی احسن تھا۔وہ حضرت سلطان ابراہیم یمنی کے دوستوں میں سے تھے۔سلطان محمود غزنوی کے انتہائی بہادر اور جانباز سپاہیوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ بہ نیت جہاد ہندوستان تشریف لائے اور ۴۲۱ھ میں بدایوں آکر شہید ہوئے۔آپ کا مزار شریف سلطان العارفین صاحب کی درگاہ کے نزدیک خوش نما روضہ کے اندر پختہ واقع ہے۔آپ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔دور دراز سے آئے ہوئے پاگل،مصیبت زدہ اور پریشاں حال لوگ رات دن مزار کے گرد پڑے رہتے ہیں۔آپ کے مزار پر جمعرات کے دن کافی ہجوم رہتا ہے اور لوگ فاتحہ کراتے ہیں۔

مختصر یہ کہ شہر بدایوں زمانۂ قدیم سے ہی روحانیت کا مرکز رہا ہے اور آج بھی روحانی فیض کا سرچشمہ ہے۔اللہ کے بے شمار محبوب بندے اس مقدس اور پاک بستی میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔اولیا،عرفا اور شہدا اس کی گلیوں میں کھیلا کرتے ہیں۔صوفیا اور مشائخ یہاں آکر فیض حاصل کرتے ہیں۔یہاں پر وہ پاک طینت دفن ہیں جنھوں نے اپنی تمام عمر دین اسلام کی اشاعت کے لیے وقف کر دی۔ان کے مزارات پر ہندو،مسلم،سکھ، عیسائی اور دیگر مذاہب کے لوگ حاضر ہو کر آج بھی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہزاروں اولیا مکتوم و صدہا اہل خدمت ہیں
انھیں سے خیر و برکت ہے، یہی دنیا سنبھالے ہیں

کتابیات:

(۱) مردان خدا،ضیا علی خاں اشرفی،لکھنو،۱۹۷۶ء
(۲) سلک السلوک،ضیاء الدین نخشبی/ترجمہ مفتی محمد شمشاد حسین رضوی،دہلی،۲۰۰۷ء
(۳) تذکرۂ اولیائے پاک و ہند،ڈاکٹر ظہور الحسن شارب،الفیصل پبلشنگ کمپنی،لاہور



Munazir Haque Badauni
Research Scholar Dept. of Persian,
AMU Aligarh-202002
Mob. 9897835458
E-Mail: munazirhaque007@rediffmail.com

پیغام آفاقی: شخصیت اورفن

سیدابوذرعلی

ہر زبان وادب کی جان شاعری ہوتی ہے اور شاعری کے ہی ذریعہ کسی زبان کی ادبیت کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ادب جب شاعری سے آگے بڑھتا ہے تو پھر دوسری اصناف کو اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے۔یہ بنیادی اصول کسی ایک زبان وادب سے مختص نہیں، بلکہ ہر زبان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہے۔اردو ادب میں بھی سب سے پہلے شاعری کی داغ بیل پڑی۔جب اردو ادب نے شاعری کا بوجھ اٹھالیا تو پھر اپنے دامن میں داستان کو جگہ دی۔لمبی لمبی داستانیں لکھی گئیں اور اسے پڑھنے اور سننے والوں نے دلجمعی کے ساتھ سنا اور پڑھا۔لیکن جیسے جیسے انسان کے شعور میں بالیدگی اور پختگی آتی گئی ویسے ویسے ایسے قصے اور کہانیوں کی جگہ کم ہوتی گئی جن میں مافوق الفطرت عناصر موجود تھے۔افسانوی ادب نے کروٹ لی، داستان کی جگہ ایک نئے فارم ناول نے لے لیا جس میں نسبتاً داستان سے طوالت کم تھی اور مافوق الفطرت عناصر سے آزادی بھی۔پھر دنیا برق رفتار ہونے لگی۔اب کون ناول اور داستان پڑھے؟ تو پھر افسانوی ادب نے ایک بار اور اپنا چولا بدلا اور افسانہ وجود میں آیا۔اب افسانے کا ہی بول بالا تھا۔اب کون ناول پڑھے؟ کہاں کسی کے پاس اتنا وقت؟ لیکن کچھ ایسے بھی قلمکار ہوتے ہیں جو زمانے کی کروٹ کو بخوبی بدلنا جانتے ہیں اور وہ ایک ایسی نئی راہ بنانے کے ہنر سے واقف ہوتے ہیں جس سے ادب کے دھارے کو موڑا جاسکتا ہے۔انھیں میں ایک نام پیغام آفاقی کا بھی ہے جنھوں نے افسانوی ادب کا دھارا ۱۹۸۹ء میں ”مکان“ لکھ کر پھر ناول کی طرف موڑ دیا، جس کے بعد اردو ادب میں کئی ناول لکھے گئے۔

پیغام آفاقی کا اصل نام اختر علی فاروقی ہے جو ضلع سیوان صوبہ بہار کے ایک چھوٹے سے موضع چانپ میں ۶؍فروری ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہی ایک مکتب میں پائی۔مکتب میں ایک استاد مولوی مختار علی تھے جنھوں نے ایک دن پیغام آفاقی کی اس لیے زبردست پٹائی کردی کہ وہ اپنے سبق سے آگے کے اوراق بھی پڑھتے جارہے تھے۔اس بات کی شکایت انھوں نے اپنے والد شیخ عبدالجبار فاروقی سے یہ کہہ کر کی کہ ”سمجھی ہوئی چیز کو بار بار پڑھنے میں میرا دل نہیں لگتا“۔عبدالجبار ایک باشعور انسان تھے اور وہ اپنے بچے کی ذہانت سے بخوبی واقف تھے، اس لیے انھوں نے مولوی صاحب کو اس عمل پر روکنے ٹوکنے سے منع کردیا۔پیغام آفاقی نے قرآن مجید اور عربی گاؤں کے ہی ایک بزرگ، حکیم الدین سے پڑھا جنھیں گاؤں کے لوگ عاقل میاں کہتے تھے، جو بڑے ہی نیک اور دیندار شخص تھے۔یہی بزرگ پیغام آفاقی کے الجھے سوالات کے جوابات بھی دیتے تھے۔مکتب کی تعلیم کے بعد ان کا داخلہ سیوان کے اسلامیہ اسکول میں کرادیا گیا جہاں بہترین

اساتذہ نے فارسی کی بنیادی تعلیم بھی دی جس سے اردو زبان کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں۔پیغام آفاقی نے اسکول کے زمانے سے ہی شعر کہنا شروع کردیا تھا، اس لیے ان کے ایک استاد شیخ القادرین نے ان کی شعری تربیت کے لیے حکیم بشیرالدین کے پاس بھیج دیا، جہاں انھوں نے شاعری کے رموز واوقاف کو جانا اور سمجھا۔اس وقت پیغام آفاقی نویں درجہ کے طالب علم تھے۔

بچپن میں پیغام آفاقی کا خواب سائنسداں بننا تھا مگر یہ خیال اسکول تک جاتے جاتے بدل گیا اور ڈاکٹر بننے کا ارادہ کرلیا تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کی خدمت انجام دے سکیں۔ڈاکٹر بننے کا ارادہ بھی ہائر سکنڈری تک پہنچتے پہنچتے ترک کردیا۔یہ تبدیلی معاشرے اور سماج میں پھیلے مختلف مسائل پر غور وفکر کا نتیجہ تھی۔سماج اور معاشرے کی بدعنوانیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلے کا ارادہ کیا تاکہ وہاں جاکر دنیا کے دانشوروں کے افکار سے واقف ہوسکیں اور انھیں سمجھ سکیں۔۱۹۷۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی۔اے (انگریزی۔آنرس) میں داخلہ لیا۔انگریزی کے ساتھ اردو اور پالیٹکل سائنس کا مضمون بھی داخل رکھا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہی ۷۷۔۱۹۷۵ میں تاریخ سے ایم۔اے کیا۔تعلیم مکمل ہونے کے بعد یونین پبلک سروس کمیشن میں اپیر ہوئے مگر Underage ہونے کی وجہ سے جوائن نہ کرسکے۔۵مئی ۱۹۷۸ء میں پولیس سروس جوائن کیا اور مختلف عہدوں اور جگہوں پر ملازمت کے فرائض انجام دیتے رہے۔آخر عمر میں کینسر جیسی مہلک بیماری لاحق ہوگئی جس کی وجہ سے ۶۱؍برس کی عمر میں ۲۰؍اگست ۲۰۱۶ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کی تدفین ان کے وطن موضع چانپ ضلع سیوان بہار میں ہوئی۔

ادبی منظر نامہ:

۱۹۷۱ء میں پیغام آفاقی ہائر سکنڈری کے امتحان کے بعد ڈیڑھ ماہ کی تعطیلات میں اپنے وطن چانپ، سیوان سے پٹنہ تشریف لے گئے اور وہاں خدابخش لائبریری میں جہاں تک ممکن ہوسکا، انسانی حقوق سے متعلق کتابوں کی ورق گردانی کی۔کتابوں کی ورق گردانی کا اثر ان پر یہ ہوا کہ اسی اثنا میں ایک نظم کتابِ قوم کہہ ڈالی جو ان کے شعری مجموعہ ”درندہ“ میں بھی شامل ہے۔یہ کوئی مختصر نظم نہیں، بلکہ ۹ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔اس نظم میں شاعروں اور ادیبوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور ان سے کتابِ قوم کی طرف متوجہ ہونے کی تلقین اس انداز سے کی گئی ہے۔

اے چشم ہائے قوم یعنی شاعرو! مفکرو!
بڑھو سوار ہو کے تم خرد کے اسپ برق زن پہ
اور ہاتھ میں جنوں کی روشنی لیے ہوئے
بڑھو کہ رزم نامۂ حیات کو تمہارا انتظار ہے!!!
زمانہ بیقرار ہے۔(درندہ، پیغام آفاقی، امکان انٹرنیشنل، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۲۹)

پوری نظم پڑھنے کے بعد بالکل بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ نظم کسی ۱۵/۱۶ سال کے شاعر نے کہی ہے۔ کیونکہ جو الفاظ اس نظم میں استعمال کیے گئے ہیں وہ شاعر بہت مشق اور تجربے کے بعد استعمال کر پاتا ہے۔ اس نظم میں لفظوں کی نشست و برخاست اور اس کے مواد کو دیکھ کر، دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پیغام آفاقی کی شعری تربیت اس انداز سے کی گئی کہ انھوں نے الفاظ کے مزاج کو بخوبی پہچان لیا۔ کیونکہ اس عمر میں 'رزم نامۂ حیات' کی تفہیم ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے دل میں ابتدائے عمر سے ہی انسان دوستی اور دردمندی کا جذبہ کارفرما تھا، تبھی وہ ایسے موضوع کی طرف متوجہ ہو پائے، جس نے عمر کے آنے والے حصے میں 'مکان' اور 'پلیتہ' جیسے ناول لکھوائے۔

۱۹۷۱ء میں پیغام آفاقی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں مستقل افسانہ لکھنے اور اشعار کہنے کا سلسلہ جاری رکھا جو مختلف رسالوں جیسے ''آج کل''، ''تحریک''، ''دہلیز''، ''آہنگ'' وغیرہ میں چھپتے رہے۔ مگر پیغام آفاقی کا نام باقاعدہ طور سے ناول ''مکان'' کے ذریعہ اردو دنیا میں مشہور و مقبول ہوا۔ اس ناول نے صرف اردو دنیا میں ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی مقبولیت پائی۔ اسی مقبولیت اور ناول کے مواد کی اہمیت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے امریکہ کی ایک مشہور ادبی تنظیم (National Endowment for Arts(NEA نے اس ناول پر ترجمہ فیلوشپ گرانٹ دیا۔

'مکان' ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آیا جو ۱۳۲ ابواب یا حصوں پر مشتمل ہے۔ اصل میں اس ناول کا تھیم پیغام آفاقی کو اپنے پولیس محکمہ میں آئے ہوئے ایک ایسے کیس سے ملا جس میں ایک لڑکی اپنے مکان کے سلسلے میں ان سے مدد کے لیے ملی تھی۔ پھر یہیں سے پیغام آفاقی کے کہانی کی پلاٹنگ شروع ہوگئی۔ اردو دنیا میں شاید پہلی بار پیغام آفاقی نے اس ناول کے ذریعہ ایک سرمایہ دار یعنی مکان مالک کو مجبور و مظلوم اور رعایا یعنی کرایہ دار کو ظالم کی صورت میں دیکھا ہے۔ اس انداز کا تجرباتی ناول پیغام آفاقی اس لیے بھی لکھ پائے کہ انھوں نے اپنے محکمے کے تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''پیشہ کے اعتبار سے دہلی جیسے شہر میں پولیس کے محکمے میں ہونے کی وجہ سے مجھے زندگی کے سیاہ و سفید کو زیادہ گہرائی سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میرے تخلیقی مزاج اور فکر نے اپنے اس ناول کے لیے اس سے پورا استفادہ کیا ہے۔'' (مافیا، پیغام آفاقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴)

ناول کا مرکزی کردار ''نیرا'' نام کی لڑکی ہے جو میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے اور اپنی ماں کے ساتھ ذاتی مکان میں رہتی ہے اور اپنی پوری توجہ کیریئر پر مرکوز رکھتی ہے۔ مگر اس مکان میں ایک کرایہ دار ''کمار'' نامی شخص بھی رہتا ہے جس کی نیت اس کے مکان پر خراب ہو جاتی ہے اور وہ اس مکان سے ''نیرا'' اور اس کی ماں کو بے دخل کر کے ہڑپ لینا چاہتا ہے جس کے لیے وہ پوری کوشش کرتا ہے اور ''نیرا'' کو بری طریقے سے ٹارچر بھی

کرتا ہے۔ ''نیرا'' جن لوگوں سے مدد کی امید کرتی یا مدد مانگتی ہے وہ سب بھی منہ پھیر لیتے ہیں۔ پیغام آفاقی نے اس ناول کے ذریعہ پولیس محکمے کی بھی پول کھولی ہے۔ کیونکہ انھوں نے پولیس محکمہ میں ملازمت کرتے ہوئے، محکمے کی جعل سازی اور غیر ذمہ دارانہ رویے کو ایک ادیب کی حیثیت سے دیکھا ہے۔

یہ ناول جن جملوں سے شروع ہوتا ہے، وہاں قاری کے اندر ایک تجسس اور نیرا کے لیے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور انھیں جملوں یعنی ناول کی ابتدا سے ہی پیغام آفاقی مالک کو مجبور و مظلوم ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ناول کے ابتدائی جملے ملاحظہ کریں:

> ''یہ ایک سنگین مسئلہ تھا۔ نیرا کا مکان خطرے میں تھا۔ اس کا کرایہ دار اس سے اس کا یہ مکان چھین لینا چاہتا تھا۔ وہ اب تک اس مکان میں بڑے چین سے تھی۔ اس کے ساتھ اس گھر میں صرف اس کی ماں تھی۔'' (مکان، پیغام آفاقی، کلاسیکل پرنٹرس، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۷)

اس ناول میں ایک طرف مضبوط ارادوں والی باشعور لڑکی 'نیرا' اپنے مکان کو بچانے کے لیے اَن دیکھی اور نامعلوم قوتوں اور خطروں سے اس انداز سے ٹکراتی ہے کہ یہ ٹکراؤ یا جنگ صرف اینٹ اور پتھر سے بنے مکان کی جنگ نہیں بلکہ اس کے وجود کی جنگ ہو۔ اگر وہ یہ جنگ جیت جاتی ہے تو مانو اس نے حیات و زندگی پا لیا۔ دوسری طرف کچھ ایسے شر انگیز افراد جو محترم لبادوں میں شیطان کا وجود رکھتے ہیں موجود ہیں، جو کرایہ دار 'کمار' کو مکان پر قبضہ دلانے کے لیے ایسی کوششیں کرتے ہیں جو انسانیت کو شرم سار کر دینے والی ہیں۔

'مکان' کے کردار گوناگوں کیفیات کو لیے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس ناول میں ایک طرف سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کیا گیا ہے تو دوسری طرف ایک اکیلی لڑکی کو مضبوط سے مضبوط تر انداز میں اپنے موقف میں ڈٹا ہوا دکھا کر عورتوں کو ایک ایسا حوصلہ بخشا گیا ہے جس سے وہ اپنی زندگی کی دشوار گزار راہوں میں سماج کی برائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتی ہیں۔ یہ ناول جن جملوں پر تمام ہوتا ہے، وہاں ایک کامیابی اور زندگی کی دشوار گزار راہوں سے نمٹنے کا فلسفہ بھی دیا گیا ہے۔ وہ فلسفہ ملاحظہ کریں:

> ''اور اس نے اپنے آپ سے کہا 'نیرا'...... دیکھو...... اس پورے منظر کو غور سے دیکھو ...... انسان کائنات کا ایک نقطہ ہے...... کائنات کے تمام جانے مانے نقطوں میں اہم ترین ...... کائنات کو اپنے نقطۂ نظر سے تولو...... جانچو...... اور پاؤ...... کائنات ہاتھی اور بھینسے اور دریا اور ہوا آتش فشاں اور نظام شمسی اور گیلیکسز اور وقت کے بہاؤ کی طرح بڑی اور اپنے آپ میں گم ہے...... اس کو پکڑنا سیکھو...... اس کا شکار کر کے اس کو پالتو بنانا اور اس پر سواری کرنا سیکھو...... کائنات ان پہاڑی وادیوں کی طرح ہے...... تم اپنی جگہ بدلتی ہو تو تمہارے لیے اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ تم اس کے قدموں تلے آؤ گی تو یہ تمھیں کچل دے گی۔ تم اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ گی تو تم کو زندگی کی بلندیوں کی سیر

کرائے گی......سپاٹ مناظر سے باہر نکلو اور ان پہاڑیوں کی سیر کرو...... دیکھو کائنات ایسی ہی ہے اور یہی کائنات سے تمہارا رشتہ ہے۔"(مکان، پیغام آفاقی، کلاسیکل پرنٹرس، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۴۰۰)

اس ناول کے تمام کردار ایک مکان کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ اصل میں اس ناول کا مکان صرف ایک مکان کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ایک کائنات کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے جڑے ہوئے کردار خاص طور پر 'کمار' فرد واحد نہیں، بلکہ کائنات کے بدچلن اور بدشعار لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہے جو اس دنیا میں بھیڑیے کی صورت سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور ہمیشہ موقع کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں۔ اس ناول کا اہم کردار 'نیرا' صرف ایک لڑکی نہیں، بلکہ ایک حق پرست اور حق شعار کی حیثیت رکھتی ہے جو پتھریلی اور کانٹوں بھری راہ پر ثابت قدم رہ کر اپنے حق کو حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ 'نیرا' کا کردار فقط ایک نسوانی کردار نہیں بلکہ ایک مکمل انسان کا کردار ہے جو جنس اور صنف سے بالاتر ہے۔ شاید اردو دنیا میں ایسا تجربہ پہلی بار ہوا کہ عورت مردوں کی طرح جنس سے پرے ہو کر دیکھی اور سمجھی گئی۔ اس طرح 'مکان' کی 'نیرا' اردو ادب کا سب سے مضبوط نسوانی کردار بن کر ابھرتی ہے۔

۱۹۸۹ء کے بعد پیغام آفاقی کا ایک شعری مجموعہ "درندہ" ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا۔ جب بھی کوئی قاری اس مجموعے کا نام پڑھتا یا دیکھتا ہے تو سب سے پہلے اسے اس مجموعے پر ناول یا افسانوی مجموعہ ہونے کا شک گذرتا ہے۔ مگر دوسرے ہی لحظہ ورق پلٹتے ہی حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ کیا یہ شعری مجموعہ ہے؟

'درندہ' میں شامل تمام تر شعری تخلیقات پیغام آفاقی کے زمانۂ طالب علمی سے ۱۹۸۰ء تک کے ہیں۔ اس مجموعے کو تین حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلے حصے میں آٹھ باب ہیں اور ہر باب میں مختلف عنوانات اور موضوعات قائم کیے گئے ہیں۔ مجموعے کے دوسرے حصے کا نام "پرواز" ہے اور اس کے ضمنی موضوعات بھی رکھے گئے ہیں۔ تیسرا اور آخری حصہ بعنوان "بزم اشعار" قائم کیا گیا ہے۔

'درندہ' میں ہر طرح کی انسانی زندگی کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی گئی ہے جو مختلف مقامات اور مختلف شکلوں میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ پیغام آفاقی کے شعری مجموعے کی پذیرائی اس انداز سے نہیں ہوئی جیسے ان کے ناول مکان کی ہوئی۔ مگر وہ 'درندہ' کو بھی اپنے ناول اور افسانوی مجموعے کی ایک کڑی مانتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ مجموعہ بھی 'مافیا' کی شکل کو ہی واضح کرتا ہے اور خود اردو شاعری پر چھائی ہوئی اور نصف صدی سے اس پر حاوی سیاست مافیا کے بطن سے ایک جوالا مکھی کی طرح پھوٹا ہے۔"(مافیا، پیغام آفاقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵)

پیغام آفاقی کی شاعری کے مختلف زاویوں میں صرف ایک ہی خواہش نظر آتی ہے اور وہ ہے انسان کی بہتری۔ وہ انسان کو درندہ صفت دیکھنا نہیں چاہتے، بلکہ وہ ہمیشہ اس کی بہتری کا خواب دیکھتے ہیں۔ آفاقی کی نظر میں ایک اچھا انسان کون ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی ایک نظم "ایک اچھا انسان کون ہے۔" میں اس طرح نظم

کرتے ہیں۔ نظم ملاحظہ کریں:

وہ جہاں ٹھہر گیا، اک جہاں نکھر گیا
وہ جدھر گزر گیا، زندگی کو بھر گیا
ابرِ خوشگوار ہے حسن بے شمار ہے
آرزو کی آنکھ کو جوشِ انتظار ہے
پیکرِ خلوص ہے روشنی بے رنگ ہے
اس کے حسن و ذوق پر ہر نگاہ دنگ ہے
رازِ عرصۂ دوام اس کا ایک اک کلام
اس کے دین میں حرام، راہِ غم سے انتقام
مثل پھول چن لیا، راہ میں جو غم ملے
کہہ رہاہے وہ سلام، تم ملے کہ ہم ملے
اس کا پیکرِ خموش اک جہانِ ولولہ
اس کے دم سے عالم آرزو میں زلزلہ
بے نیازِ خلد و حور، بے نیازِ کوہِ طور
اپنی آرزو کا یہ، خود ہے عالم ظہور
اس کے عزم کا حساب رکھ سکے گی وہ کتاب
اس کے آسمان میں ہے جو مثل آفتاب
ہے یہاں سے بے نیاز، گم جہانِ عشق میں
یہ زمین و آسماں اس کو کیا فریب دیں
بے نیاز رنگ و بو، محو روئے آرزو
اس کی روزگار ہے پیچ و تاب جستجو
اس کے مہر دل سے جو نور چھن کے آگیا
رنگ و نور کی شمع چار سو جلا گیا

(درندہ، پیغام آفاقی، امکان انٹرنیشنل، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۴۰)

پیغام آفاقی کو جب ایک اچھے انسان کی تلاش میں ناکامی ملتی ہے تو وہ پھر اللہ سے لو لگاتے ہیں اور دست دعا بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اور اسی لب سے نکلتی ہے دعا کہ یارب!

ہیں کہاں تیرے خلیلؑ اور کلیمؑ اور حسینؑ
چاہے یہ نور کا طوفان جہاں سے نکلے
چاہے فولاد کا انسان جہاں سے نکلے

(درندہ، پیغام آفاقی، امکان انٹرنیشنل، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۵۰)

شعری مجموعہ ''درندہ'' کے بعد پیغام آفاقی کا افسانوی مجموعہ ''مافیا'' ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس افسانوی مجموعے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصے کا الگ الگ نام بھی متعین کیا گیا ہے، جو اس طرح ہیں۔ حصۂ اول ''تخلیقی جہازوں کے قذاق'' ہے، جس میں چار افسانے ہیں ''بھوکمپ اور جوالا مکھی''، ''قلندر''، ''کیڑے کا جنم'' اور ''بلندی''۔ حصۂ دوم ''کائنات کی اجنبی گلیاں'' ہے، جس میں چار افسانے ہیں ''گلاس''، ''شکاری اور شکار کا منظر''، ''کیا کہہ رہے تھے؟'' اور ''ٹرین''۔ حصہ سوم ''موسموں کی ناقابل برداشت شدت'' ہے، جس میں سات افسانے ہیں ''پیتل کی بالٹی''، ''لوہے کا جانور''، ''دہشت''، ''نیم لاش''، ''مسافر''، ''کتے''، اور ''اس کی شخصیت پر مذہب کی کوئی پہچان نہ تھی''۔ حصہ چہارم ''پر اسرار کرداروں کا جنم'' ہے، جس میں چھ افسانے ہیں ''ناریل کا پیڑ''، ''کوآپریٹیو سوسائٹی''، ''رشید بھائی''، ''صفر''، ''مونوا یکٹر'' اور ''ایک ادنیٰ سا مقدمہ''۔ حصہ پنجم ''کتوں کے رونے کی آواز'' ہے جس میں چھ افسانے ''تلاش''، ''پرندے''، ''قطب مینار''، ''کتوں کے رونے کی آواز'' اور ''بوڑھا ملازم'' شامل ہیں۔ پیغام آفاقی کا ان افسانوں میں محور و مرکز ظالمانہ جبلت کے حربوں سے اپنے قاری کو آشنا کرا کر بیداری پیدا کرنا ہے اور یہی آفاقی کی دوسری تخلیقات کا بھی محور و مرکز ہے۔

پیغام آفاقی کی نظر میں منافقت، مکاری، بے رحمی، بے حسی، علم میں جھوٹ کی ملاوٹ، اچھائی کے نام پر قانون بنا کر برائی کا استعمال، پیرو کاروں کے یقین کا ناجائز مقاصد کے تحت استعمال اور استحصال وغیرہ مافیا گیری کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس لیے مافیا لفظ کو اس افسانوی مجموعے کے ذریعہ عام تصور سے ہٹ کر ایک آفاقی علامت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

'مافیا' کے بعد ۲۰۱۱ء میں پیغام آفاقی کا ایک اور ناول ''پلیتہ'' منظر عام پر آیا جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کے نام ''پلیتہ'' اور انتساب ''بارودی سرنگوں کے نام'' قاری کے ذہن میں تجسس پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک تجرباتی ناول ہے۔ آفاقی نے اس ناول کا تھیم بھی پولیس محکمے سے ہی اخذ کیا ہے۔ اس ناول نے بھی خاصی مقبولیت پائی، مگر ''مکان'' کے رتبے کو نہ پہنچ سکا۔

☆☆☆☆☆

Syed Abuzar Ali
Research Scholar Dept. of Urdu,
Banaras Hindu University,
Varanasi-221005, Mob. 9936775007
E-mail: abuzarmandrapalvi@gmail.com

دشتِ فلسفہ و حکمت کا سیّاح بو علی سینا

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

بو علی حسین نام، شیخ الرئیس لقب، ۳۷۳ھ بمطابق ۹۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبد اللہ تھا۔ ضلع بخارا کا ایک چھوٹا سا گاؤں خرمتش ان کا آبائی وطن تھا۔ شیخ الرئیس کے آبا و اجداد میں ایک شخص کا نام سینا تھا۔ چونکہ وہ اپنے وقت میں نہایت ممتاز شخصیت کے مالک تھے اس لیے شیخ لفظ ''سینا'' کے ساتھ مشہور ہیں۔

شیخ بچپن سے ہی نہایت طباع اور ذہین تھے۔ ایک مرتبہ وہ عورت جو ان کو کھلایا کرتی تھی، بہلاتی ہوئی ان کو بخارا کے مدرسے میں لے کر چلی گئی۔ مدرسے میں طالب علم آپس میں علمی گفتگو کر رہے تھے۔ چونکہ فطرت نے شیخ کا دماغ علمی اور فلسفی بنایا تھا اس لیے یہ طلبا کی علمی گفتگو سنتے رہے اور مسائل علمیہ کی توجیہہ سنتے ہی شیخ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اساتذۂ وقت میں سے ایک نے اس امر کو محسوس کیا اور کہا کہ یہ لڑکا غالباً بڑا عالم ہوگا۔ کیونکہ اس وقت اگرچہ بچہ ہے لیکن مسائل علمیہ سن کر مسرور ہو رہا ہے۔ بعض طالب علموں نے اس خیال کو غلط سمجھا تو ان بزرگ نے کہا کہ اچھا تم اس کے سامنے مہمل اور لغو گفتگو کرو دیکھو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس وقت ایک طالب علم نے بالکل لغو گفتگو شروع کر دی۔ لغو گفتگو سنتے ہی شیخ نے رونا شروع کر دیا۔ سب لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ شیخ کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں نے ان کے والد کو تاکید کی اور کہا کہ اس کی تعلیم کا خاص طور پر انتظام کیا جائے۔

کچھ دن بعد ان کے والد بخارا گئے اور وہاں ان کو ایک مکتب میں بٹھا دیا۔ شیخ نے نو سال کی عمر میں نہ صرف کلام مجید حفظ کر لیا بلکہ تمام دینی علوم اور ادبی فنون سے بھی واقفیت حاصل کر لی۔ شیخ کا زیادہ تر وقت مطالعۂ کتب میں گزرتا۔ غرض اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ فارغ التحصیل ہو گئے۔ ۲۰ سال کی عمر میں یہ کمال حاصل ہو گیا کہ سخت سے سخت مرض کا علاج کرتے تو خدا شفا دے دیتا۔ شیخ وقتاً فوقتاً علمائے وقت سے ملتے رہتے۔ بخارا میں محمود نساح نامی ایک عالم تھے۔ وہ اگرچہ بقال تھے لیکن علم ہندسہ میں انتخاب روزگار تھے۔ شیخ ان کے پاس پہنچے اور اس سے تمام و کمال علم مساحت حاصل کیا۔

اسی زمانہ میں حکیم ابو عبد اللہ نامی ایک طبیب بخارا میں تشریف لائے۔ شیخ تو علم کے دلدادہ تھے ہی، نہایت شوق سے حکیم صاحب کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان سے بھی جبر و مقابلہ اقلیدس، حکمت اور ایسا غوجی پڑھنا شروع کی۔ شیخ کتاب پڑھتے پڑھتے جب حد جنس کے بیان پر پہنچے تو ایسے اعتراض کیے کہ خود استاد حکیم ابو عبد اللہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر شیخ نے خود ہی اپنے شبہات اپنی ہی قابلیت سے رفع کیے۔ حکیم ابو عبد اللہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ شیخ نے اقلیدس کی صرف چھ شکلیں پڑھیں اور شکلوں پر خود بخود اپنی ذہانت سے حاوی ہو گئے۔

شیخ عربی و فارسی زبان کے علاوہ سنسکرت اور یونانی کے بھی عالم تھے، چنانچہ سنسکرت اور یونانی کتابوں کے ترجمے اب تک ان کی یادگار ہیں۔ جب شیخ مسئلۂ وضع ہیولی، علم مابعد الطبعیۃ کی طرف متوجہ ہوئے تو اول اول یہ مسئلہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اتفاقاً انھیں دنوں ایک کتاب شیخ کے ہاتھ لگی جو حکیم ابونصر فارابی کی تصنیف تھی۔ جو مسائل شیخ کو سمجھ میں نہیں آتے تھے ابونصر فارابی نے انھیں اس کتاب میں اس انداز سے سلجھا سلجھا کر بیان کیا تھا کہ ایک دم تمام مسائل شیخ کے ذہن نشین ہو گئے۔ شیخ ان مسائل کے حل ہو جانے پر اتنا خوش ہوئے کہ صدقہ دیا اور بہت خیرات کی۔

اسی زمانہ میں ابومنصور حسن نظامی ایک بڑے طبیب تھے، شیخ کچھ عرصہ تک ان کے مطب میں بیٹھے اور فن طب کو بھی بدرجۂ کمال حاصل کرلیا۔ نوح بن امیر منصور سامانی بخارا کا حاکم تھا۔ اتفاق سے بیمار پڑا، تمام اطبا علاج سے عاجز آ گئے کسی طرح صحت نہ ہوتی تھی۔ حاشیہ بوسوں نے شیخ الرئیس کا بھی ذکر کیا۔ بالآخر شیخ بلائے گئے اور علاج شروع ہوگیا۔ شیخ کے علاج سے نوح سامانی کو شفا ہوگئی۔ وہ شیخ سے بہت ہی خوش ہوا اور اس نے شیخ کو دربار میں ملازم رکھ لیا۔ شیخ کو مطالعۂ کتب کا بہت شوق تھا۔ بادشاہ سے عرض کیا کہ سلطانی کتب خانہ "صنوان الحکمت بالکلیہ" میرے متعلق کر دیا جائے۔ بادشاہ نے منظور کرلیا اور اجازت دے دی۔ اس کتب خانے کے فیض سے شیخ کے علم میں چار چاند لگ گئے، شیخ ابھی اس کتب خانے سے استفادہ کر ہی رہے تھے کہ وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ نوح سامانی کا انتقال ہوگیا۔ اس کا بیٹا منصور تخت نشین ہوا، یہ وقت وہ تھا کہ سامانی سلطنت خطرہ میں تھی اور غزنویوں کی طاقت بڑھ رہی تھی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں شیخ کے والد نے انتقال کیا جس سے شیخ کو بہت صدمہ ہوا۔ خوارزم اس زمانہ میں بڑے بڑے علما، فضلا اور ادبا کا مرکز بنا ہوا تھا۔ شیخ نے سلطان وقت کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ بادشاہ وقت عالم تھا اور علما کا قدرداں بھی۔ بعض علمی مسائل پر جب شیخ سے گفتگو ہوئی تو بہت خوش ہوا اور ان کو ملازم رکھ لیا۔ اس طرح علما کے زمرے میں ایک فرد کا اور اضافہ ہوگیا۔

خوارزم شاہ کی علمی قدردانی کا دور دور تک شہرہ تھا کہ اس کی مجلس بوعلی سینا اور بوریحان جیسے زبردست فضلائے دہر سے گونج رہی ہے۔ چنانچہ سلطان محمود کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے ارادہ کیا کہ اپنی سلطنت میں بوعلی سینا کو بلائے۔ خاص اسی کام کے لیے خوارزم بادشاہ کے پاس ایک سفیر بھیجنے کا ارادہ کیا، کسی مخبر نے خوارزم بادشاہ کو اطلاع کر دی کہ سلطان محمود کا ایسا ارادہ ہے۔ خوارزم بادشاہ نے قبل اس کے کہ سلطان محمود کا سفیر آئے ایک روز تمام فضلائے دہر کے سامنے اس امر کو ظاہر کر دیا، اگرچہ وہ کسی طرح نہیں چاہتا تھا کہ ایسے فضلا اس کی حکومت سے کسی دوسری حکومت میں جائیں تاہم اس نے سطحی طور پر کہہ دیا کہ جس کا جی چاہے جا سکتا ہے اور جو نہ جانا چاہے وہ سفیر کے آنے سے پہلے کسی طرف روانہ ہو جائے، پس سفیر کے آنے سے پہلے ہی بوسہیل اور بوعلی سینا خراسان کی طرف چلے گئے۔ سلطان ان لوگوں کے چلے جانے سے بہت نادم ہوا، اس نے ابونصر منصور سے جو اپنے وقت کا بڑا مصور تھا بو

علی سینا کی چند تصویریں بنوائیں اور اپنی حکومت کے مختلف مقامات میں اپنے ماتحت حکام کے پاس بھیج دیں اور حکم دے دیا کہ اس شکل و صورت کا آدمی جہاں ملے فوراً بھیج دیا جائے۔ شیخ سیر و سیاحت کرتے ہوئے جرجان پہنچے اور وہاں کے حاکم کے بھانجے کو شفایاب کیا۔ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر جب حاکم نے سلطان محمود کی بھیجی ہوئی تصویر سے ملایا تو انھیں اپنے ساتھ محمود کے حضور لے گیا۔ محمود شیخ کے پہلے باز نہ آنے کی وجہ سے ناراض تھا مگر حاکم جرجان قابوس کی سفارش سے شیخ کا قصور معاف کر دیا، پھر شیخ جرجان، دہستان، رے ہوتے ہوئے ہمدان میں وہاں کے ایک امیر کے یہاں ٹھہرے۔ والی ہمدان کو قولنج کا مرض تھا۔ شیخ نے علاج کیا، شفا ہوگئی۔ یہاں شیخ کی بڑی عزت ہوئی اور نہ صرف خلعت گرانمایہ ملا بلکہ شیخ وزارت کے منصب پر مقرر ہو گئے۔ لیکن شیخ ایک علمی حیثیت رکھتے تھے ان کو تمدن میں عملی طور پر بہت زیادہ دخل نہ تھا اس لیے عمدہ انتظام نہ کر سکے۔ اس وجہ سے فوج اور خود بادشاہ شیخ سے برافروختہ ہوگیا۔ شیخ روپوش ہو گئے۔ اتفاق دیکھیے کہ بادشاہ کو پھر قولنج کی شکایت ہوئی اور اس نے شیخ کی تلاش کا حکم دیا۔ غرض شیخ آئے اور علاج کیا پھر شفا ہوگئی۔ اس بنا پر بادشاہ کی کشیدگی جاتی رہی اور اصل واقعات کا علم ہونے پر بادشاہ نے شیخ کو پھر منصب وزارت پر مقرر کر دیا۔

اب شیخ کی شہرت انتہا کو پہنچ گئی اور عہدۂ وزارت کی وجہ سے زندگی عیش و عشرت میں گزرنے لگی۔ رفتہ رفتہ شیخ کچھ تو بوجۂ فلسفیت اور کچھ بوجۂ تعیش مذہب سے بالکل آزاد ہو گئے۔ یا تو وہ حالت تھی کہ ہر دقیق مسئلہ کے حل کے لیے خضوع و خشوع سے نمازیں پڑھی اور دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ کسی علمی کامیابی پر صدقہ دیا جاتا۔ خیرات کی جاتی۔ یا اب یہ حالت ہوگئی کہ اکثر شراب نوشی اور رقص و سرود میں وقت گزرتا۔ ایک عرصہ تک یہی حالت رہی، پھر حالات نے کروٹ لی اور والیٔ ہمدان شمس الدولہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کا بیٹا تاج الدولہ ہمدان کا بادشاہ بنا۔ لوگوں نے اسے شیخ کے خلاف ورغلا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ منصب وزارت سے اٹھے تو سیدھے قیدخانے میں پہنچے۔ چار ماہ تک قید رہے، پھر حالات خوشگوار ہو گئے۔ علاء الدولہ شیخ کا معتقد ہوگیا تھا۔ اس کے حکم سے ہر شب جمعہ علما و فضلا کی ایک مجلس منعقد ہوا کرتی۔ اب شیخ کا یہ اصول تھا کہ صبح سویرے اٹھتے اور ضروری امور سے فارغ ہو کر شاگردوں کے سامنے علمی مباحث پر لکچر دیا کرتے تھے۔ جب علاء الدین اور ابوسہل میں جنگ ہوئی اور علاء الدولہ کو اپنی سلطنت چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو شیخ بھی علاء الدولہ کے ہمراہ تھے، راستے میں شیخ بیمار ہو گئے۔ اگرچہ شیخ بڑے حکیموں اور فضلائے دہر میں سے تھے تاہم ان کو شراب نوشی اور مباشرتی تعیش کی بہت عادت تھی۔ (جس کا ذکر سید جلال الدین اپنی کتاب کے صفحہ ۳۶ پر کرتا ہے) اس وجہ سے آخر عمر میں شیخ کو قولنج اور صرع کی شکایت ہوگئی۔ جو دوائیں استعمال میں آئیں اس میں خادم کی غلطی سے بعض اجزا کی کمی زیادتی نے شیخ کا برا حال کر دیا۔ شیخ نے محسوس کرلیا کہ اب انتقال کا وقت قریب ہے اس لیے غسل کیا اور از سر نو توبہ کی اور چونکہ قرآن مجید کے حافظ تھے اس لیے تین دن میں کلام مجید ختم کر لیا۔ پھر اپنا تمام مال خیرات کر کے غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اس

واقعے کے تیسرے دن ماہ رمضان المبارک میں بروز جمعہ ۵۵ سال کی عمر پا کر (صاحب حبیب السیر سے اختلاف کرتے ہوئے کہ وہ شیخ کی عمر ۶۳ سال تحریر کرتا ہے۔ صفحہ ۱۲) ۴۲۸ھ مطابق ۱۰۲۷ء میں انتقال کیا اور ہمدان کی جنوبی فصیل کے نیچے دفن ہوئے۔

شیخ الرئیس کے عقیدے سے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آخر عمر میں شیخ حضرت ابوالحسن خرقانی کے مرید ہو گئے تھے اور مقامات سلوک بھی انھوں نے طے کیے، لیکن خوش اعتقادی سے زیادہ اس خیال کو وقعت نہیں دی جا سکتی۔ ہاں حکمائے اسلام میں شیخ کو ایک بلند درجہ ضرور حاصل ہے۔ انھوں نے وجود باری پر جو دلائل قائم کیے ہیں بقول علامہ شبلیؔ ان کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے، مگر اتنا ضرور ہے کہ قوت انسانی کے متعلق ۸۹۹ سال پہلے شیخ نے جو فلسفہ بیان کیا وہی آج جدید تحقیقات کا سرمایۂ ناز ہے۔

شیخ الرئیس کو ان سب سے ہٹ کر شاعری کا بھی بڑا شوق تھا عربی اور فارسی زبان میں شعر کہا کرتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کفرِ چو من گزاف آسان نبود   محکم تر از ایمان من ایمان نبود
در دہر چو من یکی و آن ہم کافر   پس در ہمہ دہر یک مسلمان نبود

ایک بار شیخ ابتدائے عمر میں حضرت ابوسعید ابی الخیر کی مجلس میں پہنچے۔ وہاں معصیت اور جناب باری کی مغفرت کا ذکر ہو رہا تھا۔ شیخ نے یہ رباعی پڑھی:

مائیم بہ عفوِ تو تولا کردہ   و ز طاعت و معصیت تبّرا کردہ
آن جا کہ عنایتِ تو باشد، باشم   ناکردہ چون کردہ، کردہ چون ناکردہ

حضرت ابوسعید نے اس کے جواب میں فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی:

آی نا کردنی بدیہا کردہ   و آنگہ بہ خلاصِ خود تمنا کردہ
بر عفو مکن نگاہ کہ ہرگز نبود   ناکردہ چون کردہ، کردہ چون ناکردہ

عربی کلام کا نمونہ یہ ہے:

(جب تیرا نفس روشن ہو جائے تو سمجھ کہ تو زندہ ہے اور تاریک ہو جائے تو سمجھ کہ تو مردہ ہے۔)

شیخ الرئیس نے عمر تو بہت کم پائی لیکن بہت سی کتابیں مختلف مباحث میں مختلف مقامات پر تصنیف کیں۔ کارواں سرائے میں رہ کر قانون تصنیف کیا۔ دہستان میں رہ کر منطق میں کتاب اوسط ابومحمد کے نام سے لکھی۔ زمانۂ وزارت میں شفا لکھی اور قانون کو تکمیل تک پہنچایا۔ بزمانۂ گرفتاری کتاب ادویہ قلبیہ اور رسالۃ الطیر لکھا۔ اصفہان میں رہ کر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ابوالحسن عروضی اور شیخ ابوبکر کی فرمائش سے علم اخلاق اور علم عروض پر کتابیں لکھیں۔ ابوسہیل ہمدانی نے اپنے زمانۂ حکومت میں شیخ کی بہت تصانیف ضائع کر دیں۔ پھر بھی ان کی تصنیف میں سے ایک سو بارہ کتابیں موجود ہیں جن میں ۹۶ کتابیں مختلف علوم وفنون میں ہیں اور خاص فن طب میں ۱۶ کتابیں موجود ہیں۔ یوروپ میں شیخ کی کتاب قانون کا ترجمہ ہوا اور بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ صاحب تذکرہ حکیم اصغر حسین اپنی تصنیف کے صفحہ نمبر ۲۳ پر تحریر کرتے ہیں کہ فن ڈاکٹری کا بہت کچھ حصہ ان سے اخذ کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

Ahmad Naved Yasir Azlan Haider
Research Scholar Dept. of Persian,
AMU Aligarh-202002
Mob. 07668727128
E-Mail: azlanhyder001@gmail.com

سعید نفیسی کی کہانی "خانۂ پدری" (فارسی) کا خلاصہ

یہ ایک تاریخی کہانی ہے جسے سعید نفیسی نے اپنے مخصوص انداز میں نہایت دل چسپ طریقے سے پیش کیا ہے۔ کہانی یہ ہے کہ نصر اللہ نامی ایک 74 سالہ شخص اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ہرات میں قلی کا کام کرتا تھا اور اسی سے اپنا گزر بسر کرتا تھا۔ ماں باپ کا سایہ بچپن ہی میں اٹھ گیا تھا اس لیے ایک طرف یتیمی اور دوسری طرف شادی بیاہ نہ کرنے کی وجہ سے وہ دنیاوی علائق سے بالکل آزاد تھا۔ قلی کا کام کرتا، جہاں موقع ملتا وہیں رات گزار لیتا اور جو کچھ میسر آتا وہ کھا لیتا۔ وہ انسانی جذبات سے اس قدر عاری تھا کہ گلی کوچے میں کوئی عورت اپنے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے بوسہ دیتی تو اسے حیرت ہوتی۔ اس طرح وہ محبت ونفرت کے جذبات سے بالکل عاری تھا۔

ایک دن معلوم ہوا کہ ہرات پر انگریزوں کا قبضہ ہونے جا رہا ہے چنانچہ وہاں کے زمیندار اپنی ملکیت اور جائداد چھوڑ کر مشہد کی طرف روانہ ہونے لگے۔ ایسی صورت میں ان کا دل غمگین اور آنکھیں اشکبار تھیں۔ لیکن اس وقت نصر اللہ کے دل میں خیال آیا کہ یہ لوگ خود ہی اپنا گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں اور رو رہے ہیں، چنانچہ وہ انھیں بہت حیرت اور تعجب سے دیکھتا تھا۔ اسی دوران ایک زمیندار نے اپنا باغ نصر اللہ کو یہ کہتے ہوئے حوالے کیا کہ اب تمہاری عمر ڈھل چکی ہے اور قلی کا کام تمہارے لیے مشکل ہوگا۔ اس باغ کی دیکھ بھال کرو اور اسی سے اپنی روزی روٹی کا انتظام کرو۔ چنانچہ اس نے ہنسی خوشی اسے قبول کیا اور اکثر و بیشتر باغ میں موجود ایک نہر کے کنارے بیٹھتا اور نظاروں سے لطف اندوز ہوتا۔ ایک دن نہر کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کیا دیکھتا ہے کہ پانی میں موجود سنگریزوں کو پانی کے تھپیڑے بہ جبر واکراہ اپنی جگہ سے ہٹانا چاہتے ہیں مگر سنگریزے وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے۔

ایک دن پھر خبر آئی کہ مہاجرین کی جتنی جائدادیں، مکانات اور باغات ہیں وہ سب ضبط کیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ نصر اللہ کو بھی وہ باغ چھوڑنا پڑا جسے اس نے اپنے خون پسینے سے سینچا تھا۔ اسے باغ کو چھوڑنے کا بہت صدمہ تھا اور باغ سے نکلتے وقت وہ مڑ مڑ کر حسرت بھری نگاہوں سے اس کو دیکھتا جاتا تھا۔

باغ سے بے دخل ہونے کے بعد اس نے دوبارہ قلی کا کام شروع کر دیا لیکن اب اس کا دل محبت ونفرت کے جذبات سے معمور ہو گیا تھا اور بہت زیادہ دنوں تک قلی کا کام نہ کر سکا۔ اس وقت اسے باغ کی نہر میں بہتے رکتے اور پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے سنگریزے یاد آئے۔ بس یکایک وہ ہرات چھوڑ کر اپنے آبائی مکان کی تلاش میں عصا ٹیکے اور کاندھوں پر سامان سفر لادے ہوئے نکل پڑا۔ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہر انسان کو کبھی نہ کبھی اپنے آبائی وطن کی یاد آتی ہے کیوں کہ اس سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ (خلاصہ از مولانا ارشاد حسین)

☆☆☆

رباعیاتِ میر: ایک جائزہ

شاہدہ فاطمہ

علمی اور فنی نزاکتوں کے پیشِ نظر صنف رباعی کو ایک مشکل ترین شعری اصناف میں شمار کیا گیا ہے۔اس کا ظرف محدود ہے لیکن اس کی ظرفیت غیر محدود ہے۔شعر و ادب کی تاریخ میں رباعیات کی چھان بین میں بہت کوتاہیاں ہوئی ہیں۔اسی لیے صنف رباعی کے لیے جو عموماً رائیں دی جاتی رہی ہیں اس کا سب سے بڑا سبب رباعیات کے ذخیرے کی باقاعدہ اشاعت نہ ہونا ہے۔اسی لیے رباعی گویوں کی رباعیات کے تنقیدی جائزوں میں ان کو جو مقام ملنا چاہیے تھا وہ نہ مل سکا۔رباعی فارسی الاصل صنف ہے۔ایران میں عہد قدیم سے یہ ایک صنف کی حیثیت سے رائج تھی۔برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی اس بارے میں رقم طراز ہیں:

”یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ جیسے رباعیوں کے مجموعے فارسی میں ملتے ہیں ایسے اور اتنے مجموعے اردو میں نظر نہیں آتے۔لیکن کہنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ فارسی اور اردو کی عمروں میں کتنا فرق ہے۔پھر بھی اردو نظم کا ذخیرہ رباعی کے مجموعوں سے خالی نہیں۔۔۔۔“۱

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ”چار چار“۔اصطلاحاً اس سے وہ شعری ہیئت مراد ہے جو چار مصرعوں پر مبنی ہو اور فکر و خیال کے لحاظ سے مکمل ہو۔کیوں کہ رباعی کے چاروں مصرعوں میں خیال مربوط و مسلسل ہوتا ہے اور آخری مصرعے میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔جس رباعی میں پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوں اور تیسرا غیر قافیہ تو اس کو ”خصی“ کہتے ہیں۔آج کل اس کا زیادہ چلن ہے۔جس رباعی میں چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں اسے رباعی ”غیر خصی“ کہتے ہیں اور اسے حسن مانا جاتا ہے۔مثال کے طور پر:

ہرکس ز خدا دولت و دین می طلبد
یا سیمبری ماہ جبین می طلبد
بی چارہ دلم آن نہ این می طلبد
خواہانِ وصال است ہمین می طلبد

(سرمدؔ)

وہ صنف جو اپنی ہیئت کی بنا پر تحقیقی شناخت رکھتی ہے، غزل اور رباعی ہے۔اسی لیے اصطلاحاً اسے ہیئتی اصناف کہا جاتا ہے۔رباعی کہنے کے لیے فنی لوازمات کا جاننا بہت ضروری ہے کیوں کہ رباعی کو شاعری کی پختہ صنف بھی کہتے ہیں۔جس میں کسی قسم کا جھول قابل قبول نہیں۔ہر صنف اپنا ایک منفرد مزاج رکھتی ہے۔اخلاق

حسین دہلوی اپنی کتاب ”فن شاعری“ میں لکھتے ہیں:

”رباعی ان چار مصرعوں کو کہتے ہیں، جو اوزانِ رباعی میں سے کسی ایک وزن پر ہوں۔اس کے تین مصرعے ہم قافیہ ہوں۔رباعی کا وزن بحر ہزج کے ساتھ مخصوص ہے۔اس میں نو زحاف آتے ہیں اور ان میں سے چوبیس وزن نکلتے ہیں۔“۲

رباعی کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔غالب جیسے نامور شاعر اور محتاط استادِ فن جنھوں نے کل سولہ رباعیاں کہی ہیں۔اس میدان میں وہ ٹھوکر کھاتے نظر آتے ہیں۔اسی لیے جوش ملیح آبادی نے برج لال رعنا کے مجموعے ”رعنائیاں“ میں لکھا ہے:

”رباعی ایسی کمبخت چیز ہے جو چالیس پچاس برس کی مشاقی کے بعد کہیں جا کر قابو میں آتی ہے۔مسلم ہے کہ رباعی لکھنے کے لیے کافی مشقِ سخن اور پختگی عمر کی ضرورت ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر شاعر کی زندگی میں رباعی نویسی کا دور آخر میں آتا ہے۔“۳

میر تقی میر ان لوگوں میں نہیں تھے جنھوں نے دل بہلانے کی خاطر یا فقط تحسین وصول کرنے کے لیے شعر کہے ہوں، بلکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو شعر میں ڈوبے ہوئے تھے اور جن کے کمال سے آج اردو زبان زندہ ہے۔میر کا یہی رنگ و آہنگ ان کی رباعیات میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔انھوں نے کم و بیش ۱۲۵ رباعیاں کہی ہیں جن میں فنی نقطۂ نظر سے وہ کمال پیدا کیا ہے۔جس کی مثال کم ملتی ہے۔کیوں کہ میر اپنے کمال سے بخوبی واقف تھے اور اس پر انھیں ناز بھی تھا جس کا اظہار انھوں نے جا بجا اپنی رباعیات میں کیا ہے:

کیسا احساں ہے خلق عالم کرنا
پھر عالم ہستی میں مکرم کرنا
تھا کار کرم ہی اے کریم مطلق
ناچیز کف خاک کو آدم کرنا

میر کو لفظوں کے استعمال پر کمال حاصل تھا۔وہ اپنے دلی جذبات و کیفیات کو بڑی سادگی سے شعر کے قالب میں ڈھال دیتے تھے۔جس سے ان کا شعر درد سے معمور ہو جاتا تھا۔وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں بڑی سادگی اور خوبی سے ادا کرتے ہیں مثلاً:

کاہے کو کوئی خراب خواری ہوتا
کاہے کو ہمیں یہ جان بھاری ہوتا
دلخواہ ملاپ ہوتا تو تم ملتے
اے کاش کہ عشق اختیاری ہوتا

کسی شاعر کے کلام کا معیار اس کی تاثیر ہے۔ میر کے اشعار خیال کے ساتھ لفظ سے اس قدر ملے جلے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا محو ہو جاتا ہے۔ اسے لفظ خیال سے الگ نظر نہیں آتا اور اگر ایک مخصوص مترنم اور ملائم لہجے سے جتنی بار پڑھا جائے ایک نیا کیف اور نئی لذت ملتی ہے۔ ہر لفظ دل میں چٹکی لیتا ہے۔

تیرا اے دل یہ غم فرو بھی ہوگا
اندیشۂ رزق کم کبھو بھی ہوگا
کھانے کو دیا ہے آج حق نے تجھ کو
کل بھی دیوے گا کل جو تو بھی ہوگا

اسی لیے میر کے یہاں سکون اور خاموشی اس قدر ہے کہ شعر کب دل میں دھیرے دھیرے اتر جاتا ہے وہ کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ مثل اس نشتر کے جس کی تیز دھار کا اثر اس وقت ہوتا ہے جب وہ دل پر جا کر چبھتا ہے۔ جس طرح انیس کے مرثیے رلاتے ہیں، یہاں میر خود روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

اے میر کہاں دل کو لگایا تو نے
شکل اپنی بگاڑ کر کڑھایا تو نے
جی میں نہ ترے حال نہ منھ پر کچھ رنگ
اپنا یہ حال کیا بنایا تو نے

ایک دوسری رباعی میں:

طوفان اے میر شب اٹھائے تو نے
آشوب بلا آنکھوں دکھائے تو نے
رونے سے ترے روسی چلی آئی ایک
یہ دو دریا کہاں سے پائے تو نے

میر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ درد کی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ معشوق کی جفا یا بے وفائی کا ذکر نہیں صرف عاشق کی جوانی اور اس کے حال زار کی طرف اشارے موجود ہیں۔ اپنے دل کو خود ہی تسکین دیتے نظر آتے ہیں۔

ہم میر سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر
ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ دُرِ نایاب
کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

اور پھر معشوق کا جواب جو اس درد میں ہزار ٹیس پیدا کر دیتا ہے یہ میر صاحب کا کمال ہے۔ اسی چیز نے ان کی شاعری کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ وہ اپنی ایک رباعی میں بڑی خوبصورتی سے شکایت کرتے نظر آتے ہیں:

کیا کیا اے عاشقی ستایا تو نے
کیسا کیسا ہمیں کھپایا تو نے
اول کے سلوک میں کہیں کا نہ رکھا
آخر کو ٹھکانے ہی لگایا تو نے

میر کے اشعار عاشقانہ ہوں یا حکیمانہ، ان میں اندوہ والم اور ناکامی و مایوسی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ کسی حال میں ہوں مگر ان کے دل سے جب کوئی بات نکلتی ہے تو وہ یاس و ناکامی میں ڈوبی ہوتی ہے۔ ان کو اپنی اہمیت کا احساس شدت سے تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا کیا ہے۔

یارو! کدورتیں ہیں اب تو ہم سے
جس روز کے ہم جائیں گے اس عالم سے
اس روز کھلے گی صاف سب پر یہ بات
اس بزم کی رونق تھی ہمارے دم سے

اسی طرح ظرافت کی چاشنی میر کے کلام میں دیکھنے کو نہیں ملتی، بس کبھی کبھی وہ ایک آدھ ظریفانہ اشعار بھی کہہ جاتے تھے۔ بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ ان کی ظریفانہ شاعری میں بھی اسی سوز و گداز کا رنگ غالب دکھائی دیتا ہے جو ان کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ مثال کے طور پر:

آئی نہ کبھو رسم تلطف تم کو
کرتے نہ سنا ہم پہ تاسف تم کو
مرتے ہیں ہم اور منھ چھپاتے ہو تم
ہم سے اب تک بھی ہے تکلف تم کو

وہ شعر میں اپنا دل نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ کسی شاعر کے کلام پر اس کی طبیعت اور سیرت کا اس قدر اثر نہ پڑا ہوگا جتنا میر کے کلام میں نظر آتا ہے۔

چپکے رہنا نہ میر دل میں ٹھانو
بولو چالو کہا ہمارا مانو
یک حرف نہ کہہ سکو گے وقت رفتن
چلنے کو زبان کے غنیمت جانو

میر کے کلام کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اس سے ان کے زمانے کی ایک نہایت غم افزا فریاد کا احساس ملتا ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے اس وقت کے حالات کا جو اندازہ ہوتا ہے وہ کسی تاریخ کی ورق گردانی سے نہیں ہوسکتا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت ذہنی اور دماغی کشمکش کے واحد مصور کی حیثیت سے میر کا درجہ بہت بلند ہے۔ ملک میں پھیلی ہوئی جو ابتری تھی اس کی جھلک بارہا ان کے کلام میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ کوئی مصیبت زدہ ان کے کلام کو پڑھے گا تو اسے تسکین ہوگی کیوں کہ آلام و مصائب میں ان کے یہاں سبھی گرفتار نظر آتے ہیں اور دنیا کا دستور یہی ہے۔ میر کا دور اردو شاعری کا عہدِ زریں تصور کیا جاتا ہے۔ تقریباً سبھی شاعروں کے یہاں غم دوستی، یاس پرستی نظر آتی ہے۔ یہی کیفیت کلاسیکی شاعری کی روح تھی۔ میر بے خود آدمی تھے ذہنی لحاظ سے ہلچل اور حرکت حیات سے ان کو لذت ملتی تھی۔ وہ درد کو ایک سرور سمجھتے تھے اور الم کو نشاط بنا دیتے تھے۔ انھوں نے اگر کہیں سرِ تسلیم خم بھی کیا تو ایک فاتحانہ انداز کے ساتھ۔ یہی فاتحانہ انداز اور پُر وقار تیور ہیں جو میر سے ہم کو ترکہ میں ملے ہیں۔ ان کا شمار ایسے فن کاروں میں کیا جاتا ہے جو صدیوں کے الٹ پھیر کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور پھر قیامت تک زندہ رہتے ہیں۔ ایسی ہی نابغہ شخصیات یا فن کاروں کے حوالے سے اقبال نے کہا تھا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کیوں کہ ایسے لوگ بڑی سے بڑی مصیبت کا سنجیدگی اور خودداری سے مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی خوبی ان کو خدائے سخن کا لقب دیتی ہے۔ میں اپنا مقالہ میر کے اس شعر کے ساتھ ختم کرنا چاہوں گی۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں میرا دیوان رہے گا

☆☆☆☆☆

حواشی:

۱: رباعیات دبیر، ڈاکٹر تقی عابدی، ص ۳۹
۲: فن شاعری، اخلاق حسین دہلوی، ص ۱۶۱
۳: ایضاً، ص ۱۶۳

☆☆☆☆☆

Dr. Shahida Fatema
C 5, Yamuna Vihar, Delhi-110053
Mob. 09818615667,
E-Mail: shahidafatima09@gmail.com

نظیرؔ اکبر آبادی اور ہندوستانی تلمیحات

عتیق الرحمان

ادب میں نظم کو نثر پر فوقیت حاصل ہے اور اس بات پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ نظم کا دامن نثر کے مقابلے زیادہ وسیع ہے۔ نظم میں جذبات اور تخیل دونوں کا بڑا مضبوط سلسلہ ہوتا ہے جو شاعر کے قلم سے الفاظ کے ذریعہ مترشح ہوتا ہے۔ نظم ہو یا نثر دونوں میں ہی ''لفظ'' کی بنیادی حیثیت ہوتی ہے۔ شاعر کی قادر الکلامی کا اندازہ الفاظ کے استعمال سے ہو جاتا ہے۔ الفاظ ہی شاعر کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اپنے جذبات کو قاری تک پہنچانے کے لیے شاعر اگر موزوں الفاظ کا استعمال کرتا ہے تو اس کے جذبات وخیالات اسی طرح قاری پر اثر انداز ہوتے ہیں جیسا کہ وہ چاہتا ہے۔ الفاظ کی اہمیت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے ذریعہ ہم ماضی کی قوموں کے احوال وکوائف کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور ان کے احساسات وخیالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

نظم میں الفاظ کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ نظم میں احساسات و جذبات کی ترجمانی کے لیے ایجاز و اختصار سے کام لینا پڑتا ہے۔ کم لفظوں میں زیادہ خیالات و جذبات بیان کرنا ہوتا ہے۔ ہر لفظ نگینے کی طرح شعر میں جڑنا ہوتا ہے اور اس کے لیے الفاظ کا برمحل استعمال اشد ضروری ہوتا ہے تاکہ اس سے شاعر اپنے مطالب کو بھی پورا کرے اور جس طرح کی چھاپ قاری پر چھوڑنا چاہتا ہے وہ مقصد بھی پورا ہو سکے۔ اگر موزوں الفاظ کے استعمال میں ذرا بھی لاپروائی ہو جاتی ہے تو کلام کا سارا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

''غزل کے مختصر الفاظ کائنات کی پوری تاریخ یاد دلاتے ہیں۔ غزل کا ایک ایک لفظ معجزے کا حکم رکھتا ہے''

تلمیح بظاہر ایک لفظ ہے لیکن اس کی تہ میں ایک کائنات موجزن رہتی ہے۔ طول طویل قصوں کو ایک ہی لفظ میں تلمیح کے ذریعہ بیان کر دیا جاتا ہے۔ تلمیح علم بدیع کی ایک شاخ ہے۔ اس کا اپنا حسن ہے۔ کم الفاظ میں زیادہ باتیں کہنے کا اگر کوئی جامع اور واضح انداز ہے تو وہ تلمیح ہے۔

تلمیح کے استعمال سے ایک طرف کلام میں اختصار پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف شاعر کی مہارت کی بھی جلوہ گری ہوتی ہے۔ اشیائے خورد ونوش جس طرح انسانی بقا کے لیے ضروری ہیں کہ بغیر ان کے حیات انسانی کا تصور محال ہے، ویسے ہی کسی بھی ادب کی ترقی کا انحصار اس کے اندر موجود اصطلاحات، رمزیات، کنایات، استعارات، تشبیہات اور تلمیحات کے وافر خزانے پر ہوتا ہے۔ اس سے کلام میں حسن کے ساتھ اشاریت بڑھتی جاتی ہے اور ادب ترقی کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے۔

مختلف ادبا نے تلمیح کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔کسی کے نزدیک قرآنی آیات،علم نجوم،علم موسیقی وغیرہ کا لانا تلمیح ہے توکسی کے نزدیک تاریخی واقعے کاذکر کرنا تلمیح ہے۔بہرکیف اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تلمیح کا دامن بہت وسیع ہے۔اگر تلمیح کی تعریف یوں کی جائے کہ کسی واقعہ،کسی قول،علم نجوم،علم موسیقی،قرآنی آیات واحادیث اور معجزہ وغیرہ کا کلام میں ذکر کرنا تلمیح ہے تو شاید ہمارا مقصود پورے طور پر ادا ہو جائے۔محمود نیازی لکھتے ہیں:

''تلمیحی اشاروں کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ ان سے متعلق واقعات اور قصے عام فہم ہوں اور دائمی شہرت رکھتے ہوں۔اگر وہ واقعہ عام فہم نہیں ہے اور صرف چند مخصوص ذہنوں تک ہی محدود ہے تو اس اشارے کو تلمیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔تلمیح کی تعریف تو یہ ہے کہ اس کے مختصر سے لفظ یا جملہ کو سن کر زیادہ سے زیادہ لوگ اس قصے کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔''

افاداتِ سلیم میں مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی لکھتے ہیں:

''وہ تلمیحات کیا ہیں؟ ہماری قوم کے قدموں کے نشان ہیں جس پر پیچھے ہٹ کر ہم اپنے باپ دادا کے مزعومات،اوہام،رسم ورواج اور واقعات وحالات کا سراغ لگا سکتے ہیں۔''

متذکرہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تلمیح میں ہمارے اسلاف کے شاندار کارنامے،ان کی سماجی، معاشی،معاشرتی اور اقتصادی زندگی،ان کے رسم ورواج،تہذیب وتمدن وغیرہ پنہاں ہیں۔ہر عہد کا انسان اپنے سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔اس لحاظ سے تلمیح کا مطالعہ کیا جائے تو ماضی کی قوموں کے جذبات واحساسات اور تاثرات کی چھاپ تلمیح میں صاف طور پر نظر آتی ہے۔برادرانِ یوسف کا لفظ سنتے ہی حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا ان کے ساتھ ظلم کا وہ منظر جو ان لوگوں نے ان کے ساتھ جنگل میں کیا،پھر کنویں میں ڈالنا،ان کو غلام کہہ کر فروخت کرنا پھر حضرت یوسفؑ کے بادشاہ بننے کے بعد ان کے بھائیوں کا غلہ لینے کی غرض سے ان کے پاس مصر آنا وغیرہ۔

واضح ہو کہ اردو میں مستعمل اکثر تلمیحات کا تعلق عربی وایرانی اصطلاحات سے ہے۔ہندوستانی تلمیحات، ہندو دیومالا اور ہندوستانی اصطلاحات کی طرف اردو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ اس کی طرف صرف گنتی کے شعرا نے توجہ دی ہے۔ہندوستانی تلمیحات کی بنیاد اردو ادب میں قلی قطب شاہ،ولی دکنی،میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی نے رکھی۔ان شعرا نے تلمیحات کو اپنے کلام میں برتا اور اپنے ہی وسائل سے کام لے کر کلام میں ہندوستانی گل بوٹے کھلائے۔ہندوستانی تلمیحات سے مراد وہ واقعات واصطلاحات ہیں جو ہندوستان کی مٹی میں پلے بڑھے ہوں اور ان کا ہندوستانی رسم ورواج اور تہذیب وتمدن سے گہرا تعلق ہو۔بعد کے شعرا تلمیحات کے ہندوستانی رنگ کو قائم نہ رکھ سکے اور پھر وہی بندھے ٹکے راستے پر چل دیے اور یہ سلسلہ کمزور ہوتا چلا گیا۔اگرچہ ہندوستانی تلمیحات کی طرف بہت کم شعرا نے توجہ کی ہے مگر جن لوگوں نے اسے اپنایا پھر وہ اسی رنگ میں رنگتے چلے گئے۔

اردو کے ایک ایسے ہی قادر الکلام شاعر نظیر اکبر آبادی ہیں جنھوں نے عربی وفارسی تلمیحات کے شانہ بہ

شانہ ہندو مذہب،ہندوستانی رسم ورواج،ہندو دیومالائی تلمیحات کو اپنی شاعری میں سمویا۔ایک طرف ان کی پوری شاعری حب الوطنی اور قومی جذبے سے سرشار نظر آتی ہے تو دوسری طرف ہندوستان کے تمام بڑے تہوار چاہے وہ مسلمانوں کے ہوں یا ہندوؤں کے،مسلمانوں اور ہندوؤں کے تمام رسم ورواج،اوہام وعقائد اور ہندو مذہب کی عظیم شخصیات وغیرہ کو بطور تلمیح استعمال کیا ہے۔انھوں نے اپنے کلام میں اگر امیر حمزہ کی تلمیح استعمال کی ہے تو اندر کا اکھاڑا بھی استعمال کیا ہے۔بتانِ آزری کا ذکر کیا ہے تو بل دیو کا بھی۔شہید کربلا کا تذکرہ ہے تو شیام کا بھی۔مسیح ہیں تو مرلی دھر بھی۔نظیر کے متعلق پروفیسر سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''اصل میں یہ تو وہی روایت تھی جسے امیر خسرو نے جنم دیا مگر درمیان میں زندگی سے اس کا وہ پہلا سا گہرا تعلق نہیں رہ گیا تھا۔نظیرؔ نے اسے مستحکم،وسیع اور مقبول عام بنا دیا۔''

امیر خسروؔ کے بعد صوفی شعرا،گولکنڈہ کے قلی قطبؔ شاہ،جعفر زٹلی،فائزؔ اور حاتمؔ نے اسے ہلاکت سے بچایا تھا۔نظیر نے اسے آسمان تک بلند کر دیا۔

لے گوال بال جانے لگے شیام من ہرن
گوئیں لگے چرانے جہاں ہے یہ گوردھن
واں بھی بُتا سُر آیا، بکاسُر بھی بگلا بن
مارا اور اس کی چونچ کو چیرا سمیت تن
آیا اگھاسر، اس کے بھی سر کو اُڑا دیا

(دسم کتھا،نظیرؔ)

اگھاسُر نامی اسُر یعنی (راکچھس) متھرا کے راجہ کنس کا سپہ سالار تھا۔وہ نہایت طاقت ور تھا۔عظیم دیوتا بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔وہ اپنی طاقت کے غرور میں تھا۔بھگوان شنکر نے اس کو یہ شکتیاں ور دان میں دی تھیں۔ایک دن شری کرشن صبح کے وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ برج سے نکلے۔تمام بچے جو ان کے ساتھ تھے۔ اپنے بچھڑوں سمیت ہنس کھیل رہے تھے۔اگھاسُر نے انھیں ہنستا کھیلتا دیکھا تو اس کو جلن ہوئی،کیونکہ وہ پوتنا اور بکاسُر کا بھائی تھا اور شری کرشن کو مارنے کے لیے کنس نے اسے بھیجا تھا۔سری کرشن نے پوتنا اور بکاسُر کو مارا تھا،اس لیے وہ ایک بڑے سے اجگر سانپ کا بھیس اختیار کر کے ان کے راستے میں لیٹ گیا۔اس کا منھ بہت بڑے غار کے مانند ہو گیا،جس میں گھنگور اندھیرا تھا اور اس کی زبان ایک سُرخ سڑک کی طرح معلوم ہونے لگی۔

شری کرشن کے ساتھیوں نے جب یہ منظر دیکھا تو سوچا کہ یہ برج کا کوئی حسین منظر یا کوئی گوفہ ہے۔آپس میں صلاح ومشورہ کے بعد تمام بچے اپنے جانوروں سمیت اگھاسر کے منھ میں داخل ہو گئے۔جب شری کرشن نے دیکھا کہ تمام بچے اپنے بچھڑوں سمیت اگھاسر کے منھ میں جا پھنسے تو انھوں نے ان کو بچانا اپنا فرض جانا۔شری

کرشن بھی اگھاسر کے منہ میں گھس گئے۔ اگھاسر جو شری کرشن کو مارنا ہی چاہتا تھا، اس نے دیکھا کہ موقع غنیمت ہے، ارادہ کیا کہ وہ سب کو چباڈالے مگر اس سے پہلے ہی شری کرشن نے اس کے منہ کے اندر اپنے جسم کو اتنا بڑا کرلیا کہ اس کا گلا رُندھ گیا اور اس کی آنکھیں باہر آ گئیں اور وہ چھٹپٹاتے ہوئے مر گیا۔ اس لڑائی میں تمام بال گوال اور ان کے جانور بھی مر گئے تھے۔ شری کرشن نے انھیں اپنی کرامت سے دوبارہ زندہ کردیا، اس وقت شری کرشن کی عمر صرف پانچ (۵) برس تھی۔

ہندو دیومالا کو نظیرؔ نے بہت خوش اسلوبی کے ساتھ تلمیحات کے سانچے میں ڈھالا ہے اور یہ نظیرؔ اکبر آبادی کا ہی خاصہ ہے کہ انھوں نے ہندو دیومالائی قصّوں کو بڑی حد تک اپنی شاعری میں برتا ہے۔

دنیا کی کوئی بھی زبان اس وقت مال دار سمجھی جاتی ہے جب اس کے پاس تلمیحات کا خزانہ وافر مقدار میں موجود ہو۔ عربی، فارسی، انگریزی، وغیرہ زبانوں میں دنیا کی اور دوسری زبانوں کی بہت سی تلمیحات موجود ہیں۔ اور ان زبانوں میں برابر نئی چیزوں کو اہمیت دی جاتی رہی ہے، جس سے زبان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف اردو میں تلمیحات کا ذخیرہ موجود تو ہے مگر کم ہے اور جو ہے اس کی شہرت اور مقبولیت کم ہو چکی ہے۔ نئی نسل ان تلمیحات سے اکثر نابلد ہے جیسا کہ محمود نیازی نے لکھا ہے کہ تلمیحات کی تشریح کتابوں کے کنارے لکھے فٹ نوٹ سے ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں تلمیح کی شہرت اور مقبولیت کم تو ہوگی ہی ساتھ ہی اصل واقعے کا علم قاری کو نہ ہو پائے گا اور شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے یا جس طرف وہ ذہن کو متوجہ کرانا چاہتا ہے اکثر پڑھنے والے شعر کی تہ تک نہیں پہنچ پاتے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کا نام لیتے ہی غدر کے وہ کربناک حالات ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں جن سے اہلِ وطن کو گزرنا پڑا تھا۔ جلیان والا باغ، ۱۹۴۷ء میں آزادی اور بٹوارہ وغیرہ کے علاوہ ایسی بہت سی تلمیحات ہیں جو خالص ہندوستانی رنگ رکھتی ہیں جن کی طرف ذہن بہت آسانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے اور ہم اپنے وسائل سے ہی وہ کام لے سکتے ہیں جو اب تک عربی اور ایرانی تلمیحات سے لیتے رہے ہیں۔ نظیر کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کچھ ناچ کی بہاریں پانی کے کچھ لتاڑے
دریا میں مچھ رہے ہیں اندر کے سو اکھاڑے

(آگرے کی تیراکی، نظیر اکبر آبادی)

اندر کا اکھاڑا یعنی محفل کا نام سدھرما (SUDHRMA) ہے جس میں دیوتا، اپسرائیں اور پریاں رہتی ہیں۔ وہاں حسینوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ موسیقی کے ساز پر ناچنے اور گانے کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ اندر کا اکھاڑا کنایۃً ایسی محفل کو کہتے ہیں جہاں حسینوں کا مجمع ہو اور حسن و جمال کی نمائش ہو رہی ہو۔

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے

زور بل دیو جی کا میلا ہے

بل دیو شری کرشن کے بھائی تھے۔ گوکل میں شری کرشن کے ساتھ رہتے تھے اور ساتھ میں متھرا بھی آ گئے تھے۔ جب شری کرشن نے رُکمنی کو اغوا کیا تو رُکمنی کا بھائی رُکم ایک بڑی فوج کے ساتھ ان کو پکڑنے کے لیے آیا، اور لڑائی کے لیے آمادہ تھا۔ شری کرشن رُکمنی کو لے کر نکل گئے اور بل دیو جی نے رُکم کا مقابلہ کیا۔ بل دیو نہایت تیز مزاج اور شراب کے عادی تھے۔ ان کا ہتھیار ہَل اور موسَل تھا۔

لے کر امیر حمزہ کے ہر بار نام کو
خلقت کو ان کی یاد دلاتی ہے شب برات

حضرت امیر حمزہؓ رسول اللہؐ کے چچا تھے، بہت بہادر اور جری تھے۔ نبوّت کے دوسرے سال ایمان لے آئے۔ لشکر اسلام کے علمبرداروں میں تھے۔ آپؓ جنگ احد میں شہید ہوئے۔ عتبہ ابن ربیعہ جس کو آپؓ نے جنگِ بدر میں قتل کیا تھا، کی بیٹی ہندہ نے شہادت کے بعد آپ کا جگر نکال کر چباڈالا اور جسم کے مختلف اعضا کو کاٹ کر دھاگے میں پرو کر بازو اور گلے میں پہنا تھا۔ رسول اللہؐ کو آپ کی شہادت پر بے حد صدمہ پہنچا۔ آپ کا لقب سید الشہدا ہے۔ پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

"زمانہ شباب میں وہ تہواروں میں خواہ موسمی ہوں، مذہبی ہوں یا سماجی خوب حصہ لیتے تھے۔ دراصل وہ ہر ملت و مذہب کے اندرونی اختلافات کو چھوڑ کر انسانی پہلو سے ہی لگاؤ رکھتے تھے۔ نظیرؔ کی دنیا آزاد و بے تکلف انسانوں کی دنیا ہے۔ جس میں آدم کی اولاد اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ موجود ہے۔"

متذکرہ بالا قول کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نظیرؔ کو انسانیت سے لگاؤ تھا۔ ان کے نزدیک انسان اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود اہم تھا۔ لہٰذا انھوں نے جہاں ایک طرف اہل ہنود کے تہواروں مثلاً ہولی، دیوالی اور ہندوستانی موسموں، رنگوں اور رسم و رواج کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے تو وہیں ہندوستانی تلمیحات کے ساتھ ساتھ اسلامی اور عربی تلمیحات میں حیدر کرار، حیدر صفدر، روز محشر اور روح الامین جیسی عربی تلمیحات سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

Atiqur Rahman
Research Scholar Dept. of Urdu,
Banaras Hindu University, Varanasi -221005
Mob. 9389231996
E-Mail: atiqjp2@gmail.com

اودھ میں اردو صحافت

عبید الرحمن

اردو صحافت کی تاریخ میں اودھ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔علم وفضل کی جو شمع یہاں روشن ہوئی اس نے پوری علمی دنیا کو منور کیا۔لکھنو ادبی ،تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا محور ومرکز رہا ہے۔بالعموم تہذیب وثقافت کے ایک منارہ نور کی حیثیت سے اسے جانا جاتا ہے۔لیکن یہ تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں علم کے بغیر ادھوری ہیں۔اصلاً تہذیب وثقافت کے جس زرّیں عہد کے لیے لکھنو جانا جاتا ہے وہی علم وفضل کے اعتبار سے بھی شہرت رکھتا ہے۔صحافت کا تعلق بھی اسی سے ہے۔

اشتہار سے نکل کر صحافت جس طرح علم اور معلومات کا ذریعہ بنی ہے وہ ہم سب پر عیاں ہے۔اودھ کی اردو صحافت اور یہاں کے صحافیوں نے چاہے وہ نوابی عہد رہا ہو یا اس کے بعد کے ادوار، یہاں تک کہ آزادی کا سورج طلوع ہوا۔لیکن ہر زمانے میں اس نے اپنی مرکزیت کو باقی رکھا۔

اودھ کے اولین اخباروں میں طلسم لکھنو اور سحر سامری کے نام آتے ہیں۔"طلسم لکھنو"۵ار جولائی ۱۸۵۶ء میں جاری ہوا۔مولوی محمد یعقوب انصاری اس کے ایڈیٹر تھے۔"سحر سامری"۷ار نومبر ۱۸۵۶ء کو جاری ہوا۔جس کی ادارت گھیر نرائن عیاش کرتے تھے۔اودھ میں اردو صحافت کے یہ اولین نقوش ہیں۔جنھوں نے آگے چل کر "اودھ اخبار" اور "اودھ پنچ" کے لیے راہیں ہموار کیں۔منشی نول کشور نے "اودھ اخبار" ۲۶ر نومبر ۱۸۵۸ء میں نکالا۔یہ اخبار اردو کے اعلیٰ درجہ کے اخباروں میں شمار کیا جاتا تھا۔رام بابو سکسینہ اس کے سلسلے میں یوں لکھتے ہیں:

"اودھ اخبار" جس کو منشی نول کشور صاحب نے ۱۸۵۸ء میں جاری کیا تھا اب بھی نکلتا ہے، بلکہ اس کا شمار ہمارے صوبے کے اعلیٰ درجے کے اور مشہور زمانہ اخباروں میں ہے۔"

(تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ،ص ۹۶ / مترجم مرزا محمد عسکری)

یہ ہفت روزہ اخبار تھا مگر چودہ سال کے بعد ہفتے میں دو بار پھر تین اور ۱۸۷۶ء میں دوسرے روز چھپنے لگا۔اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے سبب ۱۸۷۷ء میں یومیہ (روزانہ) کر دیا گیا۔بڑے بڑے ادیب اس اخبار کے مدیر رہے۔جن میں عبدالحلیم شررؔ، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، جالب دہلوی، نوبت رائے نظر، یگانہ چنگیزی اور مرزا شوکت تھانوی وغیرہ۔یہ اخبار ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کے لیے دستاویزی حیثیت کا حامل ہے حتیٰ کہ بعض حضرات نے اسے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تاریخی ماحول کی عکاسی کے سبب مستند دستاویز قرار دیا ہے جو اپنے ظریفانہ انداز میں اردو صحافت کے معیار و مذاق کو بلند کرتا رہا۔اسی پر بس نہیں بلکہ

اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں بھی اس نے اپنے انداز واطوار سے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔جسے آنے والی نسلوں نے مزید بلندی عطا کی۔یکم جنوری ۱۸۸۲ء کو لکھنو سے ہی "روزنامچہ لکھنو" شائع ہوا جس کے مدیر سید عبدالبصیر حضور بلگرامی تھے۔اس رسالے کے مالک خدا بخش خاں بنارسی تھے۔

یکم فروری ۱۸۸۵ء "کو دامن گل چیں" لکھنو کے محلہ کٹرہ ابوتراب خاں سے جاری ہوا۔اس کی سرپرستی مشہور زمانہ شاعر امیر مینائی فرماتے تھے۔اس میں لکھنو کے ان شعرا کے کلام کی اشاعت کو ترجیح دی جاتی تھی جو امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔

آگے چل کر اس رسالے کی ادارت امیر مینائی کے صاحبزادے لطیف احمد اخترؔ نے کی۔ان کا اپنا ایک انداز تھا۔مدیر کی طرف سے بطور شذرات جو سطور شائع ہوتی تھیں وہ ایک ایسی نثر کا نمونہ ہیں جس میں رعایت لفظی کے ساتھ جملوں کی تکمیل کی جاتی تھی۔بطور نمونہ چند سطور:

"دامن گل چیں دنیا میں صرف اس لیے نہیں آیا کہ ان ہمیشہ تر وتازہ رہنے والے پھولوں کو توڑے بلکہ اس کا کام اگر غور کر کے دیکھا جائے تو بہت نازک کام ہے۔کوئی نہیں جانتا کہ بہت کم ایسے ہیں اور شاذ ونادر ہی ایسے دماغ ہیں جو ان دلکش پھولوں کے باغ کہے جاسکیں"(دامن گل چیں،ص ۲۷۶)

مرزا محمد ہادی رسواؔ نے ۱۸۹۶ء میں رسالہ "اشراق" جاری کیا۔رسواؔ کے اس رسالے کا معیار بہت بلند تھا۔اس میں منطق، فلسفہ اور اخلاق پر مضامین شائع ہوتے تھے۔مگر یہ کچھ ہی دنوں کے بعد بند ہو گیا۔۱۹۰۶ء میں رسواؔ نے "الحکم" کے نام سے رسالہ جاری کیا۔یہ رسالہ اپنے معیاری مضامین اور علمی وتحقیقی مقالات کے لیے اہم تھا۔لیکن مالی تنگی کے سبب یہ بھی زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔مرزا رسواؔ کی علمی صلاحیت ولیاقت ان کے رسالوں کی اہمیت وخصوصیت کے لیے کافی ہے۔۱۸۹۱ء میں لکھنو سے ماہنامہ "گلچیں" جاری ہوا۔جو سید محمد عسکری وسیم خیرآبادی کی ذمہ داری میں شائع ہوتا تھا۔

لکھنو سے ہی ماہنامہ "روشنی" ۱۸۹۴ء میں شروع ہوا جس کی ادارت مرزا عبدالتقی قزلباش کرتے تھے۔جس نے نئے نئے ادبا وشعرا کی پورے طور پر رہنمائی کی۔لکھنو سے ۱۸۹۶ء میں "خدنگ نظر" نوبت رائے نظر کی ادارت میں شائع ہوا۔یہ رسالہ لکھنو کے مشہور ومعروف شعرا کے کلام برابر شائع کرتا رہا۔جن میں عزیزؔ، صفیؔ، ثاقبؔ، محشرؔ، چکبستؔ، بشن نرائن، دردؔ وغیرہ اہم ہیں۔اس رسالہ نے نظم ونثر دونوں صنفوں کی برابری کے ساتھ نمائندگی کی۔لکھنو سے جولائی ۱۹۰۹ء میں ماہنامہ "الناظر" مولانا ظفر الملک علوی نے جاری کیا۔یہ رسالہ علمی وادبی ہونے کے ساتھ اپنی نوعیت میں بھی منفرد تھا۔جس کے معرکۃ الآرا مضامین اس کی اہمیت کو مزید اہمیت و وقار بخشتے ہیں۔۳ر مارچ ۱۹۱۸ء کو لکھنو سے مشہور روزنامہ "اخوت" نواب ذوالقدر جنگ نے جاری کیا، جس کے مدیر مولانا فضل الرحمن تھے۔

اکتوبر ۱۹۱۸ء میں پنڈت برج نرائن چکبستؔ نے ایک ادبی وسیاسی رسالہ ''صبح امید'' جاری کیا۔ چکبستؔ کے اس رسالے کا مقصد اپنے خیالات کو اہل وطن تک پہنچانا اور ان کی اصلاح کرنا تھا۔ اس کے متعلق محمد علی جوہر لکھتے ہیں:

''۱۹۱۸ء میں چکبست نے ایک ادبی رسالہ 'صبح اِمید' کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالہ کا مقصد بھی بنیادی طور پر اپنے اصلاحی خیالات کو اہلِ وطن تک پہنچانا تھا۔ کتابوں پر ریویو کے علاوہ اس میں چند کالم خاص طور پر چکبستؔ کے لکھے ہوتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے تین ہی سال میں یہ رسالہ بند ہوگیا۔'' (لکھنو کا ادبی ماحول بیسویں صدی کے نصف اوّل تک، محمد علی جوہر، ص ۸۲، جنوری ۲۰۰۲ء)

علامہ نیاز فتحپوری کی ادارت میں مشہور ومقبول ماہنامہ ''نگار'' فروری ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا۔ جو ابتدا میں آگرہ میں چھپتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ لکھنو سے نکلنے لگا۔ ''نگار'' نے متعدد خصوصی شمارے شائع کیے۔ جن میں مصحفیؔ، نظیرؔ، ریاضؔ، داغ اور حسرتؔ پر خصوصی شمارے کے ساتھ ساتھ غالبؔ نمبر، علما نمبر، تنقید نمبر اور اقبال نمبر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جس سے ''نگار'' کی انفرادیت ظاہر ہے۔ لکھنو سے ہفت روزہ ''سچ'' جنوری ۱۹۲۵ء میں ظفر الملک علوی کی ادارت میں شائع ہوا۔ جو ۱۹۳۳ء میں ''صدق'' اور آگے چل کر ''صدق جدید'' کے نام سے جاری رہا۔ لکھنو سے ۱۹۲۵ء میں ہفتہ وار ''سرفراز'' جاری ہوا۔ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اپنے عہد کی نمائندگی کے سبب اہم ہے۔ کیونکہ اس نے سماجی، سیاسی اور مذہبی تمام امور پر خاطر خواہ مواد فراہم کیا اور خاص کر اس کا محرم نمبر تو بہت مقبول رہا۔ لکھنو کی صحافتی دنیا میں لکھنو سے جاری ہونے والا نسیم انہونوی کا ماہنامہ ''حریم'' ۱۹۳۱ء اور ہفت روزہ ''سرپنچ'' بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم ہیں۔

محکمہ ریاستی اطلاعات کا ترجمان ہفتہ وار ''ہماری آواز'' ۱۹۳۷ء سے جب شروع ہوا تو ۱۹۴۵ء میں ''اطلاعات صوبہ متحدہ'' کے نام سے موسوم ہوا۔ اس نام سے بھی زیادہ دنوں تک نہیں نکلا۔ ایک بار پھر اس کا نام بدلا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں اس کا نام ''نیا دور'' رکھا گیا۔ جو عہدِ حاضر تک اسی نام سے ماہنامہ کی شکل میں جاری ہے۔ اس کے بہت سے خصوصی نمبر شائع ہوئے جو بہت اہم ہیں۔ یہ ماہنامہ لکھنو سے شائع ہو رہا ہے۔

لکھنو سے حیات اللہ انصاری کی ادارت میں ۱۹۳۵ء میں ''ہندوستان'' جاری ہوا۔ جو ۱۹۴۲ء میں بند ہوگیا۔ لکھنو سے ہی ۱۹۴۵ء میں پنڈت جواہر لال نہرو اور رفیع احمد قدوائی کی کوششوں سے اردو روزنامہ ''قومی آواز'' جاری ہوا۔

منشی سجاد حسین کے اخبار ''اودھ پنچ'' نے اردو صحافت کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اس کا آغاز ۱۶؍جنوری ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ رام بابو سکسینہ 'اودھ پنچ'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''منشی سجاد حسین مرحوم نے لکھنو سے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نکال کر ہندوستانی اخبار نویسی اور

ادب اردو پر احسان عظیم کیا ہے۔ نثر کی ایک خاص شان پیدا کی۔ مذاق وظرافت جس سے اب تک ہمارا ادب خالی تھا۔ داخل نثر ہوئے۔ زبان میں بلیغ الفاظ شامل کرکے گرانقدری پیدا کی۔'' (تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص ۱۰۱)

کانگریسی فکر ونظر کا حامی یہ اخبار حسبِ موقع وضرورت ہندوستانی متمول حضرات کو نصیحتیں بھی دیتا رہتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اخبار ہندو مسلم اتحاد کا زبردست حامی تھا۔ دراصل یہ اخبار ظریفانہ طرز کا حامل ہے۔ اس میں مختلف ایسے لکھنے والے تھے، جن میں سے ہر ایک خاص مزاج ومذاق کا حامل تھا۔ جن میں مرزا مچھو بیگ، منشی احمد علی کسمنڈوی، پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ اور خود منشی سجاد حسین جو بڑے ظرافت نگار تھے۔ عبدالحلیم شرر اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''اودھ پنچ میں زبان اپنی اصلی شان میں دکھائی جاتی تھی جس میں مذاق کا پہلو غالب رہتا تھا۔ اس میں مختلف لکھنے والے تھے اور ہر ایک کا مذاق خاص لطف اور خاص خوبیاں رکھتا تھا۔'' (گزشتہ لکھنو ص ۱۴۶)

اسی اخبار میں پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ کا ناول ''فسانہ آزاد'' قسط وار شائع ہوا۔ یہ اخبار ''اودھ پنچ'' ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ ۱۸۸۲ء میں مولوی عبدالحلیم شررؔ لکھنوی نے ایک ہفت روزہ رسالہ ''محشر'' نام سے مولوی عبدالباسط کے نام سے نکالا۔ اس کی خوبی اور خصوصیت کے سلسلے میں عبدالحلیم شررؔ خود لکھتے ہیں:

''اسی زمانے میں ۱۸۸۲ء میں ''محشر'' نام کا ایک ہفتے وار رسالہ میں نے مولوی محمد عبدالباسط صاحب محشرؔ کے نام سے نکالا۔ جس کے ذریعے سے ایڈیسن کا رنگ اردو میں ایسے دلکش عنوان اور موزوں ومناسب الفاظ وخیالات میں پیش کیا گیا کہ ملک یک بیک چونک سا پڑا۔'' (گزشتہ لکھنو، عبدالحلیم شررؔ، ص ۱۴۷)

مولوی عبدالحلیم شررؔ محشرؔ کے ساتھ ساتھ اودھ اخبار کے کالموں میں بھی لکھتے رہے۔ جس سے لوگ ان کی انشا پردازی سے واقف ہوتے گئے اور اودھ اخبار کے کالموں میں مزید نکھار آتا گیا، ساتھ ہی شررؔ کی مقبولیت بھی روز بروز بڑھتی گئی۔ اسی درمیان شررؔ کی ملاقات مولوی بشیر الدین صاحب سے ہوئی جو اٹاوہ سے ''البشیر'' نکالتے تھے۔ مولوی بشیر الدین عبدالحلیم شررؔ کی صحافت وانشا پردازی سے واقف تھے۔ انھوں نے عبدالحلیم شررؔ کو ماہنامہ نکالنے کا مشورہ دیا۔ جس کو شررؔ نے قبول کیا اور ان کے ہی تعاون سے مولوی عبدالحلیم شررؔ نے جنوری ۱۸۸۷ء میں ''دلگداز'' جاری کیا۔ یہ سال ''دلگداز'' کی اشاعت ومقبولیت کے لحاظ سے اہم رہا۔ اسی دلگداز میں ۱۸۸۸ء میں عبدالحلیم شررؔ کا ناول ''ملک العزیز ورجینا'' قسط وار شائع ہوا۔ جس کی مقبولیت کے بعد عبدالحلیم شررؔ نے بہت سے ناول قسط وار اسی اخبار ''دلگداز'' میں شائع کیے۔ ''دلگداز'' عبدالحلیم شررؔ کی شہرت ومقبولیت کے لیے بہت اہم رہا ہے۔ اودھ کی صحافت میں گلدستوں کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ جس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا

ہے کہ کثیر تعداد میں اس طرح کے رسالے جاری رہے ہیں۔ جن میں گلدستۂ شعرائے لکھنو ۱۸۷۴ء، گلدستۂ سخن لکھنو ۱۸۷۶ء، پیامِ یار لکھنو ۱۸۸۲ء، رعنا لکھنو ۱۸۸۳ء، پیام عشاق لکھنو ۱۸۸۳ء، مرقع نگار لکھنو ۱۸۸۴ء وغیرہ اہمیت کے حامل رہے ہیں۔

آزادی سے قبل روزنامہ ''قومی آواز'' نے اردو صحافت کے وقار کو بلند کرنے کے ساتھ ساتھ صحافتی معیار کو بھی قائم کیا تھا۔ حیات اللہ انصاری، عشرت علی صدیقی اور محمد عثمان غنی وغیرہ نے اس کی ایسی آبیاری کی کہ مقبولِ عام و خاص رہا۔ ۱۹۷۰ء کے قریب عبدالجلیل فریدی نے ''روزنامہ قائد'' جاری کیا تھا۔ لیکن اس اخبار نے کوئی خاص اثر نہیں قائم کیا۔ ان کے علاوہ روزنامہ ''عزائم''، ''ان دنوں''، ''صحافت''، ''علی الصباح''، ''اودھ نامہ'' اور ''آگ'' کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جنھوں نے اودھ کی صحافت کو سجانے اور سنوارنے کے ساتھ ساتھ صحافتی شمع کو روشن رکھا ہے۔

کارپوریٹ گھرانوں نے جب سے اردو صحافت پر نگاہ کی ہے اس کا حلیہ ہی تبدیل کر دیا ہے۔ پہلے سہارا گروپ پھر اس کے بعد جاگرن بالترتیب روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' اور ''انقلاب'' کو جس طرح اپنی سرپرستی میں لے کر شائع کر رہا ہے اس طرح اسے اردو صحافت کا عہد زریں کہا جائے گا۔ اس وقت اودھ کے علاوہ پورے صوبۂ اتر پردیش میں ہر مقام پر اردو کے جن اخبارات کو ہم دیکھتے اور خریدتے ہیں وہ سہارا اور انقلاب ہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اخبارات نے اردو صحافت کے معیار کو بلندی عطا کی ہے۔

روزنامہ اخبارات کے علاوہ اودھ میں ادبی صحافت کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ ماہنامہ کی شکل میں ادبی صحافت کی اہم خدمات انجام دینے والے رسالوں میں علامہ شبلی نعمانی کی ادارت میں شائع ہونے والا ''الندوہ''، اس کے علاوہ ''نیا دور''، اردو اکادمی اتر پردیش سے شائع ہونے والا ماہنامہ ''خبر نامہ'' سے لے کر عہد حاضر تک رسالوں کی ایک کہکشاں ہے جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان ادبی رسالوں میں ''کتاب''، ''نئی نسلیں''، ''گلبن''، ''لاریب''، ''امکان'' وغیرہ اہم نام ہیں جن کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

موجودہ دور ٹکنالوجی کا ہے جس میں ہماری اودھ کی اردو صحافت ملک کی تعمیر و ترقی میں صحافتی خدمات بخوبی انجام دے رہی ہے اور صحافت کے معیار و مقام کو بھی بلند کر رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

Dr. Obaidurrahman
Post Doc. Fello,
Dept. of Urdu, Lucknow University
Mob. 9696332864,
Email: ubaidlko03@gmail.com

مولانا حسرتؔ موہانی کی صحافتی خدمات

زیبا خانم

دنیا بھر میں صحافت کو مملکت کی چوتھی اقلیم کا درجہ حاصل ہے۔ صحافت کا دائرۂ کار نہایت وسیع و عریض رہا ہے۔ یہ جہاں ایک طرف ہماری معلومات میں اضافے کا باعث بنتی ہے، وہیں دوسری طرف یہ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل میں بھی اہم رول ادا کرتی ہے۔ صحافت انتظام امن کی بحالی، معاشرے کی اقدار کے تحفّظ اور عوامی رجحانات کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ خلق کے بنیادی حقوق کی حفاظت کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ انسان روزِ ازل سے ہی کائنات کے نہاں خانوں کے رازِ سربستہ افشا کرنے کے لیے کوشاں رہا ہے۔ انسان کا یہی جبلّی جذبہ اس کی ترقی کا ضامن بنا۔ انھیں کوششوں کی وجہ سے ہمارے ہاتھ بے شمار علوم و فنون آئے۔ صحافت بھی انھیں فنون میں سے ایک فن ہے۔

آج صحافت انسانی زندگی کا اہم حصّہ بن چکی ہے۔ یہ انسانوں کے تئیں معلومات فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ ہماری زندگی کے کسی مخصوص پہلو تک محدود نہیں ہے، بلکہ مختلف گوشوں مثلاً سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی وغیرہ میں اپنی نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے۔

صحافت کے معنی خبر، اطلاع یا جانکاری کے ہیں، جسے اخبار نویسی یا جرنلزم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ لفظ صحافت، عربی زبان کے لفظ 'صحف' سے بنا ہے، جس کے معنی صفحہ، کتاب یا رسالے کے ہیں۔ لغت میں صحیفہ کے معنی وہ چیز ہے جس پر لکھا جاسکے۔ اس طرح صحیفہ اخبار اور جریدہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عبدالسلام خورشید نے اپنی کتاب 'فن صحافت' میں اس کی تعریف کچھ اس طرح بیان کی ہے:

> ''صحیفے سے مراد ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقفے کے بعد شائع ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام اخبارات و رسائل صحیفے ہیں اور جو لوگ اس کی ترتیب و تحسین اور تحریر سے وابستہ ہیں انھیں صحافی کہا جاتا ہے اور اس پیشے کو صحافت کہا جاتا ہے۔''

ڈاکٹر محمد شاہد حسین اپنی کتاب 'ابلاغیات' میں اس مفہوم کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''صحافت خبر ہے، اطلاع ہے، جانکاری ہے۔ صحافت عوام کے لیے، عوام کے بارے میں تخلیق کیا گیا مواد ہے۔ یہ دن بھر کے واقعات کو تحریر میں نکھار کر، آواز میں سجا کر، تصویروں میں سمو کر انسان کی اس خواہش کی تکمیل کرتی ہے، جس کے تحت وہ ہر نئی بات جاننے کے لیے بے چین رہتا ہے۔''1

ایک انگریز ادیب میتھیو آرنالڈ نے بڑے کم لفظوں میں صحافت کی مکمل اور جامع تعریف پیش کی ہے:

"Journalism is a literature in a hurry"

تاریخ شاہد ہے کہ آج تک دنیا کی جتنی بھی معروف ادبی وغیر ادبی شخصیتیں گذری ہیں، ان سب نے بقائے دوام کے لیے قلم کو ہی وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ یوں تو دنیا تصورِ انسانی کے دائرے سے باہر ہے۔ اس عظیم الشان افق پر بڑے بڑے ستارے روشن ہوئے اور وقت کی بے نوری نے انھیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ لیکن فلک پر کچھ ایسی ہستیاں بھی نمودار ہوئیں، وقت کی گرد جن کا کچھ بگاڑ نہیں پائی۔ وہ اپنی قلمی کاوشوں کی بدولت آج بھی زندہ ہیں۔ ایسے ہی صاحب کمال اور باوقار اشخاص میں حسرت موہانی نمایاں مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔

دورِ غلامی میں مولانا حسرت موہانی نے اپنی صحافتی و سیاسی صلاحیتوں کی بنا پر قوم و ملّت میں بیداری کی نئی روح پھونکی۔ حق پرستی، بے باکی اور دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے، تمام مصائب و آلام کو اپنے اوپر روا رکھا۔ حسرت کا شمار اردو کے ان نڈر اور حوصلہ مند صحافیوں میں ہوتا ہے، جن کی فعالیت کی وجہ سے صحافت کے معیار کو خاصی بلندی نصیب ہوئی۔

مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز رسالہ 'اردوئے معلی' کے اجرا سے ہوتا ہے۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ حسرت کو وکٹوریہ کالج گوالیار میں ریاضی اور عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا تھا لیکن انھوں نے ملازمت پسند نہیں کی اور ملازمت پر صحافت کو ترجیح دی۔ مولانا کے اخبار" اردوئے معلی" کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۹۰۳ء کو علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''اس رسالہ کا مقصد صرف ایک ہے یعنی درستی مذاق، چنانچہ اسی لحاظ سے امور مندرجہ ذیل کی پابندی کی جائے گی۔ مضامین نظم و نثر ہر طرح کے شائع ہوں گے۔ حصہ نظم میں صرف اس قسم کی نظمیں شائع کی جائیں گی جن کے انداز بیان میں کوئی خصوصیت ہو۔''2

حسرت موہانی کا یہ رسالہ بیک وقت ادب اور سیاست دونوں کا ترجمان تھا۔ تاہم اس کا ایک اہم مقصد سیاسی محاذ آرائی بھی تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب نہ ابوالکلام آزاد نے" الہلال" جاری کیا تھا، نہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی میدان صحافت و سیاست میں اپنی کوئی شناخت رکھتے تھے۔ گاندھی جی جنوبی افریقا میں بیرسٹری کر رہے تھے۔ جواہر لال نہرو لندن میں یکسوئی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب کہ حسرت" اردوئے معلی" کے ذریعے انگریزی حکومت کا تختہ پلٹنے اور سودیسی کے پرچار میں پورے شد و مد سے لگے ہوئے تھے۔ اردوئے معلی کے پہلے شمارے میں ہی قاضی تلمذ حسین کا مضمون 'پولیٹیکل سائنس' شائع ہوا۔ اس کا مقصد عوام کو سیاسی شعور سے آگاہ کرنا تھا۔ اردوئے معلی کے ابتدائی شماروں میں مسلمان اور پالیٹکس' مسلمانوں کی کانگرس سے علاحدگی، مسلمان اور کانگریس، مسلمانانِ ہند کا پالیٹکل مستقبل وغیرہ جیسے عنوانات سے مضامین کی اشاعت پر زور دیا گیا۔ نومبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں اعلان کیا گیا کہ اب اس رسالے کے زیادہ تر صفحات سیاسی مضامین کے لیے مختص ہوں گے۔

اردوئے معلی نے عوام میں محض سیاسی شعور و بیداری پیدا کرنے میں ہی حصہ نہیں لیا، بلکہ شروع سے ہی اس میں علمی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین کے ساتھ ساتھ نظم و نثر کی تنقید، خطوط، انشائیہ اور ادبی چشمکیں بھی جگہ پاتی تھیں۔ اس مجلے نے اردو کے قدیم ادبی سرمایے کی بازیابی کو یقینی بنایا اور قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ نہ صرف اتنا ہی بلکہ زبان و بیان کی غلطیوں اور معائب سخن کی گرفت پر بھی رسالے میں خصوصی توجہ دلائی گئی۔ اردوئے معلی کی جلدوں میں سیکڑوں اہم و غیر اہم شعرا کے تذکرے اور ان کے انتخابات بھی ہیں۔ خود حسرؔت کی بیشتر تحریریں پہلے اسی رسالے کی زینت بنیں۔ اس کے علاوہ شبلیؔ، شررؔ، چکبستؔ، امداد امام اثر، شادؔ، نظم طباطبائی اور پریم چند وغیرہ کے مضامین بھی بہ کثرت شائع ہوتے رہے۔

یہ رسالہ پانچ سال تک پابندی سے نکلتا رہا۔ ۱۹۰۸ میں مصر کے مشہور سیاست داں مصطفٰی کمال کے انتقال پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا گیا، جس میں ایک مضمون بعنوان' مصر میں انگریزوں کی پالیسی' شامل تھا۔ اس میں مضمون نگار کا نام درج نہیں تھا۔ مضمون میں مصر کے تعلق سے انگریزوں کی پالیسیوں کی زبردست مذمّت کی گئی تھی۔ یہ مضمون حسرت کا نہیں بلکہ علی گڑھ کے کسی طالب علم کا لکھا ہوا تھا۔ مولانا نے باوجود اصرار کے طالب علم کا نام پوشیدہ رکھا اور اس سرکشی کا سارا الزام اپنے سر لے لیا۔ اس باغیانہ مضمون کی اشاعت کے جرم میں مولانا کو دو سال قید اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ مولانا کے لیے رقم کی ادائیگی ناممکن تھی۔ چنانچہ اس کی حصولیابی کے لیے ان کا کتب خانہ محض ساٹھ روپے میں نیلام کر دیا گیا۔ کتب خانے میں کافی نایاب و نادر قلمی کتابیں تھیں۔ مولانا کو انگریزوں کی اس زیادتی پر بہت رنج ہوا۔ جس کا ذکر انھوں نے اردوئے معلی میں بڑے دکھ کے ساتھ کیا ہے:

''اس جرمانے کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلی کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم الحروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہنچایا تھا۔ جن کتابوں میں ایسے نادر و نایاب قلمی نسخے اور دواوین شعرا کے تھے، جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی، ان سب کو پولس کے جاہل جوان تھیلیوں میں اس طرح بھر بھر کے لے گئے، جس طرح لوگ لکڑی اور بھُس لے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بنانا تو درکنار کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گذری، اس کا ذکر کرتے ہوئے ہمارا دل دکھتا ہے۔ اس جبر وظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے۔''3

مولانا حسرت موہانی چند دنوں تک علی گڑھ جیل میں رہے، پھر انھیں الہ آباد سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ جیل میں ان کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا گیا۔ ان کی عینک اتروالی گئی۔ ان کی کتابیں اور اخبارات جلوا دیے گئے۔ انھیں روز ایک من گیہوں پیسنا پڑا۔ ۱۹/ جون ۱۹۰۹ء کو مولانا کو رِہا کیا گیا۔ باہر آئے تو اردوئے معلی کو دوبارہ

جاری کرنے کا ارادہ کیا۔کوئی پریس اسے چھاپنے کے لیے تیار نہ تھا۔اس لیے مجبوراً خود ہی دستی پریس لگایا، جوکہ کاٹھ کی ایک مشین اور تین پتھر پر مشتمل تھا۔اس کا نام اردو پریس رکھا۔بسااوقات وہ خود رسالے کی کتابت کرتے اور اسے پابندی سے نکالتے۔جنوری ۱۹۱۰ء سے جنوری ۱۹۱۱ء تک 'مشاہدات زنداں' کے عنوان سے جیل کی روداد شائع کرتے رہے۔

۱۲/اپریل ۱۹۱۳ء کو مولانا کو ایک نوٹس موصول ہوئی، جس میں لکھا تھا کہ اردوئے معلی میں چند الفاظ قانون کے خلاف چھپتے ہیں۔اس لیے ایک ہفتے کے اندر تین ہزار روپے ضلع مجسٹریٹ کے یہاں جمع کرائے جائیں۔اردو پریس کی مجموعی قیمت ۵۰ روپے سے زائد کی نہ تھی۔ایسے کم مایہ پریس سے اتنی بڑی رقم طلب کرنے کا ایک ہی مقصد تھا، پریس بند کرنا، سو وہ پورا ہوگیا۔لیکن مولانا کا حوصلہ اب بھی سلامت تھا۔اردوئے معلی کے آخری شمارے میں لکھتے ہیں:

''اگرچہ اردوئے معلی بند کر دیا گیا،مگر میری زبان، میرا دل اور میری قوت ہنوز آزاد ہے اور میں جس طرح پہلے کام کرتا تھا، اب بھی خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لوں گا۔''4

اس کے بعد حسرت نے بغیر ڈکلیریشن داخل کیے ایک سہ ماہی جریدہ 'تذکرۃ الشعرا' کے نام سے جاری کیا، اسے بجائے رسالے کے کتاب سے موسوم کیا۔ یہ سہ ماہی جریدہ جولائی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۰ء تک نکلتا رہا۔ درمیان میں یہ ۱۹۱۴ء میں حسرت کی نظربندی کی وجہ سے بند بھی ہوا۔ پابندی ختم ہونے کے بعد مولانا اسے دوبارہ نکالنے لگے۔ بالآخر ۱۹۲۰ء میں جب علی گڑھ جا بسے تو یہ رسالہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

تذکرۃ الشعرا میں شعرائے کرام کے تذکرے اور ان کے دواوین کے منتخبات شائع کیے جاتے تھے۔ ناسازگاریِ وقت کی وجہ سے اس کے صرف سات شمارے ہی منظر عام پر آسکے، تاہم ان کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ یہ مجلہ خالص ادبی تھا، جیسا کہ مولانا پہلے ہی فرما چکے تھے۔اس کی حیثیت اردوئے معلی کے ضمیمے کی سی تھی۔

۱۹۲۵ء میں مولانا حسرت موہانی نے ایک بار پھر سے اردوئے معلی نکالنے کی کوشش کی۔اس بار اس کا اجرا کانپور سے ہوا اور یہ بلا ناغہ ۱۹۴۲ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔اسی اثنا میں انھوں نے ۱۹۲۸ء میں 'مستقبل' نام کا ایک روزنامہ بھی جاری کیا، جو ۳۰/جون ۱۹۲۹ء تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔اس کے بعد یہ پیر اور جمعہ کے دن سہ روزہ کی حیثیت سے شائع کیا جانے لگا۔بعدازاں یہ ہفتہ وار کر دیا گیا، پھر اس نے ماہنامے کی شکل اختیار کرلی۔آخرکار ۱۹۳۶ء سے اسے اردوئے معلی کے ضمیمے کے طور پر نذر قارئین کر دیا گیا۔

اخبار مستقبل میں مراسلات، اشتہارات، ملکی وغیر ملکی خبروں کے ساتھ حالات حاضرہ پر مضامین چھپتے تھے۔مستقبل کے سب سے اہم مشمولات میں مولانا کے اداریے ہیں، جو اندرون ملک و بیرون ممالک کی سیاست پر ان کی علمی بصیرت کے عکاس ہونے کے ساتھ، ان کی حق گوئی، جرأت مندی اور بےباکی کے مظہر بھی ہیں۔

مولانا کا شمار آزادی کے ان متوالوں میں ہوتا ہے جو اس کی حصولیابی کے لیے اعلانیہ کوشاں تھے۔وہ جہاں کہیں بھی لوگوں کو اکٹھا دیکھتے، اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتے۔ ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے احمد آباد اجلاس کے موقع پر حسرت نے مکمل آزادی کی پہلی تجویز پیش کی۔حسرت نے اپنی تقریر میں کہا:

''مہاتما گاندھی نے ناگپور کانگریس میں کہا تھا کہ اگر مظالم پنجاب اور خلافت کی گورنمنٹ نے تلافی نہیں کی تو وہ اعلان آزادی کر دیں گے۔میں چاہتا ہوں اب جب کہ اس تجربے میں ایک سال ضائع ہوگیا ہے، مہاتماجی اپنا وعدہ پورا کریں۔مظالم پنجاب اور خلافت کا اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا جب تک کہ برطانوی امپیریلزم کو تباہ کر کے حریت کامل کے لیے مزید کوشش کر کے ان کے اعادہ کو ناممکن نہ بنا دیا جائے''5

یہ الگ بات ہے کہ اس وقت ان کی حمایت میں ایک بھی ہاتھ بلند نہ ہوا، لیکن جب اس کے آٹھ سال بعد لاہور میں جواہر لال نہرو نے آزادیِ کامل کی تجویز پیش کی، تو اسے اتفاق رائے سے قبول کرلیا گیا۔اسے مولانا کی بدقسمتی ہی کہیں گے کہ جس مکمل آزادی کا تصور انھوں نے پیش کیا، اس کی تعبیر کسی اور کے حصے میں آئی۔ بہرکیف اردو کے اس درویش صفت شاعر، صحافی اور سیاست داں کا انتقال ۱۴/مئی ۱۹۵۱ء کو لکھنو میں ہوا اور اسی کے ساتھ صحافت کے ایک دور کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

1۔ بحوالہ اردو صحافت اور سرسید احمد خاں، عبدالحی، ص 16

2۔ اردو صحافت اور حسرت موہانی، ڈاکٹر شریف الدین، ص 126

3۔ اردو صحافت اور تحریک آزادی، ڈاکٹر سمیع احمد، ص 124

4۔ تاریخ صحافت اردو، جلد سوم، امداد صابری، ص 9

5۔ مرقع اجتماعات، احمد آباد ۱۹۲۱، زاہد نعمانی قادری، حسرت موہانی حیات و خدمات، شاہد ماہلی

☆☆☆☆☆

Zeba Khanum
Research Scholar Dept. of Urdu,
B.H.U. Varanasi-221005,
Mob. 7505257276,
E-Mail: zeba.bhu@gmail.com

ادب اور عوامی ذرائع ترسیل

محمد محسن رضا

ادب میں ادیب اور قاری کی اہمیت اور مقام و مرتبہ کا مسئلہ ہمیشہ سے زیر بحث رہا ہے۔ مگر آج کے اطلاعاتی، صنعتی اور جدید ٹکنالوجی کے دور میں خود ادب کی شناخت اور اس کا وجود ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے جس کو شمیم حنفی نے اپنے ایک مضمون ''اردو ادب کی موجودہ صورت حال'' میں اشوک باجپئی کے اداریے کے حوالے سے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

> ''خبر ادھر عرصے سے یہ پھیلتی رہی ہے کہ اکیسویں صدی میں ادب اور زبانوں کا خاتمہ قریب ہے۔ جو نیا اطلاعاتی سماج بنے گا، جسے علم پر مبنی سماج بھی کہا جاسکتا ہے، اپنے لیے ایک عالمی زبان گڑھے گا اور اس میں تخلیقیت کا اظہار ادب سے مناسبت رکھنے والے روایتی وسیلے کے بجائے کسی زیادہ مستقبل شناس کا انتخاب کرے گا۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ کتاب نامی انقلابی ایجاد کی موت کا وقت آگیا ہے۔''

سائنس و ٹیکنالوجی نے زندگی اور سماج کے ہر شعبے کو بے حد متاثر کیا ہے اور ان پر اس کے مثبت و منفی اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ صنعتی ترقی و جدید سائنسی ایجادات و انکشافات نے انسان کو ایک طرح سے ماضی و مستقبل کے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ایک طرف اپنے ماضی اور اپنی تہذیب و ثقافت سے بچھڑنے کا درد و غم ستا رہا ہے تو دوسری طرف مادی ترقی، خوش حال زندگی اور روشن مستقبل کی خواہش بھی سر اٹھا رہی ہے۔ اور انسان اسی دوراہے پر کھڑا ماضی و مستقبل کے پیچ و خم میں الجھ کر کشمکش بھری زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ وہ ان دونوں میں توازن قائم کرنے میں ناکام ہے۔ انسانوں کے اندر یہ کیفیت پیدا کرنے میں جدید سائنسی ایجادات و انکشافات اور غیر متوازن صنعتی و معاشی ترقی کا رول سب سے اہم اور زیادہ ہے۔ جس میں عوامی ذرائع ترسیل خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، شامل ہیں۔

ادب لفظوں کے ذریعہ حسن ترتیب و تنظیم کے ساتھ جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کے اظہار کا نام ہے۔ ادب سماج کا پروردہ بھی ہوتا ہے اور سماج کا رہنما اور پیشرو بھی۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو نہ ''انگارے'' کو ضبط کیا جاتا اور نہ ''سوز وطن'' کو۔ اور نہ ہی ہٹلر کے ذریعہ جرمنی کے ادب کا معیار متعین کیا جاتا یہاں تک کہ افلاطون بھی شاعری کو ملک بدر نہیں کر پاتا۔ بہر کیف، ادب فکر و فن کے مجموعے کا نام ہے جس میں ایک کو جسم اور دوسرے کو اس کی روح قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک واقعہ اگر کوئی رپورٹر بیان کر رہا ہے تو وہ واقعہ خبر

ہے، اور وہی واقعہ اگر کسی فنکار کا موضوع بن جائے تو ادبی شاہکار ہے۔ ادب میں فکر و فن دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔ ادب کا مقصد کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے قطع نظر اس سے ادب اپنے مقصد سے اسی وقت ہم آہنگ ہو سکتا ہے جب اس کی ترسیل ممکن ہو۔

تحریر کے وجود میں آنے سے قبل انسان اشاروں کے ذریعہ یا مکمل زبانی بول کر ابلاغ و ترسیل کا کام انجام دیتا رہا اور اپنے جذبات و احساسات اور خیالات و تجربات کو ایک دوسرے سے شیئر کرتا رہا۔ پھر حروف، الفاظ اور رسم الخط کے وجود میں آنے کے بعد تحریری ترسیل کا دور شروع ہوا۔ یہ تحریری ترسیل اشاراتی اور زبانی ابلاغ و ترسیل پر بہت جلد حاوی ہوگئی اور عرصۂ دراز تک ذرائع ابلاغ پر اپنی بالادستی قائم رکھے ہوئے تھی۔ اس تحریری ترسیل کی بالادستی کو سب سے پہلے طباعتی ترسیل نے متاثر کیا جس کا دور تقریباً 1500ء سے 1900ء تک ہے جس میں چھاپہ خانے کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ پھر میڈیا اور صحافت کا دور شروع ہوا جس میں پرنٹ میڈیا اور بالخصوص الیکٹرانک میڈیا نے تحریری ترسیل کی بالادستی تقریباً ختم کردی اور عوامی ذرائع ترسیل و ابلاغ میں سرفہرست آگئی۔

عوامی ذرائع ترسیل سے مراد ابلاغ و ترسیل کے وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعہ عوام و خواص بڑے پیمانے پر ایک دوسرے کے خیالات و نظریات، جذبات و احساسات اور واقعات و حادثات سے آگہی حاصل کرتے ہیں، اسے ماس میڈیا اور پاپولر کلچر بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں شامل ہیں۔

عوامی ترسیل و ابلاغ ایک دوطرفہ عمل ہے۔ اس کے مثبت پہلو ہیں تو منفی اثرات بھی ہیں۔ یہ ایک دو دھاری ہتھیار کے مانند ہے جس کا استعمال ایک طرف سماجی، معاشی ترقی کو تیز کرنے اور آزادی و جمہوریت کے آفاق کو وسعت دینے کے ساتھ بین الاقوامی ربط و ضبط اور اپنے وقار کو قائم کرنے کے لیے کیا جاسکتا ہے تو دوسری طرف آزادی کو کچلنے، جمہوری نظام کی جڑیں اکھاڑنے، ملک اور اقوام کے درمیان نفرت و دشمنی پیدا کرنے اور عوام کو کسی خاص رجحان یا نظریے کی طرف مائل کرنے کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے۔ عوامی ذرائع ترسیل سے جہاں علوم و فنون، سائنس اور تعلیم و تفریح کے وافر سامان مہیا ہو رہے ہیں وہیں یہ انسانی جذبات و احساسات اور فکر و خیالات کو بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر کر رہی ہے۔ جس میں ادب بھی شامل ہے۔

آج ہم جس دور میں اور جس سماج میں زندگی بسر کر رہے ہیں اسے اطلاعاتی سماج کا دور کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ زندگی اور سماج کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو انفارمیشن ٹکنالوجی سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اخبارات، رسائل، اشتہارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن، کیسٹ، سیٹلائٹ اور انٹرنیٹ نے ترسیل و ابلاغ کی دنیا کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے بالخصوص الیکٹرانک میڈیا نے دنیا میں نشریات کا ایسا جال بچھا دیا ہے کہ وسیع و عریض دنیا سمٹ کر ایک گلوبل ویلیج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب پر بھی جدید عوامی ذرائع ترسیل کے مثبت اور منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔اس میں کوئی کلام نہیں کہ ماس میڈیا ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔اس نے ادب کو درباروں اور مجلسوں کی چہار دیواری سے نکال کر عوام کے گھروں میں داخل کر دیا۔آج سینکڑوں اخبارات اور ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ریڈیو، ٹیلی ویژن، کیسٹ کے ذریعہ بھی ادب کو فروغ مل رہا ہے اور انٹرنیٹ نے تو ان سب کو یکجا کر کے عوام کی رسائی کو مزید آسان کر دیا ہے۔ان کی مدد سے ادبی تخلیقات عوام تک بآسانی پہنچ رہی ہیں۔جس کی وجہ سے ادب کے قارئین کی تعداد میں بھی آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔یہ اضافہ ادب کی تخلیق میں اضافے کا سبب بن چکا ہے۔یہ عوامی ذرائع کی مدد سے ادب کے فروغ کا مثبت پہلو ہے۔

بلاشبہ ادب کی نشر و اشاعت میں عوامی ذرائع ابلاغ و ترسیل کلیدی رول ادا کر رہا ہے اور اس سے زبان و ادب کا ارتقا ہو رہا ہے۔اگرچہ ان کا بنیادی مقصد ادب کی ترویج و اشاعت نہیں ہے پھر بھی ضمناً ادب کا فروغ ہو رہا ہے مگر فائدہ سے کہیں زیادہ ادب کا نقصان ہو رہا ہے۔کئی زاویے سے ادب پر اس کے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے ادب کی روح مجروح ہو رہی ہے اور سنجیدہ ادب اور قارئین کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے۔

جدید عوامی ذرائع ترسیل نے نہ صرف ادب کی روح کو متاثر کیا ہے بلکہ ہمارے جذبات و احساسات کو بھی کچل کر رکھ دیا ہے۔آج بھی کفن، اپنے دکھ مجھے دے دو، ہتک جیسے واقعات ہوتے ہیں۔بدھیا، سوگندھی، کالو بھنگی، اندو، سکینہ جیسے کردار بھی ہیں اور ان پر کہانیاں بھی لکھی جاتی ہیں مگر ان میں جذبات و احساسات کی وہ شدت نہیں ملتی جو ہمیں متاثر کر سکے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح کے واقعات و حادثات سے عوامی ذرائع ترسیل کی مدد سے ہر روز ہمارا سابقہ پڑتا ہے۔اس طرح کے واقعات بلکہ کوئی بھی واقعہ اب ہمارے لیے بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے۔چوری، ڈکیتی، قتل، ظلم، استحصال، ناانصافی یہ سب عام سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔یہ ہمارے قوت احساس کو نہیں جگا سکتے۔یہ اس وقت کے ادب میں بھی ہو تو ایک خبر کے سوا کچھ نہیں جو ہمیں پہلے سے معلوم ہے۔

جدید ذرائع ترسیل ہماری ذہنی و فکری آزادی کو غلام بنا کر ادب کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ہمارے حال و مستقبل بلکہ روزمرہ کے معمولات کا بھی فیصلہ ماس میڈیا کرتا ہے کہ ہم کیا سوچیں، کیا دیکھیں، کیا کھائیں، کیا پہنیں، کیا خریدیں، کیا پسند کریں، کیا ناپسند کریں، کیا پڑھیں، کیا نہ پڑھیں وغیرہ۔اس میں بھی سیاسی نظام کا اہم رول ہوتا ہے۔یہ ہمیں بلاواسطہ اظہار رائے کی آزادی دیتا ہے اور بالواسطہ ماس میڈیا کی مدد سے ہماری رائے کی نوعیت کا فیصلہ خود کرتا ہے۔یہ ذہنی و فکری غلامی بنام آزادی ادب اور ادیب دونوں کے لیے مہلک ہے۔یہ برسراقتدار طبقہ میڈیا پر جن کا کنٹرول ہے ادیب کو ایک طرف یا تو صرف تفریح نگار بنا دیتے ہیں یا دوسری طرف محض

پرچارک، جو کسی سیاسی پارٹی کی ہر آن بدلتی ہوئی پالیسی کے مطابق اپنی تحریر بدل سکے۔جب کہ یہ بات واضح ہے کہ جبر ادب پیدا نہیں کر سکتا۔جب تک ادیب بے ساختگی اور آزادی سے نہیں لکھتا ادبی تخلیق ناممکن ہے۔ادبی تخلیق کو ذہنی ایمانداری سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔تخیل قید میں بار آور نہیں ہو سکتا۔جب ذہنی آزادی فنا ہو جاتی ہے تو بقول ممتاز شیریں ''ادب مر جاتا ہے۔''

عوامی ذرائع ابلاغ و ترسیل کسی بھی ملک کی تعمیر و ترقی میں چوتھے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔لہٰذا یہ بالواسطہ یا بلاواسطہ برسراقتدار طبقے کے کنٹرول میں ہوتے ہیں اور ان کی پالیسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔اس کے لیے انھیں خود غیر جانب دار ہوتے ہوئے بھی جانبداری کا ثبوت پیش کرنا ہوتا ہے۔چہ جائیکہ ہم ان سے ادب کی آفاقیت اور غیر جانبدارانہ رویے کو برقرار رکھنے کی امید رکھیں۔ان کا بنیادی مقصد تجارت و معیشت ہے اور یہ اپنے مقصد میں اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب ان کے قارئین، ناظرین اور سامعین کی تعداد میں اضافہ ہو۔اس لیے وہ انھیں ادبی تخلیقات کو قابل نشر و اشاعت سمجھتے ہیں جو ان کے مقصد کے حصول میں معاون ہوں۔جس سے نہ صرف ادیب و قاری کے جذبات و احساسات اور افکار و نظریات متاثر ہوتے ہیں بلکہ زبان و اسلوب بھی متاثر ہوتے ہیں۔مختصر یہ کہ جدید عوامی ذرائع ترسیل ادبی تخلیقات کی ترسیل و ابلاغ میں معاون ضرور ہیں مگر یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہے کہ کیا یہ ادب کے فروغ میں بھی معاون ہیں؟

☆☆☆☆☆

کتابیات:

(1) دیویندر اسر، ادب کی آبرو، سنجو آفسیٹ پرنٹرز کرشن نگر، دہلی، 1996ء
(2) محمد خاور نوازش (مرتب)، ادب، زندگی اور سیاست، مثال پبلشرز فیصل آباد، 2012ء
(3) دیویندر اسر، عوامی ذرائع ابلاغ، ترسیل اور تعمیر و ترقی، (مترجم) شاہد پرویز، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 2002ء

☆☆☆☆☆

Md. Mohsin Raza
126 Jhelum Hostel, JNU,
New Delhi- 110067,
Mob. 8506928945,
E-Mail: mohsinrazajnu@gmail.com

رہبر قوم مولانا ابوالکلام آزاد کے تصور تعلیم کے جہات

شبنم شمشاد

ابوالکلام آزاد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ ایک سیاست داں،مدبر،معلم،مصنف،ماہر تعلیم،مترجم،صحافی،صاحب طرز ادیب،شاعر اور مذہبی رہنما بھی تھے۔انھوں نے اپنی علمیت،اہلیت اور فعال طبیعت سے انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا ہے۔انھیں ایک فرد کے بجائے اگر ایک ادارہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ان کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا۔مذہب،فلسفہ،منطق،فنون لطیفہ اور سماجی علوم کے علاوہ وہ کئی زبانوں کے ماہر بھی تھے۔فرانسیسی،انگریزی،فارسی،ترکی،اردو کے ساتھ ساتھ عربی کے عالم بھی تھے جو ان کی مادری زبان بھی تھی۔انھیں موسیقی سے بھی شغف تھا۔مولانا آزاد نے ہندستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ساہتیہ اکادمی،للت کلا اکادمی،سنگیت کلا اکادمی،یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن،کونسل فار ہسٹوریکل ریسرچ،کونسل فار سوشل سائنس اینڈ ریسرچ،این سی ای آر ٹی اور سائنس وٹکنالوجی سے جڑے متعدد ادارے انھوں نے قوم کو دیے ہیں۔وہ ہندستان کی جدوجہد آزادی میں سرگرم عمل رہے اور کئی بار جیل بھی گئے۔فرنگیوں اور ان کے نظام حکومت کے خلاف عدالت میں ان کا بیان ”قول فیصل“ کافی جرأت مندانہ تھا۔انھوں نے اپنی انگریزی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں ہندستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ان کی تصنیف ”غبار خاطر“ جو بظاہر خطوط کا مجموعہ ہے جو حبیب الرحمان خاں شیروانی کو جیل میں لکھے گئے اور کبھی پوسٹ نہیں ہوئے،اردو ادب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ابوالکلام آزاد تقسیم ہند کے خلاف تھے اور ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کی بات کرتے تھے۔ان کا شمار ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے محافظوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے اخباروں میں سے ”الہلال اور البلاغ“ میں اپنے نظریوں اور خیالوں کی خوب تشہیر کی اور ہندستان کے مسلمانوں کے لیے صحیح راستوں کا تعین کیا۔ان کا ایک بڑا کارنامہ ”ترجمان القران“ ہے جس کے حوالے علمی ومذہبی مباحث میں آج بھی دیے جاتے ہیں۔

مولانا آزاد بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی تھے۔ان کی فکر وعمل کا سرچشمہ وہ انسانی اور اخلاقی اقدار تھیں جو مذہب کی بنیاد ہیں۔انھوں نے ”ترجمان القرآن“ میں ”سورۂ فاتحہ“ کی تفسیر کرتے ہوئے تعلیم کے مقصد کا خلاصہ کیا ہے جس میں تمام انسانوں کی طرف مساوات کا رویہ پیدا کرنے کو تعلیم کا نام دیا ہے۔ہر فرقہ اپنے آپ کو افضل سمجھتا ہے جو فساد اور باہمی کشمکش کی جڑ ہے۔اگر تعلیم انسانی مساوات کو اپنا لائحہ عمل بنالے تو یہ عالمی امن وآشتی کی راہ میں ایک بڑا قدم ہوگا۔پھر انسان ایک دوسرے سے علیٰحدگی کے بجائے یگانگت محسوس کرے گا اور تعلیم

مختلف فرقوں میں فصل پیدا کرنے کے بجائے وصل پیدا کرے گی،توڑنے کے بجائے جوڑے گی کہ نوع انسانی کا ایک ہی پروردگار ہے جو نسل ومذہب،ملک وقوم کی بنا پر اپنے بندوں کے درمیان فرق نہیں کرتا۔ایسا لگتا ہے کہ مولانا آزاد ہندستان کے عام تعلیمی نظام میں دینی تعلیم کے حق میں تھے۔اس خیال کا اظہار انھوں نے وزیر تعلیم،حکومت ہند کی حیثیت سے بھی اپنے ایک صدارتی خطبے میں کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

> ”اس کا کیا نتیجہ ہوگا اگر حکومت محض خالص سیکولر تعلیم کی ذمہ داری نبھائے۔اس صورت میں قدرتی طور پر لوگ اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم کا انتظام نجی طور پر کریں گے لیکن جو لوگ پہلے سے مذہبی تعلیم دیتے چلے آرہے ہیں،ان کے نزدیک مذہب کے معنی تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔
> ۔۔۔اگر ہم اپنے ملک کی دانشورانہ زندگی کو اس خطرے سے بچانا چاہتے ہیں،تو ہمارے لیے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ابتدائی مذہبی تعلیم کو نجی اداروں پر نہ چھوڑیں۔“(سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کا اجلاس،۱۳جنوری ۱۹۴۸ء)

اس خطبے سے اشارہ ملتا ہے کہ مولانا مذہب کو نظام تعلیم کا جزو بنانا چاہتے تھے۔لیکن ایک بڑے فرق کے ساتھ۔ان کا مذہب اس سے بالکل مختلف تھا جس کی تعلیم عام طور پر دینی مدارس اور دھارمک پاٹھ شالاؤں میں دی جاتی تھی،جہاں مذہب کے نام پر تنگ نظری اور تعصب پھیلایا جاتا تھا۔مولانا آزاد سیاسی میدان میں ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے تو تہذیبی معاملات میں مشترکہ تہذیب کے وکیل۔مولانا کے نزدیک متحدہ قومیت کے معنی یہ ہرگز نہیں تھے کہ تعلیم میں مسلم تہذیب کی امتیازی خصوصیات کو نظر انداز کر دیا جائے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سمپورنانند جی کی اس تقریر پر سخت نقطہ چینی کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ وہ تعلیم وتہذیب کے معاملہ میں ہندو مسلم امتیاز دیکھنا پسند نہیں کرتے اور اسی بنیاد پر اردو کو نصاب تعلیم سے خارج کرنا جائز سمجھتے ہیں۔مولانا کے نزدیک زبان و ادب،تاریخ،مذہب اور فنون لطیفہ کا تعلیم میں خاص مقام ہے،اس لیے ان مضامین کو تعلیم کا لازمی جزو ہونا چاہیے۔وہ متحدہ قومیت کے قائل تھے اور بیک وقت ایک اچھے مسلمان اور سچے ہندستانی ہونے میں کوئی تضاد نہیں دیکھتے تھے۔

مولانا حقیقی معنی میں ایک مفکر اور عالم تھے۔ان کا دائرہ عمل نہایت وسیع تھا۔ان کی نظریں زمانے کے پیچ وخم سے خوب آگاہ تھیں۔وہ مصالح ملکی اور تعلیم کے منصب کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔انھوں نے اپنی نگارشات میں اپنے تعلیمی خیالات کا خوب اظہار کیا ہے۔ان کی زندگی میں حیرت انگیز طور پر اتحاد فکر کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔”تذکرہ“ میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

> ”انسان کے لیے معیار شرف،جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم وعمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل“۔

ان کا یہ عقیدہ تمام عمر ان کے ساتھ رہا۔مولانا آزاد نے اپنے زمانے کے عام دینی رہنماؤں کی طرح

مذہب کو ایک جامد اور مافوق البشر تصور تک ہی محدود و پابند نہیں رکھا تھا اور نہ ہی دور حاضر کی مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر سطحی عقلیت کے سیلاب میں بہہ نکلے۔ وہ دین، فلسفہ اور سائنس کے مقام کا بیک وقت درک رکھتے تھے۔ مولانا نے ایک پریس کانفرنس میں تعلیم اور قومی تشکیل کے سلسلے میں چند اہم اور بنیادی امور کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ان میں ایک مذہبی تعلیم کا مسئلہ بھی تھا جہاں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مذہبی تعلیم کا مقصد وسیع النظری، رواداری اور انسان دوستی ہونا چاہیے۔

مولانا آزاد تعلیم کو زندگی کی تیاری سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد سماجی ضرورتوں کے پیش نظر افراد کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا جانا چاہیے کہ طلبا کی قابلیت کی سطح بلند ہو۔ انھوں نے تعلیم میں آزادی کے تصور کو سراہا۔ وہ ثانوی تعلیم میں کچھ اس طور سے تبدیلی چاہتے تھے کہ وہ خود تکمیل علم کی ایک منزل قرار پائے تاکہ بیشتر طلبا اس منزل کو طے کرنے کے بعد زندگی میں داخل ہوسکیں۔ اس غرض سے انھوں نے کثیر المقاصد ثانوی مدارس کی تجویز پیش کی۔ آج مولانا آزاد کی یہ بات پرزور طریقے سے دہرائی جارہی ہے اور حکومت کی کوشش ہے کہ کسی بھی طور پر اعلیٰ تعلیم کے میدان میں نااہلوں کے داخلے کی روک تھام کی جائے۔ ان کے نزدیک ہر فرد کو ایسی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے جو ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو مولانا کے فلسفہ تعلیم سے ہندستان کا تعلیمی نظام پوری طرح متاثر نظر آتا ہے جہاں سچی دینداری، عقائد کی پختگی، انسان دوستی، عدل وضبط جیسی اقدار کی پاسداری موجود ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد تقریباً بارہ برس ہندستان کے وزیر تعلیم رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے جو خطبات دیے، ان کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی تعلیمی فکر میں بڑی جامعیت تھی۔ وہ تعلیم کا ایک ایسا تصور رکھتے تھے جس میں ماضی کا ادراک، حال کی بصیرت اور مستقبل کی آگہی تھی۔ مولانا کے تعلیمی تصور پر غور کرتے وقت ہمیں سیاسی تناظر کو پیش نظر رکھنا چاہیے جس میں ان کے ایک قومی نظریے کو زبردست دھکا لگا اور ملک تقسیم ہوگیا جس کی وجہ سے مشترکہ قومی نظریہ کی پسپائی ہوئی لیکن انھوں نے ہار نہیں مانی اور اپنی سربراہی میں ایسی تعلیمی پالیسیاں وضع کیں جس کی وجہ سے آج دنیا میں ہندستان کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مولانا آزاد کو ہندستان میں جدید تعلیم کا معمار کہا جاسکتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے مولانا آزاد کی تعلمی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

”ہندستان میں تعلیمی نظام کا پورا ڈھانچہ مولانا آزاد ہی کا بنایا ہوا ہے۔“ (ابوالکلام کے تعلیمی نظریے، ایوان اردو، آزاد نمبر ۱۹۸۸ء)

مولانا آزاد کے خیالات اور افکار تعلیم پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی تعلیمی فکر کے حامل تھے جس میں مشرق ومغرب کے جدید فکری رجحانات پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور ان افکار میں مولانا آزاد کا تصور تعلیم نمایاں طور پر منعکس نظر آتا ہے۔ یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا آزاد نے دینی مدارس کو جدید

بنانے کے لیے مشورہ دیتے ہوئے نصابات میں فلسفہ اور سماجی و سائنسی علوم کی شمولیت پر بھی زور دیا ہے۔ (خطبہ صدارت، عربی نصاب کمیٹی، ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء، لکھنو)

یہاں انھوں نے مادری زبان کی اہمیت پر بھی زور دیا اور مشورہ دیا کہ ابتدائی تعلیم ہمیشہ مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ مولانا نے تعلیم، زمانہ اور وقت کے باہمی رشتے پر بھی اظہار خیال کیا۔ کہتے ہیں:

”وقت اور زندگی کی چال کے متعلق کوئی تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔۔۔ اگر آپ دونوں ٹکڑوں کو الگ رکھیں گے تو وہ تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ آپ کی تعلیم کو زمانے کی مانگوں سے کوئی رشتہ نہیں اور زمانے نے آپ کے خلاف آپ کو نکما سمجھ کر فیصلہ دے دیا ہے“۔ (خطبات آزاد، مرتبہ مالک رام)

مولانا آزاد کی فلسفہ تعلیم پر گہری نظر تھی۔ رادھا کرشنن (سابق صدر جمہوریہ ہند) کی مشرق اور مغرب میں فلسفہ کی تاریخ پر لکھی گئی کتاب کے دیباچہ میں مولانا نے مشرق ومغرب کی مشترکہ آگہی پر زور دیا اور فرد اور سماج کے باہمی رشتے کی اہمیت بیان کی اور اس کو صحیح تعلیم سے تعبیر کیا۔ مولانا کے خیال میں محض روٹی روزی انسان کی تعلیم کا مقصد نہیں بلکہ انسان کی تعمیر نو اور آزاد شخصیت کی نشوونما تعلیم کا عین مقصد ہے۔ خواجہ غلام السیدین نے مولانا کے تعلیمی فلسفے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا کے سامنے تعلیم کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا بہتر افراد کی تربیت یعنی ایسے افراد جن کی ذات میں بلند نظری، جرأت، رواداری اور دیانت داری ہوتا کہ ان کے ذریعہ ایک بہتر سماج کی تشکیل ہوسکے۔

مولانا آزاد نے سرسید احمد خاں کے مذہبی اور تعلیمی کارناموں کو سراہا ہے لیکن ان کے بعض تعلیمی نظریوں کی تنقید بھی کی ہے۔ وہ مغرب پرستی کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی ثقافتی میراث سے بے تعلق ہو چکا ہے۔ مولانا کے ذہن میں تعلیم کا جو مقام تھا، نظری حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ قومی سطح پر تنظیم تعلیم کے نقشے میں مناسب مقام حاصل نہ کرسکا۔ اس کا انھیں افسوس بھی تھا۔ مولانا آزاد کا ماننا تھا کہ قوم کی اصلاح ایک موزوں نظام تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے جس کی خصوصیات انھوں نے یہ بتائی ہیں:

”چھے سے چودہ سال کے بچوں کے لیے لازمی تعلیم اور جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے، ناخواندہ بالغوں کے لیے سماجی تعلیم کا انتظام اور بالغوں کی تعلیم کے تصور میں وسعت پیدا کرنا، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ ان کے معیار کو بلند کرنا، ملکی ضرورتوں کے شایان شان ٹیکنیکل اور سائنٹفک تعلیم کا انتظام اور قومی تہذیب کو مالا مال کرنے کے لیے آرٹ اور فنون لطیفہ کی ترویج“۔ (مولانا آزاد کا فلسفہ تعلیم، خواجہ غلام السیدین، ص ۶۳)

☆☆☆☆☆

Shabnam Shamshad
Research Scholar Dept. of Urdu,
MANUU Hyderabad- 500032,
Mob. 8143120925, 7275419408,
E-Mail: shabnamshamshad123@gmail.com

اقبال کی اوّلین تصنیف (علم الاقتصاد)

تنویر عالم انصاری

بہت کم لوگ اس بات سے واقفیت رکھتے ہیں کہ علامہ اقبال جیسے عظیم المرتبت شاعر و فلسفی کی پہلی کتاب علمِ اقتصاد سے تعلق رکھتی ہے۔ ''علم الاقتصاد'' اقبال کی وہ باقاعدہ تصنیف ہے جسے بجا طور پر معاشیات کے موضوع پر اردو زبان میں لکھی گئی پہلی معیاری و جامع تصنیف کا درجہ حاصل ہے۔ اہل علم میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اقبال نے اسے دوبارہ شائع نہ کیا کیونکہ اردو داں طبقے میں اس موضوع کا زیادہ چرچا نہ تھا۔ بعد ازاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود اقبال کے افکار و نظریات میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ساتھ ہی علم کے اس شعبے میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال کی دلچسپی اقتصادی مسائل میں بنی رہی، چنانچہ اقبال کی تحریروں (نظم و نثر) میں یہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ''مضامین اقبال'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سب سے زیادہ عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے یہ ہے کہ، کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کر ان اسباب کا پتا لگائے جنھوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے۔ جو آج کل دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ کس حد تک اہل ملک کی تاریخی روایات، عادات و اوہام اور اخلاقی کمزوریوں نے حصہ لیا اور اگر گورنمنٹ کے طرز عمل کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے تو وہ کس حد تک ہے۔ جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے اسے چاہیے کہ مذہب و ملت کے اختلاف کی طرف سے خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے اس لیے کہ اقتصادی قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں۔''(۱)

۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اقبال اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ ریڈرشپ کے فرائض منصبی میں دیگر ادبی و علمی بالخصوص انگریزی کتابوں کے تراجم کے علاوہ انھیں تاریخ اور پولیٹکل اکانومی Political Economy کی تدریسی ذمہ داری دی گئی۔ (۲) اس وقت فاسٹ (FAWCETT) (۳) کی "Political Economy for Beginners" نصاب میں شامل تھی، جہاں ایک طرف انھوں نے Walker

(۴) کی کتاب "Political Economy" کا ملخص ترجمہ کیا وہیں دوسری طرف کالج کے طلبا کو اقتصادیات پر درس بھی دیتے رہے۔ تعلیمی زندگی میں اقبال کی توجہ عربی انگریزی اور فلسفے کی طرف رہی۔ اقتصادیات ان کے لیے نیا علم تھا، مگر تدریسی تقاضوں کے مدنظر انھوں نے اس کا بہ غائر مطالعہ کیا۔

علامہ اقبال کی یہ کتاب (علم الاقتصاد) عرصۂ دراز تک نایاب رہی۔ پہلی اشاعت کے ستاون سال بعد ممتاز حسن نے ''اقبال اکادمی، پاکستان، کراچی'' سے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ کتاب مذکور پر سال اشاعت درج نہیں ہے، لیکن ممتاز حسن کے پیش لفظ کی تاریخ تحریر (۱۰ جون ۱۹۶۱) سے اس کا سال طباعت متعین کرنا کچھ مشکل نہیں۔ سرورق اور اس کی پشت کا صفحہ شمار میں نہیں لایا گیا ہے۔ فہرست صفحات الف، ب، ج پر درج ہے۔ پھر صفحہ خالی ہے۔ پیش لفظ [از: ممتاز حسن] ص ۱ سے ۱۰ تک، مقدمہ [از: انور اقبال قریشی] ص ۱۱ سے ۱۹، پیش کش (انتساب) مصنف اور دیباچہ [از: مصنف] ص ۲۳ سے ۲۶ کے بعد متن کتاب سے صفحات کا شمار از سر نو کیا گیا ہے۔ دوسرے ایڈیشن کی سب سے اہم بات طبع اول کے متن کی تصحیح ہے۔ لیکن طبع ثانی میں ممتاز حسن اور انور اقبال قریشی نے اسے علم معاشیات پر اردو میں پہلی کتاب قرار دیا ہے۔ اس کا سن اشاعت ۱۹۰۳ء متعین کیا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں جدید تحقیق سے غلط ثابت ہوئی ہیں۔ سن اشاعت میں غلط فہمی کی وجہ یہ تھی کہ کتاب کے اولین ایڈیشن پر سال اشاعت درج نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے اقبال کے دیگر سوانح نگاروں کے یہاں بھی متضاد بیانات ملتے ہیں۔ محمد دین فوق نے کتاب کے سال اشاعت کا تعین نہیں کیا ہے۔ (۵) اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے یہاں بھی سن اشاعت کا ذکر نہیں ملتا۔ (۶) اور قاضی احمد میاں جونا گڑھی اور بشیر احمد ڈار نے سال اشاعت ۱۹۰۱ء لکھا ہے۔ (۷) خواجہ عبدالوحید اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ۱۹۰۳ء تسلیم کیا ہے۔ (۸) مگر اس غلط فہمی کو عام کرنے میں ممتاز حسن کے اس دیباچہ [علم الاقتصاد طبع دوم] کا بہت دخل ہے۔ جس کا آغاز ہی اس جملے سے ہوتا ہے۔ ''اقبال کی علم الاقتصاد ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔''(۹) رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں علمی خبروں کے تحت ''علم الاقتصاد'' کے متعلق درجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

> '' 'پولیٹکل اکانومی' سیاست مدن پر اردو میں اب تک بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں اور جو لکھی گئی ہیں وہ ناکافی اور ابتدائی ہیں، اکثر ترجمہ ہیں مثلاً مسز فاسٹ کی "Political Economy" مبتدیوں کے لیے یا جیون ۱۰ (Jhon) صاحب کی ''پرائمری پولیٹکل اکانومی'' دونوں کتابیں مولانا ذکاء اللہ صاحب کی ترجمہ کی ہوئی ہیں مگر ان کتابوں سے نہ تو اصطلاحات کے وضع کرنے میں مدد ملتی ہے اور نہ مضمون کے سمجھنے میں۔ اس واسطے ہم کو امید ہے کہ اس مضمون پر شیخ محمد اقبال صاحب کی تازہ تصنیف ''علم الاقتصاد'' جو آج کل زیر طبع ہے۔ بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔''(۱۱)

شیخ عبدالقادر مدیر ''مخزن'' نے شمارہ اپریل ۱۹۰۴ء میں ''علم الاقتصاد'' کے ایک باب بعنوان (آبادی

از اقبال) شائع کرتے ہوئے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ کتاب ابھی زیرِ طبع ہے۔نومبر ۱۹۰۴ء تک 'مخزن' میں اس کے متعلق کوئی اعلان نہیں شائع ہوا۔گویا ان مہینوں میں کتاب طباعت کے مراحل طے کر رہی ہوگی اور دسمبر ۱۹۰۴ء میں یہ اعلان شائع ہوتا ہے:

''ہم ناظرین کو بڑی خوشی سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ یہ قابل قدر کتاب جس کا ایک باب ''مخزن'' میں شائع ہو چکا ہے، چھپ کر تیار ہوگئی ہے۔''(۱۲)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات ''زمانہ'' و''مخزن'' کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''علم الاقتصاد'' کا پہلا ایڈیشن نومبر میں چھپ کر منظرِ عام پر آگیا ہوگا۔

''علم الاقتصاد'' کا پہلا ایڈیشن 'پیسہ اخبار' کے خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں طبع ہوا۔قلم درمیانہ اور حواشی باریک قلم سے ہے۔سرورق اور اس کی پشت کے صفحات کو شمار نہیں کیا گیا ہے۔پیش کش (انتساب) ص ۱ پر ہے۔فہرست مضامین ص ۲ اور ص ۳ کو خالی چھوڑا گیا ہے۔دیباچہ (جسے اقبال نے بالالتزام دیباجہ لکھا ہے) ص ۴ سے ۷ تک دیا گیا ہے۔متن کتاب ص ۸ تا ۲۰۱۶ پر محیط ہے۔بہت سے الفاظ قدیم املا کے مطابق ہیں مثلاً: مجھکو (مجھ کو)، نہوگی (نہ ہوگی)، پڑہنے (پڑھنے) اسکا (اس کا) وغیرہ۔

اس کتاب کے دیباچہ میں اقبال نے اپنے شفیق استاد پروفیسر آرنلڈ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ کتاب انھیں کی تحریک پر لکھی گئی ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے جن بزرگوں اور دوستوں کا بطورِ خاص شکریہ ادا کیا ہے، ان میں جناب مولانا شبلی نعمانی بھی ہیں جنھوں نے کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی ہے۔انتساب میں اقبال نے عالی جناب ڈبلیو بل اسکوائر ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب کو معنون کرتے ہوئے اسے اپنی علمی کاوشوں کا پہلا ثمر قرار دیا ہے۔

یہ کتاب پانچ حصص اور بیس ابواب پر مشتمل ہے پہلے حصے میں علم الاقتصاد کی ماہیت اور دولت کی تعریف کی گئی ہے اور باقی چار حصوں میں معاشیات کے چار بنیادی شعبوں سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔جس چیز کو ہم دولت کہتے ہیں۔ماہرین اقتصادیات نے اس کے چار بڑے بڑے شعبے قرار دیے ہیں۔(۱) دولت کی پیدائش (Production) (۲) دولت کا تبادلہ (Exchange) (۳) دولت کی تقسیم (Distribution) (۴) دولت کا صرف یا استعمال (Consumption)۔اقبال نے ان موضوعات پر نہ صرف اپنے وقت کے مروجہ افکار و نظریات کو واضح کیا ہے، بلکہ ان پر تنقید بھی کی ہے، اور اپنی ذاتی آرا بھی درج کی ہیں۔انیسویں صدی میں یورپ کے بڑھتے ہوئے سامراج اور ایشیا و افریقہ کی معاشی پس ماندگی اور زبوں حالی کو دیکھ کر بہت سے مغربی معاشئین نے 'آزاد معیشت' (Free Economy) کا نظریہ پیش کیا۔ان کا ماننا تھا کہ ''کسی طبقے یا خطے کے معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے قوانین وضع کرنا یا اس قسم کی کوئی دوسری کوشش محض خلاف فطرت ہے۔'' ان

کے مطابق معاشیات کو اخلاق، مذہب یا نام نہاد انسانیت کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔بعض مغربی معاشئین نے اس کی مخالفت کی۔کارل مارکس اور اس کے ہم خیال اس نظریہ معیشت کے شدید دشمن تھے۔ان کا خیال تھا کہ یہ دولت مندوں کی ایک بنائی ہوئی چال ہے، جو اپنی خود غرضی کو چھپانے اور دوسروں کو کمزور پا کر لوٹ لینے کی آسان ترکیب ہے۔اقبال کا نقطہ نظر زیادہ وسیع اور جامع ہے۔علم الاقتصاد کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے۔ یا یوں کہو کہ ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ تمدنی لحاظ سے ہوتا ہے۔دولت ہی کو لے لو، اگر یہ شے ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد نہیں دے سکتی تو پھر اس کا کیا فائدہ؟''(۱۳)

اقبال دولت اور نظام دولت کو افراد کے بلند اخلاق و روحانی نصب العین کے تابع دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اقبال غریبی و مفلسی کے حامی نہ تھے بلکہ دل سے ان کی یہ خواہش تھی کہ جہاں تک ممکن ہو انسانوں کو اس کے خوفناک چنگل سے رہائی دلائی جائے۔مشرق و مغرب میں ایسے بہت سے شاعر و ادیب اور مفکر گزرے ہیں، جنھوں نے افلاس کو سراہا اور اس کی برکتیں اور فائدے گنوائے ہیں۔اقبال کی نظر میں مشرقیت اور درویشی کا رنگ ضرور غالب تھا، مگر دولت اور افلاس کے معاملے میں ان کی نظر حقیقت پسند تھی یا یوں کہیے کہ سائنٹفک تھی۔وہ اگرچہ دولت کو مقصود بالذات نہیں سمجھتے تھے، تاہم افلاس کے ساتھ کسی سمجھوتے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو غریبی کی مضرتوں اور زہرناکیوں کے ساتھ اس کی فیض رسانیوں کے بھی قائل ہوتے ہیں۔افلاس ان کی نظر میں انسان کی شخصیت کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے، جس طرح آزادی کے بغیر فرد کی ذات بھرپور نشوونما نہیں پا سکتی، اسی طرح معاشی اطمینان اور خوشحالی کے بغیر شخصیت کی تکمیل ممکن نہیں۔اس طرح اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نسل انسانی اپنے درمیان سے افلاس و غریبی کی لعنت کو ختم کرے۔علم الاقتصاد کے دیباچے سے یہ اقتباس دیکھیں:

''غریبی قوائے انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلہ آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔معلم اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لیے ایک ضروری جزو ہے۔مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوت مدارج بجائے اس کے کہ قیام تمدن کے لیے ایک ضروری جزو ہو اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔اس طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے

آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے؟"(۱۴)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

"تم جانتے ہو مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے اگر ایسی بلائے بے درماں کا قلع قمع ہو جائے تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے گی اور چوری، قتل، قمار بازی اور دیگر جرائم جو اس دہشت ناک آزادی سے پیدا ہوئے ہیں یک قلم معدوم ہو جائیں گے۔"(۱۵)

'علم الاقتصاد' کو اردو زبان میں لکھی گئی پہلی کتاب تو نہیں کہا جا سکتا، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ممتاز حسن نے طبع دوم کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ لیکن اردو زبان کی پہلی مستند کتاب کا درجہ اسے ضرور حاصل ہے۔ رفیع الدین ہاشمی نے 'علم الاقتصاد' کی اشاعت سے قبل اردو زبان میں اس موضوع پر لکھی گئی چھ کتابوں کی نشاندہی کی ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ علم الاقتصاد کی تالیف و اشاعت سے پہلے علم المعیشت پر اردو زبان میں کم از کم چھ کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ ان میں سے پانچ تو انگریزی کتابوں کے تراجم تھے، البتہ 'رسالہ علم انتظام مدن' (مصنفین: محمد منور شاہ خاں و محمد مسعود شاہ خاں) آزادانہ غور و فکر کے بعد بطور ایک طبع زاد تصنیف کے لکھا گیا۔"(۱۶)

اس کتاب کے شائع ہوئے ایک صدی سے بھی زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اقتصادیات اور اس کے اصول و نظریات میں کافی پیش رفت ہو چکی ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس کے اصول ہر گھڑی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جتنا زیادہ عرصہ گزرے گا اس کتاب کی علمی حیثیت گھٹتی جائے گی لیکن اقبال کی اولین تصنیف کے طور پر اس کی وقعت پر حرف نہ آئے گا۔ مولانا ظفر علی خان اس کی اہمیت کا احاطہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ہندوستان کو جسے اس علم کی ضرورت ہے شاید ہی دنیا کے کسی دوسرے ملک کو ہو، کچھ تو اس لیے کہ ایک حصہ ملک کا پہلے ہی سے زراعت، تجارت اور مزدوری میں مصروف ہے اور کچھ اس لیے کہ موجودہ تمدن روز بروز ان ضرورتوں کو بڑھا رہا ہے اور بغیر اس کے ترقی ناممکن ہے۔ ایسے زمانے میں اس قسم کی کتابیں لکھنا درحقیقت ملک پر احسان کرنا ہے۔"(۱۷)

☆☆☆☆☆

حواشی:

(۱) مضامین اقبال، مرتبہ تصدق حسین تاج، ص ۱۰۴

(۲) علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات، مشمولہ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ص ۳۲۶_۳۰۵ اور 'اقبال اور

اورینٹل کالج" مشمولہ Research Journal، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، جولائی ۱۹۷۷ و جنوری ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۰_۸۵

(۳) (Dame Millicent Fawcett,11 June,1847-5 August,1929) ایک سیاسی رہنما و مصنفہ

(۴) (Francis Amasa Walker,2 july,1840-5 january,1897) ایک امریکن ماہر اقتصادیات، ادیب و صحافی

(۵) "اسی زمانے میں سیاست مدن پر ایک کتاب بنام علم الاقتصاد لکھی" بحوالہ 'انوار اقبال' ص ۸۱

(۶) سرگذشت اقبال، ص ۴۳

(۷) اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، ص ۱۴۴ اور بشیر احمد ڈار، مجلہ اقبال، جولائی تا ستمبر ۱۹۷۱ء، ص ۸۷

(۸) A bibliography of iqbal, Page 13، مرقع اقبال، جگن ناتھ آزاد، ص ۹

(۹) علم الاقتصاد طبع دوم، مرتبہ ممتاز حسن، ص ۱

(۱۰) (Jhon Stuart Mill,20,May,1806--8 May,1873) انگریز فلسفی و ماہر اقتصادیات

(۱۱) رسالہ زمانہ، کانپور، جلد ۳، نمبر ۲ و ۱، بابت جولائی و اگست ۱۹۰۴ء، ص ۱۳۳

(۱۲) مخزن، دسمبر ۱۹۰۴ء

(۱۳) علم الاقتصاد، ص ۲۶

(۱۴) دیباچہ علم الاقتصاد، ص ۴

(۱۵) علم الاقتصاد، ص ۲۱۰

(۱۶) تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ص ۲۹۷

(۱۷) دکن ریویو نمبر ۲، جلد سوم، بابت فروری ۱۹۰۵ء، ص ۳۲_۳۰

☆☆☆☆☆

Tanveer Alam Ansari
Research Scholar Dept. of Urdu,
Banaras Hindu University,Varanasi -221005
Mob. 7897970748,
E-Mail: tanveer786bhu@gmail.com

فائر ایریا: سماجی وسیاسی سروکار

محمد جاوید

اردو ادب میں فکشن خصوصاً اردو ناول کی قابل ذکر روایت ملتی ہے۔انیسویں صدی کا زمانہ اردو زبان و ادب کے لیے نیک فال ثابت ہوا۔کشمکش اور نشیب وفراز سے بھرے اس دور میں اردو کی کئی اصناف وجود میں آئیں۔ناول بھی ان میں سے ایک ہے۔اس کی بہت ساری وجوہات وتعبیرات ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد کے ہاتھوں اردو ناول کی داغ بیل پڑی۔ان کے ناولوں میں متعلقہ دور کے حالات ومسائل سے چشم پوشی نہیں ملتی۔ٹھیک اسی طرح رتن ناتھ سرشار نے بھی اپنے ناولوں میں لکھنو کی سماجی وتہذیبی زندگی کی منھ بولتی تصویریں پیش کی ہیں۔ان کی شاہکار تصنیف ''فسانہ آزاد'' میں لکھنو کو چلتے پھرتے محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس روایت کی دوسری خوبصورت مثال پریم چند کی ہے۔انھوں نے اپنی ناول نگاری کے ذریعہ دیہی معاشرے کی جیتی جاگتی عکاسی کی ہے۔ان کے ناولوں میں ہندوستان کا دیہی معاشرہ سانس لے رہا ہے۔مطلب یہ کہ ان کے ناول اپنے گہرے سماجی سروکار کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔اس کے بعد ترقی پسند تحریک کا ایک لمبا سفر اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے۔اس تحریک کے زیر اثر ادب میں سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی سروکار کی نئی جہتیں سامنے آئیں۔''ادب برائے زندگی'' کے نظریے نے اردو ناول کو گہری سماجی معنویت سے آشنا کیا۔اردو ناول میں عوام کے دکھ درد، رنج والم، محرومی ومایوسی اور ناکامی ونامرادی کو شعوری طور پر پیش کیا جانے لگا۔

بیسوی صدی کے آخری عشرے میں اردو ناول نگاری فکر وفن کے نت نئے تجربات سے دو چار ہوئی۔ الیاس احمد گدی ہم عصر اردو ناول کا ایک بے حد محترم نام ہے۔بیسوی صدی میں اردو ناول نگاری کو فکر وفن کی نئی جہتوں سے روشناس کرانے میں الیاس احمد گدی کا نہایت اہم کردار رہا ہے۔''فائر ایریا'' ان کا مشہور ترین ناول ہے۔یہ ناول پہلی بار ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا۔الیاس احمد گدی نے اپنے معروف ناول ''فائر ایریا'' کے توسط سے اردو میں علاقائی ناول لکھنے کی طرح ڈالی۔ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ یہ ناول کول فیکٹری کے مزدوروں کی زندگی کی بدحالی اور بدترین صورت حال کو بے لاگ طریقے سے پیش کرتا ہے۔ناول نگار نے صوبہ بہار کے ''جھریا'' نامی شہر کو اپنے ناول کا مرکز بنایا ہے۔یہ شہر قدرتی وسائل بالخصوص کوئلے کی پیداوار کے لیے جانا جاتا ہے۔زیر مطالعہ ناول سماجی ناانصافی، ظلم واستحصال، جبر وتشدد، قتل و غارت، جنسی پامالی، اخلاقی زوال، سیاسی انتشار، مکر وفریب، اقتصادی نابرابری وغیرہ کو دیانت داری اور غیر جانبدارانہ انداز میں سامنے لاتا ہے۔''فائر ایریا'' دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب آزادی سے قبل کے صنعتی نظام کو پیش کرتا ہے اور دوسرا باب آزادی کے بعد کی

صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔''فائر ایریا'' سماجی وابستگی، طبقاتی کشمکش، سیاسی سروکار اور تہذیبی لمس کے سبب سماجی معنویت کا بھرپور جواز رکھتا ہے۔یہ ناول صنعتی ترقی اور سرمایہ دارانہ نظام کی بدعنوانی وبے راہ روی کی قلعی کھولتا ہے۔الیاس احمد گدی نے اپنی اس تخلیق کی بنا پر اردو ناول کے روایتی افکار وموضوعات کے جمود کو توڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس ناول کے توسط سے سماجی وسیاسی ظلم واستحصال اور تشدد کا ایک نیا محاورہ سامنے آیا۔زیر مطالعہ ناول کے متعلق عصر حاضر کے معروف نقاد انور پاشا کی رائے ملاحظہ ہو:

> ''الیاس احمد گدی نے اپنے ناول فائر ایریا کے ذریعے اردو ناول کو ایک نئی جہت سے آشنا کرانے کے ساتھ ساتھ موضوعاتی جمود اور یکسانیت کو بھی توڑنے کی کوشش کی ہے۔ان کے یہاں نہ تو ماضی کی نوحہ گری ہے نہ حقیقت سے دور رومانی صحرا نوردی۔ان کی فکر کی بنیاد عصری و زمینی حقائق پر قائم ہے، جو براہ راست ان کے تجربے اور مشاہدے کا اٹوٹ حصہ ہے۔یہ ناول ہمارے عصری صنعتی سرمایہ دارانہ نظام کی قلعی کھولتا اور اس کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کرتا ہے۔غرض کہ ناول کا بنیادی محور اس فکر پر مبنی ہے کہ صنعتی ترقی اور سرمایہ دارانہ نظام کی چمک دمک بھولے بھالے محنت کش طبقے کے لیے بے سود وبے معنی ہے۔''(معاصر اردو ناول کے تہذیبی و سماجی سروکار، انور پاشا، مشمولہ'' ہم عصر اردو ناول: ایک مطالعہ''، قمر رئیس، علی احمد فاطمی (مرتب)، ایم آر، پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱

درحقیقت عہد حاضر میں اردو ناول نگاری کی روایت کو استحکام بخشنے میں الیاس احمد گدی نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔زیر مطالعہ ناول ''فائر ایریا'' اردو فکشن کا نشان راہ ہے۔ذہن نشیں رہے کہ اس ناول کے ذریعہ ہی اردو میں علاقائی ناول کی داغ بیل پڑی۔اس ناول کا تعلق صوبۂ بہار کے جھریا نامی شہر سے ہے۔ اسے چھوٹا ناگپور بھی کہتے ہیں۔دراصل یہ ناول وہاں کے کولیری مزدوروں کے ظلم واستحصال اور ان کی زندگی کے المناک پہلوؤں کو ادبی حسن کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ترقی پسند حقیقت نگاری اور فلسفۂ اشتراکیت سے مماثلت کے باوجود ''فائر ایریا'' اردو ناول کے موجودہ منظر نامے پر وسعت کا بھرپور جواز رکھتا ہے۔سہدیو، محمد ار، رحمت، ختونیا، اس ناول کے اہم کردار ہیں۔وہ سرمایہ دارانہ جبر وتشدد اور چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔قابل غور امر ہے کہ اسی جدوجہد میں محمد ار مارا جاتا ہے۔اس کی موت سرمایہ دار طبقے کے خلاف احتجاج اور بغاوت کا استعارہ بن جاتی ہے۔اس کی موت چیخ چیخ کر ظلم واستحصال اور سماجی کھوکھلے پن کو بیان کر رہی ہے۔

ناول ''فائر ایریا'' جدید صنعتی عہد کے مختلف مظالم کو پیش کرتا ہے۔اس ناول کا پلاٹ سہدیو، محمد ار، رحمت اور ختونیا جیسے کرداروں کے گرد گردش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔یہ کردار غریب ومظلوم طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ

وہ طبقہ ہے، جو جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ان کی زندگی کی معمولی سی معمولی خواہش و آرزو بھی پوری نہیں ہو پاتی۔اس ناول میں پریم چند کے ناول ''گئو دان'' کی طرح ظلم و استحصال اور جبر و تشدد کی داستان ملتی ہے۔''گئو دان'' میں جس طرح ہوری کی ایک معمولی خواہش پوری نہیں ہو پاتی کہ وہ اپنے دروازے پر ایک گائے رکھ سکے۔''گئو دان'' اگر جاگیر دارانہ معاشرے کے استحصالی رویے کو سامنے لاتا ہے تو ''فائر ایریا'' سرمایہ دارانہ دور کے غیر انسانی مظالم کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے۔پیش نظر دونوں ناول طبقاتی کشمکش کے خارجی و داخلی پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں۔

الیاس احمد گدی کول فیکٹری کے مزدوروں کے درد و غم،حالات و مسائل اور ان کی زندگی کے تلخ تجربات و مشاہدات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔انھوں نے رحمت کی موت اور اس کی بیوی ختونیا کے کرب و اضطراب کو نہایت اثر انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔رحمت فیکٹری میں کام کرتے ہوئے ایک حادثے میں مارا جاتا ہے۔افسوس کہ اس کی لاش کو غائب کر کے اسے ڈیوٹی سے غیر حاضر دکھا دیا جاتا ہے تاکہ اس کی موت کے بعد معاوضے کے روپ میں ملنے والے پیسے کو ہڑپا جا سکے۔رحمت کی موت کے بعد اس کی لاچار بیوی کے خواب، اس کے معصوم بچوں کا مستقبل اور اس کے بوڑھے باپ کی خواہشات وغیرہ سب کچھ بکھر جاتے ہیں۔ثبوت کی فراہمی کے بعد اس کے دوست سہدیو کی ہزار کوششوں کے باوجود معاوضہ نہیں مل پاتا۔رحمت کی بیوی کی بے بسی و لاچاری اور مجبوری و بے کسی دم توڑتی انسانیت کی ننگی تصویریں پیش کرتی ہے۔رحمت کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا ایک نہایت خوف ناک منظر ملاحظہ ہو:

''تینوں نے مل کر لاش کو جیسے تیسے بورے میں بھرا۔اور ان میں سے ایک آدمی جو کافی توانا تھا، اس نے بورے کو کندھے پر لاد لیا۔پھر ڈھبری کی مدھم روشنی میں یہ قافلہ دھیرے دھیرے بڑھنے لگا۔دونوں آدمیوں کو چلنے میں خاصی دقت ہو رہی تھی۔خاص طور پر اس آدمی کو جس نے بورے کو کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔مختلف گلیاروں سے گزرتے کئی سرنگوں کو پار کر کے وہ ایک دور دراز کے علاقے میں پہنچ گئے۔رام اوتار ڈھبری لیے ان کے آگے آگے راستہ بتاتے ہوئے چل رہا تھا اور دونوں اس کے پیچھے پیچھے، کان میں ہونے والا شور شرابا دوسری طرف رہ گیا تھا۔یہاں بالکل سناٹا تھا۔گرمی شدید تھی۔ہوا بوجھل تھی اور گیس کی طرح تیکھی۔اس جگہ پہنچ کر رام اوتار نے انھیں روک دیا.................!

بس یہیں رکو۔آگے خطرہ ہے۔بند سرنگ میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔اس نے ایک آدمی کے ہاتھ سے ٹارچ لی اور دیوار اور چھت کا معائنہ کرنے لگا۔دو فٹ کے ڈنڈے سے کئی جگہوں کو ٹھوک کر دیکھا۔پھر فرش پر ٹارچ کی روشنی پھینکی۔''تم لوگ یہیں رکو۔میں بورے کو اور اندر پھینک دیتا ہوں۔''

(فائر ایریا، الیاس احمد گدی، بک کارپوریشن، دہلی، ۲۰۱۲، ص ۱۱۹)

الیاس احمد گدی نے محنت کش اور مزدور طبقے کو درپیش مسائل کے ساتھ ساتھ ان کے سینے میں پیدا ہونے والے احتجاج اور مزاحمت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔اس ناول میں ہر طرح کے کردار نظر آتے ہیں۔پولیس افسران، سیاست داں، ٹھیکیدار اور مزدور و غریب غرض یہ کہ اس مخصوص معاشرے کا ہر طبقہ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ان کے یہاں پریم چند کی طرح آدرشوادی کردار نہیں ملتے بلکہ زندگی کے سرد و گرم اور نشیب و فراز کے لحاظ سے ان میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔الیاس احمد گدی نے اپنے گہرے سماجی شعور اور اپنے تجربات و مشاہدات کی بدولت ان کرداروں میں جان ڈال دی ہے۔ناول ''فائر یا ایریا'' کے مطالعے کے بعد اس مخصوص معاشرے کا مکمل منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔الیاس احمد گدی نے وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار، بول چال اور بود و باش وغیرہ کی نہایت فطری اور حقیقی تصویریں پیش کی ہیں۔

الیاس احمد گدی نے ناول کا اختتام احتجاجی اور انقلابی موڑ کے ساتھ کیا ہے۔طبقاتی کشمکش کے ماحول میں مجمدار کا بے رحمی سے قتل کر دیا جاتا ہے۔مجمدار کی موت کے بعد کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کے دلوں میں فطری طور پر ظالم و سرمایہ دار طبقے کے خلاف نفرت و دشمنی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔انھوں نے ناول کے آخر میں مجمدار کے جنازے کے ساتھ نکلنے والے جلوس کا منظر پیش کیا ہے۔جنازے کے اس جلوس میں انسانوں کا سیلاب اُمڈ پڑتا ہے۔کول فیکٹری کا محنت کش طبقہ اس جلوس میں شامل ہوتا ہے۔مردوں کے شانہ بہ شانہ عورتیں بھی اس احتجاجی جلوس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔رحمت کی بیوی ختونیا بھی اس جلوس میں شریک ہوتی ہے۔وہ اس استحصالی معاشرے کی غیر انسانی حرکات و سکنات کو بخوبی سمجھتی ہے۔وہ ذاتی طور پر بھی سرمایہ دارانہ مظالم کا شکار ہوئی تھی۔وہ اپنے سینے میں عداوت اور بغاوت کی آگ لیے مجمدار کی موت کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔وہ ہوا میں اپنا ہاتھ لہرا کر فلک شگاف نعرے لگاتی ہے۔اس کی حلق سے نکلنے والے ''پھانسی دو پھانسی دو'' کے نعرے سے پوری فضا گونج اُٹھتی ہے۔الیاس احمد گدی نے اپنے ناول ''فائر ایریا'' کے توسط سے ختونیا کے روپ میں اردو فکشن کو ایک لازوال خاتون کردار دیا ہے۔ان کے سماجی شعور کی بھٹی میں تپ کر ختونیا کا کردار کندن بن گیا ہے۔''ختونیا'' کا کردار پیغام آفاقی کی ''نیرا'' کی مانند اردو فکشن کے آسمان پر ستارے کی مانند روشن رہے گا۔ناول کا اختتامی اقتباس ملاحظہ ہو، جس میں ختونیا کے کردار کی تابناکی اور انقلابی شعور موجود ہے:

''سہدیو ان میں ایک عورت کو دیکھ چونک جاتا ہے۔

ارے......!

اس کو یقین نہیں آتا اپنی آنکھوں پر، وہ اپنے سر کو جھٹکتا ہے۔پھر دیکھتا ہے، پھر دیکھتا ہے......

واقعی وہ ختونیا ہے۔

اپنا ہاتھ اٹھا اٹھا کر وہ برابر نعرہ لگاتی جارہی تھی۔

پھانسی دو...... پھانسی دو!

وہ مبہوت کھڑا ہے۔ایک ٹک ختونیا کو دیکھے جارہا ہے۔وہ نزدیک آتی جارہی ہے......اور نزدیک!

اور جب ختونیا اس کے ایک دم نزدیک آجاتی ہے تو وہ اچانک اس کو دیکھ لیتی ہے۔دیکھ لیتی ہے تو دیکھتی ہی رہتی ہے اور تب اچانک سہدیو دیکھتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ لپک رہا ہے۔

آگ..........!

اس کو تعجب ہوا کہ جس آگ کو وہ ساری زندگی تلاش کرتا رہا، وہ آگ اور کہیں نہیں ختونیا کی آنکھوں میں ہے۔

تو کیا آگ آنکھوں میں ہوتی ہے......؟

ہاں شاید آگ آنکھوں میں ہی ہوتی ہے......!

جلوس گزر گیا ہے۔وہ قدم بڑھاتا ہے۔ایک قدم، دو قدم، چار قدم اور جلوس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے۔''

(ایضاً ص ۱۱۹)

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ الیاس احمد گدی نے اپنے مشہور ترین ناول ''فائر ایریا'' کے توسط سے اردو فکشن کو سماجی شعور اور سیاسی بصیرت کا ایک نیا تصور عطا کیا۔پیش نظر ناول ہم عصر اردو ناول نگاری کے لیے فکر و شعور کے نئے دریچے کھولتا ہے۔ درحقیقت یہ ناول بعض علاقائی مسائل کو دیانت داری اور فنی آب و تاب کے ساتھ پیش کرتا ہے۔الیاس احمد گدی کا ناول ''فائر ایریا'' اپنے موضوع، انداز پیش کش بالخصوص علاقائی زبان و بیان اور لب و لہجے کے اعتبار سے منفرد اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔مختصر یہ کہ زیر مطالعہ ناول چند مخصوص علاقائی مسائل کو، جس گہرے سماجی شعور اور جس سیاسی آگہی کے ساتھ سامنے لاتا ہے، اس کی مثال اردو ناول کی روایت میں خال خال نظر آتی ہے۔

☆☆☆☆☆

Mohd. Javed
Research Scholar Dept. of Urdu,
B.H.U. Varanasi -221005,
Mob. 8953944717

غالبؔ کی خطوط نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

تزئین فاطمہ جزآ

''خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔''

[مولانا عبدالحق]

مکتوب نگاری کی تاریخ اتنی پرانی ہے جتنی کہ خود تحریر کی۔اس کا دامن بہت ہی وسیع ہے۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ چار ہزار برس قبل چین میں پہلا خط لکھا گیا لیکن اس کا کوئی ثبوت دریافت نہیں ہوا۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے تو اس میں مکتوب نگاری کا رواج فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بہت پہلے سے تھا۔عام طور پر رجب علی بیگ سرور اور خواجہ غلام غوث بے خبر کو اردو کا پہلا مکتوب نگار کہا جاتا ہے۔جب کہ اردو مکتوب نگاری کو اہمیت غالب کی مکتوب نگاری سے حاصل ہوئی۔ غالب سے پہلے ۱۸۶۶ء میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنے خطوط کو ''انشائیہ سرور'' کے نام سے شائع کیا۔ان کے خطوط بھی فسانہ عجائب کی طرح ہیں جن میں مقفیٰ و مسجع عبارتیں تحریر ہیں۔اس کے بعد خواجہ غلام غوث بے خبر کے دو مجموعے ''فغان بے خبر اور انشائیہ بے خبر'' شائع ہوئے۔بے خبر کے کچھ خطوط سرور کی طرح مقفیٰ و مسجع عبارتوں سے بھرے ہیں تو کچھ غالب کی طرح سادہ و سلیس زبان میں ہیں، سرورؔ، بے خبرؔ اور غالبؔ تینوں ہی ہم عصر تھے۔

غالب اردو کے بہت بڑے مکتوب نگار ہیں اور درحقیقت اردو مکتوب نگاری کو اہمیت غالب کی وجہ سے حاصل ہے۔کیوں کہ وہ پرانے گھسے پٹے راستوں پر چلنے کے عادی نہیں تھے۔انھوں نے اپنی راہ خود بنائی۔

غالب کا اردو خط وکتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے نہ غالب سے پہلے کسی نے خط وکتاب میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری تقلید ہوسکی۔خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے کہا ہے:

''مرزا غالبؔ کے اردو خط وکتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط وکتابت کا یہ انداز اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری تقلید ہوسکی۔''

اردو ادب کی تاریخ میں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کا نام غیر معمولی عظمت کا حامل ہے۔بحیثیت شاعر وہ بہت ہی مشہور و مقبول ہوئے۔ان کے اشعار زبان زد خلائق ہیں۔ان کی غزلوں کی شگفتگی، احساس جمال، فلسفیانہ موشگافی، زخموں میں لپٹی ہوئی مسکراہٹ اور درد میں ڈوبا ہوا لہجہ ہمارے دلوں پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ لیکن یہ غالب کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر ہم ان کی عظمت صرف ان کی شعری تخلیقات میں تلاش کریں اور ان کی نثری تخلیقات کو فراموش کردیں۔جب کہ بحیثیت نثر نگار وہ کسی سے بھی کم نہیں۔بلکہ ان کے خطوط ان کی

عظمت اور وقار کو تازندگی قائم رکھیں گے۔ بقول آل احمد سرور:

''ایک زمانہ وہ بھی آئے گا جب لوگ غالبؔ کی شاعری کو بھول جائیں گے، تو ایسے زمانے میں ان کی نثر اور ان کے خطوط ان کی عظمت کو برقرار رکھیں گے۔'' [آل احمد سرورؔ]

غالبؔ کی شخصیت وہ آفتاب درخشاں ہے جس کی شعاعوں سے اردو نثری ادب میں صنف خطوط کو بڑی ترقی ملی۔ اس لحاظ سے ان کا پایہ اردو ادب میں سب سے بلند ہے۔ ایسے زمانے میں جب اردو رنگینی وقافیہ پیمائی، انشا پردازی کا اصل سرمایہ سمجھی جاتی تھی اور اردو نثر قافیہ وردیف کی بے جا زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ مسجع ومقفیٰ عبارتوں سے تکلف کی بو آرہی تھی، تب انھوں نے ایسی رسوم وروایات سے بغاوت کرکے اردو نثر میں ایک ایسی نئی راہ نکالی جو قافیہ وردیف کی پابندیوں سے آزاد ہو کر سادہ، سلیس اور دلکش ہے اور آنے والے لوگوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔

شروع میں غالبؔ فارسی زبان میں خطوط لکھا کرتے تھے۔ وہ فارسی کے اتنے ہی بڑے اہل قلم تھے جتنے بڑے اردو کے۔ ان کی شخصیت اور ان کے کلام میں مغل تہذیب کی سبھی خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں۔ وہ اس کی جیتی جاگتی علامت تھے۔ غالب کو فارسی زبان سے قلبی لگاؤ تھا۔ ان کے اس شوق کو ایران کے ایک پارسی نژاد مسلمان عبدالصمد نے چمکایا۔ جب کہ مرزا غالبؔ کی فارسی دانی کی سنگ بنیاد مولوی محمد معظم کے ہاتھوں پڑی اور ایک عرصے تک انھیں سے کسب فیض کیا۔ لیکن اس عمارت کی تکمیل ملا عبدالصمد کے چابک دست اور ماہر ہاتھوں سے ایسے شاندار طریقہ پر ہوئی کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ آگے چل کر وہ فارسی نثری ادب کے ایک عظیم المرتبت ادیب بنے۔ عبدالصمد کے ہندوستان سے واپس چلے جانے کے بعد بھی مرزا غالبؔ نے خط وکتابت جاری رکھی۔ ہندوستان میں فارسی کا ایسا علم رکھنے والے بہت ہی کم تھے جس سے غالب کو مراسلت کا موقع نہیں ملتا تھا تو وہ اردو میں لکھنے لگے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد لوگوں نے ان کے اردو مکاتیب کو سراہا تو وہ اپنے دوست احباب اور اقارب کو اردو زبان میں ہی خطوط لکھنے لگے۔ ان کے اردو خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ جن میں عود ہندی، اردوئے معلی، مکاتیب غالبؔ، نادر غالبؔ، خطوط غالبؔ ونامۂ غالب شامل ہیں۔

۱۸۴۶ء کے قریب غالبؔ نے اردو میں خط وکتابت کا سلسلہ شروع کیا اور یہی خطوط جو وہ یوں ہی اپنے عزیز واقارب کو لکھا کرتے تھے آج اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ بن گئے ہیں۔ غالبؔ کے خطوط سے ان کے وقت کے معاشرتی حالات، سیاسی واقعات وادبی مباحث سبھی کچھ عیاں ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں بڑے بڑے علمی، شعری وادبی مسئلوں کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کیا ہے اور شعر وشاعری میں ہونے والی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ انھوں نے اپنے خطوط میں اپنی زندگی کے تمام حالات دل کھول کر بیان کیے۔ اردو ادب میں غالب ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی شخصیت کو خطوط کے ذریعے بے نقاب کیا۔ انھوں نے اپنے بارے میں

اتنا کچھ لکھا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دیا جاتا تو وہ ان کی آپ بیتی ہو جاتی جو اپنے غموں اور خوشیوں، آرزوؤں اور خواہشوں، محرومیوں اور ناکامیوں کے ساتھ زندگی سے نباہ کرتا ملے گا۔ لہٰذا ان کی شخصیت کی تمام تصاویر اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ان کے خطوط میں موجود ہیں۔

یہی نہیں کہ انھوں نے اپنے احباب واقارب کی خوبیوں اور خامیوں کو جلوہ گر کیا ہے بلکہ کہیں کسی کی مدح کی تو کسی کی مذمت، کہیں کسی سے ہمدردی ظاہر کی تو کسی کی مخالفت کی، کسی کی تعریف میں عرش وفرش ملا دیے تو کسی کی ہجو میں زیروزبر کر دیے، کہیں عام گفتگو کو سنجیدہ بنا دیا تو کہیں کسی بڑی بات کو چٹکیوں میں سلجھا دیا۔ اس طرح یہ خطوط، غالبؔ کی آپ بیتی ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت کے حالات ومسائل کے عکاس بھی ہیں۔

غالبؔ نے نامہ نگاری کو مکالمہ بنا دیا۔ جس میں مکالمے بھی ہیں اور گفتگو کی مجلسی کیفیت بھی ''بھائی تم میں مجھ میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے۔'' باتیں کرنے کا انداز بیان نثر نگاری میں زندگی کی غمازی کرتا ہے۔ اسی طرح غالبؔ میر مہدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں جس میں مکالماتی انداز اختیار کرتے ہوئے کچھ اس پیرائے میں مخاطب ہیں۔ جیسے دو شخص آمنے سامنے بیٹھے محو گفتگو ہوں۔

''اے جناب میرن صاحب! السلام علیکم حضرت آداب۔ کہو صاحب اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی۔ حضور کیا میں منع کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں............نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے وہ خفا ہوا ہوگا جواب لکھنا ضروری ہے۔''

غالب نے کس خوبی سے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے اور ہجر میں وصل کے مزے لوٹنے کی کیفیت پیدا کی ہے۔ ان کے اس انداز میں سادگی، سادہ دلی، بے تکلفی اور اپنائیت کی فضا ملتی ہے۔ غالبؔ کے خطوط میں باتیں کرنے کا انداز اتنا برجستہ و بے ساختہ ہے کہ کہیں بھی ان کے خطوط سے بے کیفی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس خوشگوار ماحول کو قائم ودائم رکھنے میں اکثر جگہوں پر ڈرامائی اور افسانوی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے خطوط میں ضرور ایسی باتیں لکھتے ہیں جس سے مکتوب الیہ محظوظ ہو۔ چنانچہ انھوں نے اپنے دوست کو ایک خط لکھا جو ۱۸۵۸ء کے دسمبر کا تحریر کردہ تھا۔ لیکن ان کے خط کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء میں پہلی یا دوسری تاریخ کو دیا۔ اس خط کے جواب میں غالبؔ نے اپنے دوست کو لکھا:

''دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں کہ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزہ یہ ہے کہ جب کہا جائے گا تو کہو گے میں نے تو دوسرے دن ہی جواب لکھ دیا تھا۔''

غالبؔ منفرد مزاج کے مالک تھے۔ انھوں نے مراسلت کے ان تمام قاعدوں کو ترک کر دیا جو محمد شاہ کے وقت میں رائج تھے۔ وہ اپنے دل کی بات خط کی ابتدا میں کہہ جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے خط لکھنے والا اور

پڑھنے والا دونوں آمنے سامنے بیٹھے محو گفتگو ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے خط میں مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں:

''میں نے خط لکھنے کا وہ ڈھنگ نکالا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزاروں کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

انھوں نے طویل القاب وآداب کے بجائے مختصر القاب وآداب کا استعمال کیا۔ مثلاً بھائی، برخوردار، میر مکرم، بندہ پرور و برادر وغیرہ۔ مقفیٰ ومسجع انداز بیان کو ترک کر کے عام بول چال کی زبان اختیار کی مگر ان کا انداز بیان شوخ و برجستہ ہوا کرتا تھا، جس میں بے تکلفی پائی جاتی ہے۔

مرزا غالب کا اخلاق نہایت وسیع ہے۔ وہ ہر ایک سے خوش اخلاقی سے ملتے تھے۔ چاہے وہ کسی بھی مذہب وملت کا ہو وہ ہر ایک سے خوش اخلاقی اور ملنساری سے پیش آتے۔ ان سے ایک بار ملنے کے بعد دوبارہ ملنے کا لوگوں میں اشتیاق رہتا تھا۔ وہ اپنے عزیز واقارب کی خوشیوں میں خوش وغم میں غمگین ہو جاتے تھے۔ جو خطوط انھوں نے اپنے عزیزوں کو لکھے وہ ان کی مہر ومحبت کی بہترین مثال ہیں۔

مکاتیب غالب کی ایک اہم خصوصیت ان کی شوخی وظرافت ہے۔ غالب کے مزاج میں ظرافت اس قدر کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ وہ کچھ بھی بولتے لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان سے بات کرنے کے مشتاق رہتے تھے۔ حسن بیان، حاضر جوابی، بات سے بات پیدا کرنا ان کی سب سے خاص خصوصیت ہے۔ ان کی حاضر جوابی کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

''ایک بار رمضان کے مہینے میں مولانا دوپہر کے وقت ملنے گئے۔ اس وقت مرزا صاحب اپنے دوست کے ساتھ چوسر وشطرنج کھیل رہے تھے۔ مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔ مرزا نے کہا قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ کو معلوم ہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے، یہی کوٹھری ہے۔''

غالبؔ کے خطوط کو پڑھنے کے بعد انسان تھوڑی دیر کے لیے اپنے غموں کو بھلا کر ان کی شوخی وشگفتگی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں حالیؔ کا کہنا ہے:

''ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو ''حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف'' کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان، حاضر جوابی اور بات سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں تھا۔''

ان کی ظرافت میں صرف بے فکری کی ہنسی نہیں بلکہ زندگی کے مسائل وحالات پر انھیں گہری معلومات حاصل ہے۔ وہ غم روزگار میں بھی اپنا توازن نہیں کھوتے اور دردناک حالات میں بھی اپنے انداز بیان کو برقرار رکھتے ہیں۔ چنانچہ منشی نبی بخش کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا ہوں۔ یعنی منگل کے دن ۱۸/ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ میری پھوپھی کہ میں بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھے بیٹا سمجھتی تھی مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں گویا میرے نو آدمی مر گئے تین پھوپھیاں اور تین چچا ایک باپ اور ایک دادا اور ایک دادی یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں۔ اور اس کے مرجانے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی ایک بار مر گئے۔''

منظر نگاری کی تمام ہی خوبیاں غالب کے خطوط میں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی شخصیت وحالات کی عکاسی اتنے خوبصورت پیرائے میں کی ہے کہ اس کی کوئی مثال نہیں۔ اپنے خطوط میں انھوں نے اپنی پوری زندگی کے کوائف تحریر کیے ہیں۔ اس کے علاوہ اس وقت کے تمام حالات وواقعات کو قلم بند کیا ہے جو دلی اور دوسرے شہروں میں ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی ان واقعات کو بھی پیش کیا جو ان کے اعزا واقارب کے ساتھ پیش آئے۔ غالب کے خطوط پڑھنے سے ان کے زمانے کے علمی وادبی حالات، سماجی وسیاسی واقعات کے ساتھ نجی حالات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب ہوتا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، آگ تاپتا جاتا ہوں۔''

موسم برسات کا بیان انھوں نے اپنے خط میں ایسے کیا ہے:

''آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے نظر آتے ہیں تو لوگ اس کو جگنو سمجھتے ہیں۔''

اور ایک جگہ خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیوان خانے کا حال محل سرائے سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقط اس راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے، ابر دو گھنٹے برستے ہیں تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔''

غالب نے اپنے خطوط میں بڑے خوبصورت انداز میں قافیہ آرائی بھی کی ہے۔ ان کی قافیہ آرائی کی مثال:

''جو تمہارا ڈھنگ ہے وہی میرا رنگ ہے، پھر بندہ بے ادب نہیں تحسین طلب نہیں۔''

غالبؔ کے خطوط میں اکثر جگہوں پر طنز کا پہلو بھی ہوتا ہے جس نے ان کی ظرافت کو بامعنی اور اس کا اثر دیر پا بنا دیا ہے۔ لیکن ان کے طنز میں تلخی نہیں۔ اپنی ذات، آس پاس کے حالات، اہل خانہ واحباب، اعزا واقارب شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ان کے طنز کے باڑ سے چھوٹا ہو۔ خود انھیں اپنی ذات والا صفات پر ہنسنے کا حوصلہ ہے اور خود کو تماشائی کی نظر سے دیکھا ہے اور اپنی ہیئت پر دل کھول کر ہنستے ہیں۔ انھوں نے اپنے طنزیہ تاثرات میں جھنجلاہٹ، تلخی اور تحقیر کا انداز پیدا ہونے نہیں دیا۔ زندگی کی ساری محرومیوں، کمیوں وزہرناکیوں کے باوجود ان

کے طنز میں جھنجھلاہٹ اور بیزاری کبھی بھی پیدا نہیں ہوئی۔

اس طرح غالبؔ کے خطوط میں ان کی شخصیت اور ان کے عہد کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ پورا معاشرہ ہماری نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ان کے خطوط سے ان کی پوری زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ وہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے جس طرح معاشرتی حالات و واقعات کا بیان کیا ہے اس کی کوئی مثال نہیں۔

اس طرح غالب کے خطوط میں ایسی گوناگوں خوبیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ اردو نثری ادب کے لیے شاہکار بن گئے۔ بلاشبہ انھوں نے اپنی مکتوب نگاری کے ذریعہ اردو نثر کو ایک نئے انداز سے روشناس کرایا اور اسے ایک جدید سمت و رفتار عطا کی۔

☆☆☆☆☆

Tazeen Fatema Jaza
Qazi Mubarakpura, Maunath Bhanjan,
Mob. 9236595334,
E-Mail: tazyeenjza@gmail.com

مطبع نول کشور سے شائع شدہ ''رزم نامہ'' کا ایک تعارف

نازیہ تسکین

منشی نول کشور انیسویں صدی عیسوی کی نہایت اہم اور معروف شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک تک پھیلی ہوئی ہے۔ نول کشور اپنے عہد کے ممتاز صحافی، علم دوست اور انشا پرداز شخص تھے۔ انھوں نے جس طرح اپنے ذاتی کارناموں سے اپنے خاندان کا نام روشن کیا اسی طرح اپنے ملک ہندوستان کو سارے جہان میں ادب کے گہوارے کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ۱۸۵۷ء میں جب سارے ملک میں انتشار پھیلا ہوا تھا اس وقت نول کشور نے اپنے مطبع کے ذریعہ علم و ادب کی ایسی مشعل روشن کی جس کی شعاؤں سے آج بھی ہماری علمی و ادبی بزم اور تعلیمی ادارے روشن ہیں۔

منشی نول کشور علی گڑھ کے ایک معزز برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش ۳ جنوری ۱۸۳۷ء کو اتر پردیش کے ضلع متھرا کے ''ریڑا'' نامی گاؤں میں ہوئی تھی[۱] جو کہ آپ کی والدہ ''یشودا'' کا آبائی وطن تھا۔ منشی نول کشور نے اپنی ابتدائی تعلیم قصبہ ساسنی میں مکمل کی۔ پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آگرہ کالج میں داخلہ لیا اور رواج زمانہ کے مطابق عربی فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ فراغت علمی کے بعد فکر معاش کی غرض سے لاہور پہنچے اور وہاں ''کوہ نور'' اخبار سے وابستہ ہوئے اور یہیں سے ان کی باضابطہ صحافتی اور ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ منشی نول کشور نے ۱۹ فروری ۱۸۹۹ء کو دہلی میں وفات پائی۔[۲]

منشی نول کشور نے ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں ''نول کشور'' کے نام سے ایک مطبع قائم کیا۔[۳] جس میں کم و پیش ۱۲ ہزار کارکن کام کرتے تھے۔ ان کارکنان کی مدد سے منشی صاحب نے اپنی حیات میں تقریباً پانچ ہزار گوناگوں موضوعات کی کتابوں کو ترتیب دے کر شائع کیا۔

ہندوستان جو کہ سیکولر ملک کہلاتا ہے یہاں الگ الگ شہروں اور دیہاتوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ منشی صاحب نے اپنے پریس کے ذریعے ان زبانوں کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ نول کشور جس طرح ہندوستانی زبانوں کی بقا اور ترقی کے لیے کوشاں رہے اسی طرح انھیں بیرونی زبانوں کی ترقی کا بھی خاص خیال رہا۔ انھوں نے متعدد انگلیسی اور فرانسیسی کتابوں کا اردو اور فارسی زبانوں میں ترجمہ کرایا اور انھیں اپنے مطبع سے شائع کر کے خاص و عام تک پہنچایا۔

فارسی زبان کی تاریخ میں نول کشور کی خدمات نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ زبان اگرچہ ایران کی قومی زبان ہے لیکن ہندوستان کی تاریخ میں اس کی جڑیں قدیم زمانے سے پھیلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں اس

زبان کا باقاعدہ آغاز محمود غزنوی کے پہلے حملے سے ہوا اور تیموری دور تک اس نے خوب ترقی کی۔ مغلیہ عہد جو کہ ہندوستان کی تاریخ کا زرین عہد مانا جاتا ہے، اس عہد میں فارسی کو سرکاری زبان بننے کا شرف حاصل ہوا اور تقریباً دوسو سال تک سرزمین ہند کی زبانوں کی سرتاج رہی۔ رفتہ رفتہ یہ شیریں زبان سرکاری اور ادبی حلقوں سے نکل کر عوام کی زبان پر رواں ہوگئی۔ غرض انیسویں صدی کے نصف اول تک یہ بیرونی زبان ہندوستان میں خوب پھلی پھولی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران اس زبان کو بہت نقصان ہوا۔ بیشتر نادر نسخے اور مخطوطات صحیفۂ عالم سے ناپید ہو گئے۔ کچھ کو انگریزوں نے اپنے ملک یورپ بھیج دیا اور جو کچھ باقی بچے ان کو نول کشور نے اپنی غیر معمولی دلچسپی اور کوششوں سے فراہم کر کے بہت کم وقت میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ علاوہ ازیں متعدد معروف شعرا کے دواوین، تذکرے، اخلاقی، تاریخی کتب وغیرہ جو اس وقت قلمی نسخوں کی شکل میں دستیاب تھیں تصحیح و تدوین کے بعد ترتیب دے کر شائع کرایا۔ اسی طرح نول کشور نے مذہبی کتابوں کی طرف بھی اپنی خاص توجہ مبذول کی۔ بعض اہم اور مقدس کتابوں کو نقل کر کے اس زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مذہبی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا۔ مطبع نول کشور کے پریس سے شائع شدہ مذہبی کتابوں میں ایک اہم تصنیف مہابھارت (رزم نامہ) بھی ہے۔

مہابھارت ہندوؤں کی نہایت اہم اور مستند تصنیف ہے جس کو ویدویاس جی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وید ویاس جی نے اپنی اس شاہکار کتاب کو اپنے ہی ایک شاگرد بھیشم پائین کے زور قلم سے تحریر کرایا تھا۔[۴] مہابھارت دراصل ایک قدیم رزمیہ داستان ہے۔ جس میں کوروؤں اور پانڈوؤں کے مابین ہونے والی جنگ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اصل موضوع کے ساتھ اور بھی قصہ، کہانیاں اور اخلاقی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ جن کی وجہ سے نظم کی طوالت کافی بڑھ گئی ہے۔ کتاب مہابھارت کی مختصر کہانی حسب ذیل ہے۔

قدیم ہندوستان میں 'بھرت' نام کا ایک راجہ گزرا ہے جس کے نام پر ہندوستان کا نام "بھارت ورش" ہوا۔[۵] جب اس کی چھ پشت حکومت کر چکی تو ساتویں پشت میں "بچتر برج" نامی ایک لڑکا پیدا ہوا۔ بڑا ہو کر بچتر برج ایک عظیم الشان بادشاہ بنا۔ بچتر برج کے یہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ دھرتراشٹر اور پانڈو۔ دھرتراشٹر چونکہ آنکھوں سے اندھا تھا اس لیے بچتر برج کی موت کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے پانڈو کو تخت سلطنت پر بیٹھایا گیا۔ پانڈو کے پانچ بیٹے تھے (یودھشٹر، بھیم سین، ارجن، نکل اور سہدیو) اور دھراشٹر کے ۱۰۱ بیٹے تھے۔[۶] جن میں دریودھن سب سے بڑا تھا چونکہ پانڈو کا جلد ہی انتقال ہو گیا اس لیے دھرتراشٹر راج گدی پر بیٹھا۔ تمام شہزادوں میں یودھشٹر سب سے لائق اور ہونہار فرزند تھا۔ اس لیے دھرتراشٹر نے اسے اپنا ولیعہد مقرر کیا۔ دھرتراشٹر کے اس فیصلہ سے دریودھن کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے بڑی چالاکی سے پانڈوؤں کو ہستناپور سے باہر نکال دیا۔ جلاوطنی کے عالم میں پانڈو پانچال شہر پہنچے۔ وہاں ارجن نے سوئمبر میں دروپدی کو جیت لیا۔ بعد میں پانچوں بھائیوں نے اس سے مشترکہ

شادی کر لی۔ پانچال کے راجہ سے رشتہ جوڑنے کے بعد پانڈوؤں کی طاقت بڑھ گئی۔ چنانچہ دھرتراشٹر نے پانڈوؤں کے ڈر سے اپنی سلطنت کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ پانڈوؤں کو دیا اور دوسرا اپنے بیٹوں سے مخصوص کیا۔ لیکن دریودھن یہ بھی برداشت نہ کر سکا۔ اس نے حیلہ و مکاری سے یودھشٹر کے ساتھ جوا کھیلا اور ایک دو بازی میں اس کا سب کچھ جیت لیا۔ مجبوراً پانڈووں کو تیرہ سال کے بنواس پر جانا پڑا۔ جلاوطنی ختم ہونے کے بعد یودھشٹر نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت واپس مانگی۔ مگر دریودھن نے دینے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں مہابھارت جنگ رونما ہوئی۔ یہ جنگ اٹھارہ دن تک جاری رہی۔ جس میں پانڈوؤں کو فتح نصیب ہوئی۔

مذکورہ کتاب کا فارسی میں سب سے پہلی بار ترجمہ عہد اکبری میں ہوا۔ اکبر اگرچہ امی تھا لیکن علم و ادب سے اسے ذاتی مناسبت تھی۔ اس نے متعدد منظوم داستانوں کو فارسی میں نقل کروایا اور ان کی مصوری میں بے شمار پیسہ خرچ کیا۔ پھر اس کو احساس ہوا کہ شعر و شاعری تو محض فرضی باتیں ہیں کیوں نہ ہندی کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا جائے تاکہ رہتی دنیا تک نام باقی رہے۔ چنانچہ ۹۹۰ھ میں اکبر نے "مہابھارت" کا سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ مہابھارت چونکہ ایک ضخیم تصنیف ہے لہٰذا اکبر نے اس کی ضخامت کو مدِنظر رکھتے ہوئے مترجمین کا ایک گروہ تیار کیا جس کی کاوشوں سے مذکورہ کتاب فارسی نثر کے قالب میں ڈھلی۔ اکبر نے اس منثور ترجمہ کو "رزم نامہ" کا نام دیا۔ رواج زمانہ کے مطابق یہ 'رزم نامہ' خط نستعلیق شکستہ میں تحریر کیا گیا تھا۔ چونکہ اس کو کئی لوگوں نے مل کر ترجمہ کیا تھا اس لیے اس کے مخطوطہ جابجا منتشر تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں نول کشور نے اپنی محنتوں اور کاوشوں سے اسے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا اور اپنی اس شائع کردہ تصنیف کو "مہابھارت فارسی" کا نام دیا۔ یہ کتاب راقمہ کی نظر سے گزری ہے۔ اس کی چاروں جلدیں مولانا آزاد لائبریری کے "کیفی کلیکشن" میں موجود ہیں۔ انھیں کو پیش نظر رکھ کر اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب "مہابھارت فارسی" ایک مقدمہ اور اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ مقدمہ مولف کتاب کا ذاتی تحریر کردہ نہیں ہے بلکہ "رزم نامہ" کے اصل نسخہ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ہر باب "پرب" کے نام سے منسوب ہے۔ ان اٹھارہ باب کے نام اور ترتیب حسب ذیل ہے۔

(۱) آد پرب (۲) سبھا پرب (۳) بن پرب (۴) بیراٹ پرب (۵) ادوّگ پرب (۶) بھیکم پرب (۷) دُرون پرب (۸) کرن پرب (۹) شل پرب (۱۰) سوپتک پرب (۱۱) استری پرب (۱۲) شانت پرب (۱۳) انساسن پرب (۱۴) اشمید پرب (۱۵) آسرم باسک پرب (۱۶) موسل پرب (۱۷) مہا پرستان پرب (۱۸) سرکاردھن پرب۔

جلد اول:

مذکورہ کتاب کی پہلی جلد "رزم نامہ" پانچ پرب (ابواب) پر مشتمل ہے جو ۱۰۷ صفحات پر مبنی ہے۔ اس

جلد کے ابتدائی صفحہ پر مندرجہ عبارت درج ہے جو دو جز میں منقسم ہے:

''مجموعۂ حالات نوادر جہان، تاریخ انتخاب واقعات پاستان، مخزن کوائف صدق و راستی موسوم بہ''

اس نامکمل عبارت کے نیچے جنگی اسلحے یعنی گرز، بھالہ، تلوار وغیرہ کی تصاویر کے بیچوں بیچ کتاب کا نام ''مہا بھارت فارسی'' درج کیا گیا ہے۔ اس کے ٹھیک نیچے ایک چھوٹے سے دائرے میں باب کو ''فن'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کے بعد بالا عبارت کا دوسرا جز پیش کیا گیا ہے۔ جو حسب ذیل ہے:

''کہ کتابیست بسیار مستند و صحیفہ ایست ھر دل عزیز و معتمد مترجمۂ علما معنون بہ دیباچہ ابوالفضل''

اس کے نیچے نول کشور کے مطبع کا نام اور پتہ درج ہے۔ اس صفحہ کے چاروں طرف بیل بوٹوں کا ایک خوبصورت بوڈر تیار کیا گیا ہے۔ جس کے دائرے میں مذکورہ بالا اطلاعات درج کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے ہر باب کے آغاز سے پہلے اول صفحہ کو دہرایا گیا ہے۔ بعد از آں باب کے اندر تحریر شدہ سنسکرت الفاظ کی ایک فہرست ''فرہنگ'' کے نام سے پیش کی گئی ہے جو چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس فہرست میں قاری کے صحیح تلفظ کے لیے فارسی الفاظ کے سامنے سنسکرت الفاظ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اصل باب کی ابتدا ہوتی ہے۔ مولفِ کتاب نے ابوالفضل کے دیباچہ کو ''دیباچہ'' کے نام سے تحریر نہیں کیا بلکہ اسے باب اول کے جز کے طور پر پیش کیا ہے۔ جس کی ابتدا ابوالفضل کے ان اشعار سے ہوتی ہے: ۸

ای ہزار ہزار عالم از شوق تو است
سر در راہ جستجوی و جان بر کف دست
بس تخت سیاہ گشت و بس خامہ شکست
نقشی ننگاشتند ز انگونہ کہ ہست

یہ جز ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اصل باب کو سنسکرت لفظ ''شلوک'' کے نام سے نقل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ ''پرب'' نقل کیے گئے ہیں۔ اس جلد کا اختتام ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے۔ ۹

'' تمام شد از کتاب مہا بھارت فارسی کہ آنرا ادوگ پرب گویند فقط''۔

اس جلد میں کوروں اور پانڈوؤں کے خاندان کی تاریخ اور ان کی (کورو اور پانڈو کی) جوانی تک کے احوال کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

جلد دوم:

اس جلد کی ابتدا ۱۸ صفحات پر مشتمل ایک فرہنگ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد چھٹے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ مذکورہ جلد کا خاتمہ ''رزم نامہ'' کے گیارہویں باب پر ہوتا ہے۔ یہ جلد تقریباً ۴۸۹ صفحات پر مبنی ہے۔

اس جلد میں مہا بھارت جنگ کی اول روز کی معرکہ آرائی سے لے کر اٹھارویں (۱۸) روز تک کی جنگ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

جلد سوم:

اس جلد کی ابتدا بارہویں باب سے ہوتی ہے اور اختتام تیرہویں باب پر ہوتا ہے۔ مولف نے باب سیزدہم کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا حصہ ''انساسن پرب'' کے نام سے نقل کیا گیا ہے۔ حصہ دوم کو پہلے حصہ کے تتمہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور حصہ سوم ''فصل سوم'' کے نام سے درج ہے۔ اس باب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں ہندو مذہب کی اہم باتوں کو ذکر کیا گیا ہے وہاں فارسی عبارت کے نیچے اصل مہا بھارت کی سنسکرت عبارت بھی نقل کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جہاں 'کوروں' اور 'پانڈوؤں' کا شجرہ پیش کیا گیا ہے۔ وہاں صفحے کے بیچ میں ایک سطر کھینچ کر اس کے ایک طرف فارسی زبان میں شجرہ پیش کیا گیا ہے اور دوسری طرف سنسکرت زبان میں تحریر شدہ شجرہ نقل ہے۔ جس کی وجہ سے اس جلد کی ضخامت بڑھ گئی ہے۔ یہ جلد ۸۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد کا اختتام اس سطر پر ہوتا ہے:

''تمام شد فن سیزدہم از کتاب مہا بھارت کہ آن را انساسن پرب گویند''۔ ۱۰

جلد چہارم:

چوتھی جلد کی ابتدا 'رزم نامہ' کے چودھویں باب سے ہوتی ہے اور اختتام اٹھارہویں باب پر ہوتا ہے۔ اس جلد میں پانڈوؤں کے علائق دنیا سے ترکِ تعلق ہو کر ہمالیہ پہاڑ پر جانے اور ان کی موت کے حال پر مبنی ہے۔ یہ جلد تقریباً ۳۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد کا اختتام اس سطر پر ہوتا ہے:

''تمام شد پرب ہیجد ہم از کتاب مہا بھارت کہ آن را سرگاردہن پرب گویند'' ۱۱

زیر نقد و تبصرہ تصنیف میں تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایک اہم اور بڑی خامی بھی نظر آتی ہے کہ اس میں کہیں بھی سال طباعت نہیں درج کیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی قطعہ تاریخ درج ہے جس کی وجہ سے اس کی تاریخ طباعت کے بارے میں کوئی معلومات فراہم ہو سکے۔ البتہ اپنی نہج طباعت اور ادبی اہمیت کے اعتبار سے یہ تصنیف ادبی حلقہ کی شاہکار میں شمار ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی:

(۱) مضمون، منشی نول کشور اور ان کا خاندان، نور جہاں، نیا دور، شمارہ ۹۱۸، جلد ۳۵، لکھنو، نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء، ص ۲۰۶

(۲) ایضاً

(۳) مطبع نول کشور کا شعبۂ تصنیف وترجمہ، ڈاکٹر نورالحسن، نیادور، شمارہ ۹۱۸، جلد ۳۵ لکھنو نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۴۷

(۴) مہابھارت فارسی، مولف نامعلوم، مطبع نول کشور، لکھنو ص ۳۷

(۵) مختصر تاریخ ہند، سید ابومظفر ندوی، اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء، ص ۸

(۶) دھرتراشٹ کے سو بیٹوں کے علاوہ ایک بیٹا اور تھا جس کا نام یجیش تھا جو اس کی دوسری بیوی کے بطن سے تھا۔ ایک بیٹی بھی تھی۔ (مہابھارت فارسی، ص ۱۸۴)

(۷) منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی، (بتصحیح مولوی احمد علی)، کالج پریس کلکتہ، ۱۸۶۷ء، جلد دوم ص ۳۱۹

(۸) مہابھارت فارسی، مولف کتاب نامعلوم، مطبع نول کشور، لکھنو، جلد اول ص ۱

(۹) ایضاً، جلد اول، باب پنجم ص ۱۰۷

(۱۰) ایضاً، جلد سوم، باب سیزدہم ص ۳۵۶

(۱۱) ایضاً، جلد چہارم، باب ہیجدہم ص ۶

☆☆☆☆☆

Nazia Taskeen
T.N.P Lock Works, Near Nomani Masjid,
Sarai Miyan By Pass Road,
Aligarh- 202001, Mob. 09627083679
E-Mail: nazinaz123@gmail.com

محمد حسن کا ڈراما ”قاتلوں کے درمیان“: ایک تجزیہ

محمد پرویز عالم

محمد حسن کی شخصیت اردو زبان وادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت اردو کے ایک معروف دانشور، مفکر، ترقی پسند نقاد، ڈرامہ نگار، شاعر، مترجم اور افسانہ نگار ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر ان کی شہرت ایک ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے ہے۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں بھی اپنے ترقی پسندانہ افکار ونظریات کی عکاسی کی ہے۔ محمد حسن کے ڈراموں کے مختلف مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ”پیسہ اور پرچھائیں“، ”کہرے کا چاند“، ”مور پنکھی“، ”تماشا اور تماشائی“، ”ضحاک“ اور ”خون کے دھبے“ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں بھی ترقی پسند موضوعات ومسائل کو مرکزیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں سماجی، سیاسی، تہذیبی، تاریخی اور اقتصادی صورت حال کی حقیقی ترجمانی ملتی ہے۔ انھوں نے انسانوں پر ہونے والے ظلم وجبر کو اپنے ڈراموں میں نہایت بے باکی سے پیش کیا ہے۔ محمد حسن ہر طرح کی تنگ نظری اور تعصب سے قطع نظر فکر وفن دونوں کو اہمیت دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں فکر وفن کا امتزاج نظر آتا ہے۔

”قاتلوں کے درمیان“، محمد حسن کے ڈراموں کے مجموعے ”خون کے دھبے“ کا پہلا ڈراما ہے۔ زیر مطالعہ ڈراما عالمی سطح پر رونما ہونے والی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی شکست وریخت کو نہایت بے باکانہ انداز میں سامنے لاتا ہے۔ محمد حسن نے اس ڈرامے کے توسط سے بین الاقوامی منظر نامے پر انسانیت اور اخلاقی قدروں کے خلاف ہونے والی سازشوں اور مکاریوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ ”قاتلوں کے درمیان“ بنیادی طور پر سیاسی ڈراما ہے۔ یہ ڈراما غیر انسانی حرکات وسکنات اور خطرناک سازشوں کے مختلف خطرناک پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس ڈرامے کے اہم کرداروں میں افسر، شوبھرام، شاعر، بینک منیجر اور رانی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا کرداروں نے اپنے عادات واطوار اور گفتار وکردار کے ذریعہ سماج وانسان دشمن عناصر کی گندی حرکتوں اور ان کی ضمیر فروشی سے پردہ اٹھایا ہے۔

محمد حسن نظریاتی طور پر ایک ترقی پسند تخلیق کار ہیں۔ ان کی تخلیقات میں ترقی پسندانہ موضوعات ومسائل کی بازگشت سنائی پڑتی ہے۔ ان کی بیشتر تخلیقات میں ظلم واستحصال، جبر وتشدد، سماجی ناانصافی، غربت ومفلسی، بھوک وپیاس، بے بسی ومایوسی، انسانی دکھ درد اور دوسرے غیر انسانی حرکات وسکنات کو مرکزیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے ادبی سرمائے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سماج اور معاشرے میں پیش آنے والے

حالات و مسائل سے ان کا دل کڑھتا ہے۔وہ اپنے ڈراموں کے توسط سے ان تمام تر سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی خرابیوں اور خامیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔زیر مطالعہ ڈرامے کا عنوان ''قاتلوں کے درمیان'' بھی اس قابل رحم صورت حال کی جانب واضح اشارہ کرتا ہے۔یہ ڈراما بین الاقوامی منظر نامے پر کی جانے والی سیاسی چال بازیوں اور سازشوں کا پردہ چاک کرتا ہے۔ڈراما ''قاتلوں کے درمیان'' عہد حاضر کی قومی اور عالمی سیاست کے سنجیدہ مسائل کو خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔بقول انیس اعظمی:

محمد حسن بنیادی طور پر ترقی پسند اور مارکسسٹ ہیں۔غالباً اسی لیے ان کی تحریروں بالخصوص ان کے بیشتر ڈراموں میں جرأتمندی اور باغیانہ تیور مختلف کرداروں کے حوالے سے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ان کے اکثر و بیشتر ڈراموں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ سماجی ناہمواریوں، اقتصادی انتشار، معاشی ابتری، مذہبی ڈھونگ، سیاسی اقتدار کے لیے سیاسی ریشہ دوانیوں، جابروں اور سرمایہ داروں کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے ایسے کردار تراشتے ہیں جو بہتر معاشرے اور قابل قبول صورت حال کے لیے ظالموں اور جابروں کو بے نقاب کر سکیں۔''(اردو ڈراما اور ڈاکٹر محمد حسن، انیس اعظمی، مشمولہ ''محمد حسن: افکار و اسالیب''، مرتبہ عبدالحق، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۰۰)

آج پوری دنیا میں تمام تر قدرتی وسائل اور مال و دولت کو غلط طریقے سے اپنے قبضے میں کرنے کے لیے قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔سماج و معاشرے کے چند انسان دشمن لوگ انسانیت کے نام پر بدنما داغ ہیں۔وہ پوری دنیا کے امن و سکون کو دکھ درد اور غم میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔شوبھرام ڈرامے کا ایک ناقابل فراموش کردار ہے۔شوبھرام جیسے مکار اور سفید پوش لوگ دولت اور طاقت کے زور پر انسانیت کا وجود مٹانا چاہتے ہیں۔وہ ایک فوجی افسر سے ضمیر فروشی کا سودا کرتا ہے۔اس کی زندگی کا خاص مقصد غلط و ناجائز طریقے سے دولت کمانا ہے۔تاکہ وہ پوری دنیا پر راج کر سکے۔اس کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ سے دنیا کی تباہی و بربادی کی عبرتناک صورت حال سامنے آتی ہے۔ایسے لوگ اپنے مقصد کے حصول کے لیے فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ دوسری غیر انسانی اور غیر اخلاقی حرکتوں کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ڈرامے میں شوبھرام نامی ایک کردار فوجی افسر سے دھمکی بھرے لہجے میں کہتا ہے:

''دو باتیں یاد رکھنا جرنیل صاحب۔ہمارے انٹرنیشنل بینک کی دو سو سے زیادہ شاخیں دنیا بھر میں کام کرتی ہیں۔ڈرگس اور افیم کا دھندا کرتے ہیں ہم لوگ۔ہیروئن کے کالے دھن کو دودھ کا دھلا سفید کرتے ہیں۔اس میں تمہارا بھی حصہ ہوگا......

دوسری بات یہ کہ ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔دنیا کے بڑے سے بڑے ملک کا بڑے سے بڑا آدمی، بادشاہ، صدر، وزیر اعظم یا تو ہمارا اپنا آدمی ہے یا ہمارے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچے ہوئے

ہیں۔وہ خود قبضے میں نہیں ہے تو اپنی بیوی یا بیٹے کے ذریعہ سے ہمارے قبضے میں ہے۔ہم سے مقابلہ بے کار ہے۔ہم دنیا فتح کر چکے ہیں۔''(خون کے دھبے، محمد حسن، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۴)

مذکورہ بالا اقتباس کے پس پردہ انسانیت کے خلاف ہونے والی عبرت ناک وخطرناک سازشوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔سوال اس بات کا ہے کہ شوبھرام جیسے لوگ کب تک اپنے کالے کارنامے انجام دیتے رہیں گے۔دراصل ایسے لوگ سماج و معاشرے کے لیے ناسور اور کینسر ہیں۔آج بھی سماج و معاشرے میں شوبھرام جیسے مکار و ضمیر فروش لوگ موجود ہیں۔ایسے لوگوں کو بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے۔لیکن افسوس کہ ملک کی حکومت ایسے ضمیر فروش لوگوں کی پشت پناہی کرتی ہے۔

دراصل پیش نظر ڈراما ''قاتلوں کے درمیان'' ظلم و جبر کے خلاف ایک مضبوط ترین آواز ہے۔یہ ڈراما اپنے قارئین کو استحصال و تشدد کے خلاف بیدار کرتا ہے۔محمد حسن نے اس ڈرامے میں ایک شاعر کا کردار بھی پیش کیا ہے۔اس کردار سے ڈرامے میں خاطر خواہ دلچسپی کے عناصر پیدا ہو گئے ہیں۔انھوں نے اس کردار کے ذریعہ قلم کی ناموس و عزت کی حفاظت کی ہے۔یہ بظاہر شاعر ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے کردار کے سہارے اخلاقی قدروں اور انسانیت پسند نظریات کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس ڈرامے کا آغاز شاعر اور فوجی افسر کی گفتگو سے ہوتا ہے۔علاوہ ازیں ڈرامے کا اختتام بھی شاعر کے عبرت ناک خاتمے کے ساتھ ہوتا ہے۔محمد حسن نے اپنے مشہور ترین ڈراما ''ضحاک'' میں بھی سیاسی مسائل پیش کیے ہیں لیکن وہاں پر تعلیم یافتہ و باشعور طبقہ حکومت و ظالم طاقتوں کے سامنے جھکا ہوا نظر آتا ہے۔''قاتلوں کے درمیان'' کی ابتدا میں فوجی افسر شاعر سے باغیوں اور انقلابیوں کے نام دریافت کرتا ہے۔لیکن شاعر ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔اس نافرمانی پر فوجی اس پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتا ہے۔اس کے اوپر کوڑے برسائے جاتے ہیں۔اسے بری طرح مارا جاتا ہے۔شاعر کو رہا کرنے کی لالچ بھی دی جاتی ہے لیکن آخر کار شاعر تمام مظالم سہتے ہوئے بھی انسانی قدروں اور اپنے ضمیر کی حفاظت کرتا ہے۔دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''افسر: اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو۔انگاروں جیسی آنکھیں نکال کر کیا گھورتے ہو شاعر۔
میں کہتا ہوں اتنا عذاب نہیں جھیل پاؤ گے۔اس لیے بہتر ہے کہ نام بتانے میں دیر نہ کرو۔

شاعر: میرے ساتھی!

افسر: ہاں وہ لوگ جو تمہارے ساتھ حکومت کے خلاف سازش میں شریک تھے۔تمہیں ان کے نام معلوم ہیں؟

شاعر: جی ہاں، معلوم ہیں۔انقلابی جھوٹ نہیں بولتے۔مجھے سب کے نام معلوم ہیں لیکن تمھیں نہیں بتاؤں گا۔

افسر: کب تک اس طرح الٹے ٹنگے رہو گے اور اس فوجی جیل خانے میں ہمارے سپاہیوں کے کوڑے کھاتے رہو گے۔

شاعر: جب تک تم چاہو۔

افسر: ہم قول دیتے ہیں کہ ہم تمھیں رہا کر دیں گے۔ عزت کے ساتھ تمھیں گھر بھیج دیں گے۔ تم شاعر ہو کہاں اس جھمیلے میں پڑ گئے۔ ضرور کہیں کوئی بھول ہوئی ہوگی۔

شاعر: نہیں، کوئی بھول نہیں ہوئی ہے۔ (ایضاً ص ۱۸)

انسانیت کا محافظ شاعر اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے انسان دشمن طاقتوں کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ فلاحی تنظیموں کی جانب سے دل کے علاج کے لیے شاعر کو لندن بھیجا جاتا ہے۔ لیکن جب اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا علاج انھیں لوگوں کے پیسوں سے ہوا ہے تو اسے بے حد افسوس ہوتا ہے۔ دل کے آپریشن کے بعد لندن سے واپسی پر شاعر کے اعزاز میں ایک شاندار جلسہ بھی منعقد کیا جاتا ہے۔ شاعر اپنے انقلابی ساتھیوں سے اپنی اس کوتاہی پر نادم بھی ہوتا ہے۔ وہ سب کے سامنے معافی بھی مانگتا ہے۔ دراصل ایسے جرائم پیشہ لوگ سماج میں عزت و احترام بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی سماجی اور سیاسی خدمات سے اپنے اصل چہرے پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے تعلقات اور مراسم دور دور تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسی انسان دشمن قوتوں کی گرفت اتنی آسان نہیں۔ کیوں کہ انھیں سیاسی رہنماؤں کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ یہ ڈراما ملکی اور غیر ملکی سطح پر پیش آنے والے سیاسی انتشار اور اقتصادی بدعنوانی اور اخلاقی شکست و ریخت کو ایک نئے تیور کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ شو بھرام اور فوجی افسر وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

محمد حسن نے ڈراما ''قاتلوں کے درمیان'' میں شراب، شباب اور جنسی بدعنوانی کا نہایت جاندار اور دلچسپ منظر پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے میں رانی نامی خاتون کا کردار نظر آتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر کے انھیں جرائم پیشگی کے اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دیتی ہے۔ رانی فوجی افسر کی داشتہ ہے۔ فوجی افسر شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی اس سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے۔ وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ اس طرح رانی قدم قدم پر جنسی استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ افسوس کہ آج رانی جیسی نہ جانے کتنی خواتین کی زندگی دوزخ بنی ہوئی ہے۔ بعض خواتین کسی مجبوری اور لاچاری کے تحت اپنا جنسی استحصال خاموشی سے برداشت کرتی ہیں تو بعض عیاشی کے لیے اپنی مرضی سے ایسے گندے راستے کو اختیار کرتی ہیں۔ عیاش ذہن رکھنے والی ایسی عورتوں کی شرمناک حرکتوں سے آنے والی نئی نسلیں متاثر ہوتی ہیں۔

سیاسی انتشار، جنسی بدعنوانی، اقتصادی زوال اور تہذیبی شکست و ریخت اردو میں کوئی نیا موضوع نہیں ہے لیکن محمد حسن نے اپنی فنکارانہ صلاحیت اور تخلیقی قوت سے اس ڈرامے میں جان ڈال دی ہے۔ انھوں نے

کرداروں کے ذریعہ غضب کی کشمکش پیدا کر دی ہے۔ اس ادب پارے میں فلسفیانہ و فکری گہرائی نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے عام مسائل مذکور ہیں۔ محمد حسن نے محفل کی رونق بننے والی رانی جیسی ضمیر فروش، بدکردار اور عیاش عورت کو خلق کر کے معاشرے و سماج کو آئینہ دکھایا ہے۔ یوٹوپیا کے بادشاہ کے ملک میں آنے کی خبر ملتی ہے۔ اس کی خاطر تواضع کی ذمہ داری فوجی افسر کو دی جاتی ہے۔ اسے اس کا انچارج بنایا جاتا ہے۔ وہ اسے خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی داشتہ رانی کو اس کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ رانی کے اندر انکار کی ایک ہلکی سی کرن ضرور نظر آتی ہے لیکن جلد ہی اس کی مزاحمتی قوت دم توڑ دیتی ہے۔ وہ آنے والے اس مہمان کی ہر طرح سے دل جوئی کرتی ہے۔ اس کے اس قدم سے معاشرے کے کھوکھلے پن کی کئی پرتیں واضح ہوتی ہیں۔ شراب و شباب کے متعلق دونوں میں طویل گفتگو بھی ہوتی ہے۔ ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''افسر: سنو رانی کامیابی کی کنجی ہمارے ہاتھ آ گئی ہے۔ دولت، بے پناہ دولت! قوت، بے پناہ قوت! حکومت پوری دنیا پر حکومت! یوٹوپیا کے بادشاہ کل یہاں آ رہے ہیں۔ انھیں ہر طرح خوش رکھنا ہے۔

رانی: مجھے معلوم ہے۔

افسر: بادشاہ شکار، شراب اور جوان عورتوں کا شوقین ہے۔ تم اس کا دل جیت سکو گی؟

رانی: کیا بک رہے ہو۔ میں تمہاری ہوں صرف تمہاری۔

افسر: ہماری تو ہو ہی، مگر وہ کوئی تمھیں جیب میں ڈال کر تو نہیں لے جائے گا میری جان، اور پھر چند دن کی بات ہی ہے۔ پھر وہی ہم، وہی تم۔

رانی: خبردار!!! میں بکاؤ نہیں ہوں۔

افسر: اسے شیشے میں اتارنا ضرور ہے۔ صرف اتنا کہ وہ اپنی، اپنے ملک کی اور اپنے اثر والے ملکوں کی دولت، اس کا سارا کالا اور سفید دھن انٹرنیشنل بینک میں جمع کرا دے۔

رانی: تو یوں کہو نا!! لیکن اگر میں انکار کر دوں تو۔

افسر: کرنا تو تمھیں یہی سب کچھ ہوگا۔ تم کوئی پتی ورتا ساوتری نہیں ہو۔ اور میں کوئی اوتار یا فرشتہ نہیں ہوں۔'' (ایضاً ص ۲۶-۲۷)

اس اقتباس کی روشنی میں انسانی سماج و معاشرے کو اخلاقی پستی، اقتصادی بدعنوانی اور تہذیبی زوال کے گڑھے میں ڈھکیلنے والوں کی گھنونی حرکتیں نمایاں ہو گئی ہیں۔ ایسے لوگ اپنی مفاد پرستی اور خود غرضی کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ ملک و قوم اور سماج و معاشرے سے غداری کرنے والے ایسے عناصر قانون کی نظر میں بھی معزز بنے رہتے ہیں۔ ڈرامے کا یہ فکری نکتہ ہمیں دعوت فکر دیتا ہے۔

محمد حسن نے اس ڈرامے میں ایک نہایت ہی اہم اور سنجیدہ مسئلے کو اٹھایا ہے۔ دراصل بین الاقوامی اور شیطانی طاقتیں دنیا کو نشے کے دلدل میں جھونکنا چاہتی ہیں۔ شراب، ہیروئن، ڈرگس اور افیم جیسی خطرناک منشیات کا کاروبار کرنے والی طاقتیں آنے والی نسل کی تباہی اور بربادی کا جال بن رہی ہیں۔ ایسے خطرناک لوگ منشیات کے کاروبار کے پس پردہ بے پناہ دولت کمانا چاہتے ہیں اور پوری دنیا کو اپنی طاقت کے آگے جھکانا چاہتے ہیں۔ شوبھرام جیسا شخص ایسی اندھی طاقتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ ہر پل اور ہر لمحہ انسانیت کے خاتمے کے لیے سازشیں کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ فوجی افسران کو بھی اپنے دام میں پھانس لیتا ہے۔ دولت اور خوف کی بنیاد پر شوبھرام فوجی افسر کو خرید لیتا ہے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے وہ اسے ہر طرح سے استعمال کرتا ہے۔ یہ ہمارے لیے انتہائی افسوس کا مقام ہے۔ ایسے افسران ملک کی سلامتی اور یہاں کی جمہوری قدروں کے لیے بے حد خطرناک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر سختی کی اشد ضرورت ہے۔ منشیات کی تجارت کے حوالے سے شوبھرام فوجی افسر سے کہتا ہے:

''ان پہاڑیوں کے پیچھے دور تک افیم کے کھیت ہیں۔ زمین کے نیچے ہیروئن اور اسمیک بنانے والے کارخانے ہیں۔ یہ ہم باہر کے ملکوں کو بیچتے ہیں، جو ملک صدیوں سے پورے ایشیا کو زبردستی افیم کھلاتے آئے ہیں ہیروئن اور اسمیک کا ایک ذرہ بھی ہم ایشیا میں بیچیں، اپنے ملک میں کسی کو دیں تو ہمیں گولی مار دینا، مگر ہمارا مال یورپ اور امریکہ بھیجنے سے نہ روکنا'' (ایضاً، ص ۲۳)

یہ اقتباس مادہ پرستی، خود غرضی اور سیاسی پستی میں ڈوبی ہوئی دنیا کی نہایت حقیقی اور جاندار تصویر پیش کرتا ہے۔ ''قاتلوں کے درمیان'' محمد حسن کے مزاحمتی نظریات کا مظہر ہے۔ محمد حسن نے اس ڈرامے کے ذریعہ پردے میں ہونے والے ظالمانہ کھیل کو نہایت ہی بے باکانہ انداز میں بے نقاب کیا ہے۔

واضح رہے کہ ان کی بیشتر تحریریں بے باکی، مزاحمت اور احتجاج کی عمدہ مثالیں پیش کرتی ہیں۔ خاص طور پر ان کی ڈراما نگاری میں احتجاجی کیفیت اور کھل کر سامنے آتی ہے۔ انھوں نے ہر طرح کی مصلحت پسندی، تعصب اور جانب داری سے بالاتر ہو کر انسانیت اور انسانی قدروں کی حفاظت کے لیے اپنی تخلیقی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے صرف تفریح کے لیے نہیں لکھا بلکہ ان کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد تھا۔ وہ اپنی تخلیقات کے توسط سے معاشرے میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ انھوں ایمرجنسی کے صبر آزما دور میں ''ضحاک'' جیسا احتجاجی اور انقلابی ڈراما لکھا۔ یہ ڈراما بھی سیاسی جبر و تشدد اور استحصال کے خلاف مضبوط ترین آواز ہے۔ شوبھرام اور فوجی افسر اس ڈرامے کے اہم ترین کردار ہیں۔ ڈرامے کا پورا پلاٹ ان دو کرداروں کے گرد گردش کرتا ہے۔ ایسے انسان دشمن لوگ اپنے مفاد کے لیے کسی بھی حد تک گر سکتے ہیں۔ ملک میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت گری کے پس پردہ بھی ایسے ہی حیوانیت پسند عناصر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ ڈراما چیخ چیخ کر اس بات کی شہادت دے رہا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''افسر: کیا بکتے ہو؟

شوبھرام: بکتا نہیں ہوں بلکہ سچ کہتا ہوں۔ فسادات ہوتے ہیں ملک میں محل دو محلوں پر، زمینوں اور قبرستانوں پر قبضے بھی ہم ہی کرتے ہیں۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو مارتے ہیں تو بھی ہمارے ہاتھوں سے مارتے ہیں، لوٹتے ہیں، گھروں کو جلاتے ہیں تو بھی ہماری سیوائیں حاصل کرتے ہیں۔

افسر: تم خونی ہو۔

شوبھرام: یہ سب کام ہم کرتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے۔

افسر: اسمگلنگ، چور بازاری، کالا دھندا، قتل و غارت گری، حوالے کا بازار، جی ہاں یہ سب کام ہم کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں ہم وہ طاقت دیتے ہیں جسے غنڈوں، قاتلوں اور لٹیروں کی طاقت کہا جاتا ہے۔ (ایضاً، ص ۲۱)

محمد حسن کے ڈرامے موضوعات و مسائل کے ساتھ ساتھ فکری و تکنیکی سطح پر بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے پلاٹ، کردار، مکالموں اور اسلوب کی سطح پر بھی اپنی فنکارانہ ترجیحات کو قائم رکھا۔ وہ اپنے ڈراموں کو غیر ضروری طور پر طویل نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے ڈرامے اپنی فکری و فنی ضرورتوں کے اعتبار سے اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں تصادم اور کشمکش کی کیفیت بھی خاطر خواہ نظر آتی ہے۔ زیر مطالعہ ڈرامے میں کوئی فنی جدت نظر نہیں آتی۔ اس میں انھوں نے علامتی پیرایہ اور استعاراتی اسلوب کا استعمال نہیں کیا ہے بلکہ ڈرامے کا پلاٹ سادگی کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے۔ ''قاتلوں کے درمیان'' کے برعکس ان کے ڈرامے ''ضحاک'' میں جدت پسندی کی بہترین مثال ملتی ہے۔ دراصل محمد حسن حسب حال فنی لوازمات کو اپناتے ہیں۔ مختصر یہ کہ پیش نظر ڈراما ''قاتلوں کے درمیان'' ہر زمانے میں پیش آنے والے جبر و تشدد اور ظالمانہ اندھی قوتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا رہے گا۔



Md. Pervez Alam *(Research Scholar)*
Room No: 45, Sabarmati Hostel
JNU, New Delhi, 110067
Mobile: 9971989353
E-mail: mpaurdu21@gmail.com

علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت، علمی و ادبی خدمات

فرحان احمد

علامہ سید سلیمان ندوی علم کے ایک بحر زخار تھے۔تصانیف چھوڑی تو اس قدر عمیق کہ علوم اسلامی اور تاریخ و ادب کے غواص ان میں غوطہ زنی کر کے حقائق و معارف کے لولو و مرجان مدتوں نکالتے رہیں گے۔علامہ کے علوم و تحقیقات کی گراں باری ہی کا شاید یہ اثر تھا کہ ان کی وفات پر تقریباً پندرہ برس اہل علم وقلم پر سکتہ طاری رہا پھر آہستہ آہستہ ہمتیں بندھیں اور علامہ پر کچھ لکھا جانے لگا اور اب پچھلے دس برس سے یہ حال ہے:

ترا ورد ذکر زباں ہو رہا ہے یہاں ہو رہا ہے، وہاں ہو رہا ہے

حالات زندگی: سید صاحب 22/نومبر 1884ء مطابق 23/صفر 1302ھ بروز جمعہ صوبہ بہار کے ایک مردم خیز گاؤں دیسنہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔آپ کا پدری سلسلہ نسب امام علی رضاؑ بن امام موسی کاظمؒ اور مادری سلسلہ امام زید شہید بن امام زین العابدین تک پہنچتا ہے۔(1) سید صاحب کا نام ان کے جد امجد حکیم محمدی نے انیس الحسن اور کنیت ابونجیب رکھی تھی لیکن پھر ایک پر لطف واقعہ کی بنا پر سلیمان پڑ گیا۔(2)

تعلیم: سید صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے ایک معلم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود اکھدوی سے حاصل کی۔اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کرنے کے بعد عربی میں (میزان منشعب) اپنے بڑے بھائی سید ابوحبیب سے پڑھی۔اس کے بعد مزید تحصیل علم کے لیے اپنے والد کے پاس اسلام پور چلے گئے وہاں سے پھلواری شریف پھر پٹنہ آئے۔ایک سال خانقاہ مجیبی میں قیام کر کے مولانا محی الدین سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں یہیں کے دوران قیام شاہ سلیمان پھلواروی سے منطق کے بعض اسباق کا درس لیا۔(3) پھلواری سے دربھنگہ بھیجے گئے۔سید صاحب 1901ء میں دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو میں داخل ہوئے۔یہاں پانچ سال رہ کر تعلیم کی تکمیل کی۔(4) ندوہ میں انھوں نے مفتی عبداللطیف سنبھلی، سید علی زینبی، مولانا فاروق چڑیا کوٹی اور حکیم عبدالحیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور 1906ء میں ندوہ سے سند فراغت حاصل کی۔

شادی: سید صاحب نے تین شادیاں کی تھیں۔پہلا عقد عنفوان شباب 1904ء میں ان کی چچازاد بہن سے ہوا تھا۔تیرہ برس کی رفاقت کے بعد ان کی اہلیہ نے 1917ء میں داغ مفارقت دیا، سید صاحب پر اس سانحہ کا غیر معمولی اثر ہوا اور فراق یار کے عنوان سے چند اشعار بھی موزوں کئے۔پہلی اہلیہ سے متعدد اولاد ہوئیں مگر صرف ایک لڑکی سیدہ اور ایک صاحبزادہ ابوسہیل زندہ رہے۔

سید صاحب نے اس کے بعد اپنے والد کے پیہم اصرار پر 1920ء میں عقد ثانی کیا۔یہ اہلیہ مشکل سے ڈیڑھ

سال حق رفاقت ادا کر کے جنت نعیم کو سدھار گئیں۔ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔اس کے بعد جنوری 1923ء کو مظفر پور بہار کے ایک سادات خانوادہ میں تیسرا نکاح کیا۔اس سے چار صاحبزادیاں شمیمہ، شکیلہ، شمسیہ اور تارا اور ایک فرزند ارجمند ڈاکٹر سلمان یادگار ہیں۔چاروں لڑکیوں کی شادیاں سید صاحب کی زندگی میں ہی معزز خاندان میں ہوگئی تھیں۔

بیعت: 1938ء سید صاحب کی زندگی کے اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔اسی زمانے میں ایک عظیم روحانی و باطنی انقلاب پیدا ہوا۔باوجود عالم اسلامی کے ایک متبحر عالم، ایک جلیل القدر متکلم، ایک دقیقہ سنج فقیہ، ایک بے مثل ادیب اور ایک وسیع النظر مورخ ہونے کے انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کے آستانہ تصوف و معرفت پر اپنی جبین نیاز خم کر دی۔آخر کار 22/اکتوبر 1942ء تک اس کے سبھی مراحل طے کر کے مرشد کی طرف سے سلاسل اربعہ میں خرقہ خلافت عطا ہوا، جس کے بعد وہ خاص خاص لوگوں کو بیعت بھی کرانے لگے۔(5)

وفات: اکتوبر 1949ء میں سفر حج سے واپس ہو کر مع اہل وعیال اعظم گڑھ پہنچے۔لیکن دارالمصنفین کے بعض شرکائے کار کے تکلیف دہ رویے سے انھیں قلبی اذیت پہنچی اور مجبور ہو کر 14/جون 1950ء کو پاکستان منتقل ہو گئے۔شروع میں عارضی قیام کے ارادہ اور اعزہ و اقارب سے ملنے کی نیت سے گئے تھے مگر وہاں بعض ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ مستقل سکونت کا ارادہ کرلیا۔یوں تو 1945ء سے سید صاحب کی صحت کا اضمحلال شروع ہوگیا تھا لیکن اپنے علمی مشن کی تکمیل کی دھن میں ان کی مصروفیات برابر بڑھتی جارہی تھیں۔سید صاحب 1953ء میں پاکستان ہسٹوریکل کانفرنس کی صدارت کے لیے ڈھاکہ تشریف لے گئے۔واپسی میں ہندوستان میں اپنے بعض اعزہ کے یہاں کچھ دن قیام کیا۔کراچی پہنچ کر شدید علیل ہو گئے اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔بالآخر 22/نومبر 1953ء مطابق 14/ربیع الاول 1373ھ کی شب کو ان کا پیمانہ حیات لبریز ہوگیا اور 71 سال ضیا پاشی کے بعد علم و فضل کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا، دوسرے دن نیوٹاون کراچی کی جامع مسجد میں مولانا تھانوی کے خلیفہ ڈاکٹر عبدالحیؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔(6)

شخصیت و اخلاق: مولانا ابوالحسن علی ندوی سید صاحب کے حلیہ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

”قد میانہ مائل بہ پستی، چہرے سے معصومیت نمایاں، لباس نہایت صاف ستھرا، ہر چیز نفاست و نستعلیقی پر دال، شیروانی کسی قدر لانبی، عمامہ سر پر نہایت سفید اور صاف اور اس کے پیچ نہایت خوبصورتی سے دیے ہوئے۔“ (7) ضیاء الدین برنی نے سید صاحب کے انتقال کے صرف ایک یوم قبل ان کی زیارت کی تھی۔اس وقت ناسازی طبع کے باعث سید صاحب صاحب فراش تھے، موصوف لکھتے ہیں:”ان کے چہرے کی نورانیت جاذبیت اور روشنی ایسی ناقابل فراموش تھی کہ میں برابر ان کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔“ (8) سید صاحب سراپا وقار اور مجسم متانت تھے، ضبط وتحمل اور صبر وشکر ان کی شخصیت کے نمایاں ترین جوہر تھے۔کم آمیزی، عافیت جوئی اور سنجیدگی ان کی طینت تھی، سید صاحب کی کم سخنی اور خاموش طبعی کے باعث بچپن میں ان کے اساتذہ ان کو غبی اور کند ذہن سمجھتے تھے

اوران کے تیز زبان ساتھیوں کو ذہین اور صاحب ذوق سمجھ کران کی طرف نسبتاً زیادہ اعتنا کرتے تھے۔

علمی و ادبی خدمات: جب 1905ء میں علامہ شبلی ندوہ کے معتمد تعلیم ہو کر لکھنو آئے تو اپنی جوہر شناسی سے اس جوہر قابل کو تاڑ لیا اور سید صاحب کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا۔ مولانا شبلی کے ظل تربیت میں انھیں مضمون نگاری کا ذوق پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں سید صاحب نے عربی میں بھی مضمون نگاری شروع کر دی اور عبداللہ عمادی کے عربی رسالہ (البیان) لکھنو اور مصر کے شہرہ آفاق عربی اخبار (المنار) میں ان کے بعض عربی مضامین شائع ہوئے۔ 1907ء میں ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاہ عام کلب لکھنو میں منعقد ہوا۔ اس میں سید صاحب نے پہلے اردو میں تقریر کی اور پھر سامعین کی فرمائش پر عربی میں برجستہ تقریر کی۔ خواجہ غلام الثقلین نے یہ سمجھ کر کہ ممکن ہے یہ تقریر پہلے سے تیار کر کے لائے ہوں ایک بروقت موضوع (ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہو) دیا، سید صاحب نے بغیر کسی توقف کے نہایت فصیح و صحیح عربی میں تقریر کی، علامہ شبلی نے غایت مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر اپنے شاگرد کے سر پر باندھ دیا۔

علامہ شبلی نے 1906ء میں رسالہ (الندوہ) کی سب ایڈیٹری ان کے سپرد کر دی اور سید صاحب نے اس رسالہ میں متعدد علمی و تحقیقی موضوعات پر مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون ہونے کا ثبوت دیا۔ جب 1910ء میں شبلی نے سیرت النبی کی تدوین و ترتیب کا ایک شعبہ قائم کیا تو سید صاحب اس کے لٹریری اسٹنٹ مقرر ہوئے اور اس کام میں انھوں نے استاد کی پوری مدد کی۔

سید صاحب علامہ شبلی کے ندوہ سے مستعفی ہو جانے کے باعث وہاں سے دل برداشتہ ہو گئے تھے چنانچہ (الہلال) کے مشن اور دعوت کو اپنے خاص ذوق و رجحان کے مطابق پا کر وہ مئی 1913ء میں اس کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے (9)۔ ہفت روزہ الہلال مختلف حیثیتوں سے اردو صحافت میں نایاب تھا۔ لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار ممکن نہیں کہ (الہلال) کو بدر کامل بنانے میں سید صاحب کا بڑا اور نمایاں حصہ رہا ہے، کیونکہ سید صاحب کے (الہلال) کے ادارہ تحریر میں شرکت کا زمانہ اصلا (الہلال) کا عہد زریں تھا۔ (الہلال) کی امتیازی خصوصیت مولانا آزاد کے طرز تحریر کی بداہت، نئی زبان اور علوم اسلامی پر ان کی گہری نظر کی وجہ سے تھی۔ جواہر لعل نہرو نے بھی (الہلال) کی نئی زبان پر خاص زور دیا ہے مگر افسوس چند ہی ماہ میں سید صاحب مولانا آزاد کے عادات و خصائل کی بعض بوالعجبیوں کے باعث (الہلال) سے علیٰحدہ ہو کر علامہ شبلی کے ایما پر پونا کالج میں فارسی کے استاد ہو کر چلے گئے۔

سید صاحب اپنے مشفق استاذ کی رحلت کے بعد پونا کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڑھ آئے اور مولانا مسعود علی ندوی کے انتظامی تعاون اور مولانا عبدالسلام ندوی کے علمی اشتراک سے 1915ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی جس کا خاکہ علامہ شبلی نے اپنی وفات سے پہلے تیار کیا تھا مگر وہ اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تھے۔

سید صاحب کے اصل جوہر ادب کی اس خاص صنف (صحافت) میں اس وقت چمکے جب انھوں نے

ماہنامہ "معارف" خود اپنی ذمہ داری پر خود مختار ہو کر نکالا۔ معارف کے اجرا کے بعد عرصۂ دراز تک اس کی ادارت کے جملہ فرائض سید صاحب بالکل تنہا انجام دیتے رہے۔ معارف دارالمصنفین کا ترجمان تھا۔ یوں تو معارف کے علمی و مذہبی مضامین بھی ادب و چاشنی سے خالی نہیں ہوتے تھے لیکن خالص ادبی و تنقیدی موضوعات اور اردو زبان کے مسائل پر بھی اس میں کثرت سے مضامین شائع ہوئے۔ سید صاحب نے معارف کے ادارتی صفحہ کا مستقل عنوان "شذرات" رکھا تھا، اس کے تحت ہر ماہ مدیر کے قلم سے مختلف النوع وقتی امور و مسائل پر تبصرہ ہوتا تھا۔ معارف کے شذرات سلیمانی خاصے کی چیز ہیں۔

شاعری: سید صاحب کے رنگ سخن اور ذوق شعری کے تدریجی ارتقا کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور زمانہ طالب علمی اور مشق سخن پر مشتمل ہے۔ اس دور کو تربیتی دور کہا جا سکتا ہے جب سید صاحب لکھنوی رنگ تغزل کے دلدادہ اور امیر مینائی کے مرأۃ الغیب کے پرستار تھے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

دست نازک سے اٹھاتے ہیں وہ میت میری   بعد مرنے کے ٹھکانے لگی محنت میری
اڑا لیتے ہو دل تم عاشقوں کا باتوں باتوں میں   نیا انداز یہ سیکھا ہے تم نے دل اڑانے کا

دوسرا دور 1914ء سے شروع ہو کر مولانا اشرف علی تھانوی کی ارادت تک قائم رہا۔ اس میں ان کی شاعری محض گل و بلبل اور ہجر و وصال کی داستان نہیں رہ گئی بلکہ جذبات میں لطافت اور خیال میں معنویت اور گہرائی پیدا ہو گئی تھی۔ اشعار دیکھیں:

عجیب طرح کا ایک پیچ گفتگو میں ہے   وگرنہ مَیں میں وہی بات ہے جو تو میں ہے
ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں   وہ ایک قطرہ خوں جو رگ گلو میں ہے
حرف مطلب کہا نہیں جاتا   بے کہے بھی رہا نہیں جاتا
نگہ لطف سے نہ دیکھ مجھے   یہ ستم بھی سہا نہیں جاتا
عشق کی تازگی ہے آنسو سے   بے سبب یہ بہا نہیں جاتا
ہماری پاکبازی کی سند پر مہر ہوتی ہے   مجھے جب بوسہ لب سے کبھی وہ شاد کرتے ہیں

سید صاحب کی شاعری کے تیسرے اور آخری دور کا کلام کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے مستقل عنوان کا مستحق ہے۔ یہ تمام تر عارفانہ و متصوفانہ رنگ میں ہے۔ مثلاً

جو شعر بھی سپرد قلم کر رہا ہوں میں   سب واردات عشق رقم کر رہا ہوں میں
فیض ہے یہ کس ولی وقت کا   اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

اسلوب: سید صاحب نے اردو اسالیب بیان کی جن روایات اور ورثہ کی بنیاد پر اپنے انفرادی اسلوب کا محل تعمیر کیا اس کا باقاعدہ اور منظم آغاز تو سرسید کی ادبی تحریک سے شروع ہوتا ہے۔ سید صاحب کی نثر و انشا

اپنا انفرادی رنگ اختیار کرنے سے پہلے تشکیل ونشو ونما کے مختلف مراحل سے گزری۔ سید صاحب کبھی عبدالحلیم شرر کے جذبات انگیز اسلوب سے متاثر ہوئے، اور کبھی محمد حسین آزاد کی رعنائی بیان سے مسحور ہوئے، کبھی اپنے مربی واستاذ علامہ شبلی کے در پر رسائی کی اور کبھی ابوالکلام آزاد کے خطیبانہ اور پر جوش طرز تحریر کے اسیر ہوئے۔ سید صاحب کی نثر وانشا پر سب سے گہرے اور دیر پا اثرات علامہ شبلی کے طرز کے پڑے تھے۔ شبلی کی طرح ان کے یہاں بھی فارسی کی شگفتہ تراکیب کا استعمال خاصا ہے لیکن عربیت کی طرف میلان ومہارت خاص کے باعث ان کی تحریر کا عام رنگ شبلی سے کچھ مختلف ہوگیا ہے، تاہم شبلی کی محبوب ترکیبوں اور پسندیدہ الفاظ کی بہار ان کے یہاں بھی ملتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ سید سلیمان ندوی بنیادی طور پر علم وتحقیق کے شہباز تھے اور ان کے تخلیقی اکتسابات بیشتر تاریخ، سوانح اور اسلامیات کے محور پر گردش کرتے ہیں، لیکن ادب وتنقید کے گلستانوں کی آبیاری میں بھی ان کا حصہ خالص ادیبوں سے کم نہیں۔ صحافت، تنقید، شعر وادب، مکتوب نگاری اور اسلوب وانشا غرض ادب کی مختلف شاخیں ان کے قلم کی جولانیوں سے ثمر بار ہوئی ہیں۔ مختصراً یہ کہ اردو زبان وادب کے سرمایے میں ان کی تحریروں سے جو بیش قیمت اضافہ ہوا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ جب بیسویں صدی کے ربع ثانی کی ادبی تاریخ مدون کی جائیگی تو اس میں بلاشبہہ سید صاحب کی ادبی خدمات کا ذکر سنہرے حرفوں میں کیا جائے گا۔

حوالہ جات:

(1) سید نجم الہدی، نسب نامہ سادات وملوک دیسنہ، ص 2، معارف پریس، اعظم گڑھ، 1960ء

(2) شاہ معین الدین ندوی، حیات سلیمان، ص 85/ 603/ 29/ 03، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1973ء

(3) عبدالقدوس ہاشمی، یگانہ عصری صوفی (مضمون) ریاض، کراچی، سلیمان نمبر، ص 58

(4) حکیم عبدالحئی، نزہتہ الخواطر، ج 8، ص 163، دارالمعارف، حیدرآباد، 1970ء

(5) احمد سعید، بزم اشرف کے چراغ، ص 77، الاشرف مطبوعات، لاہور، 1975ء

(6) سید ابو عاصم، علالت سے وفات تک (مضمون) معارف، سلیمان نمبر، ص 302

(7) سید ابوالحسن علی ندوی، پرانے چراغ، حصہ اول، ص 21، مکتبہ فردوس، لکھنو، 1975ء

(8) ضیاء الدین برنی، عظمت رفتہ، ص 356، تعلیمی مراکز، کراچی، 1961ء

(9) ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، ابوالکلام آزاد فکر وفن، ص 147، نسیم بک ڈپو، لکھنو، 1969ء

☆☆☆☆☆

Farhan Ahmad
Research Scholar Dept. of Arabic,
B.H.U. Varanasi-221005,
Mob. 08896172363,
E-Mail: royalrd2017@gmail.com

شاعر آرزو: الیاس فرحات
(مہجری ادب کے حوالے سے)

ارشد جمال

علوم وفنون، زبان وادب، تہذیب وتمدن اور ادبا وشعرا کی مہاجرت کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس ہجرت کے پس پردہ کبھی تو ان کی ترویج وترقی مقصود تھی تو کبھی تحفظ مطمح نظر تھا، کبھی ادبا وشعرا کی معاشی بدحالی پیش نظر تھی تو کبھی ملکی سیاست واقتصادی ابتری متقاضی تھی کہ ہجرت اختیار کی جائے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں عربی شعرا وادبا بالخصوص شامی ولبنانی اصحاب قلم وقرطاس نے جنوبی وشمالی امریکہ کی طرف مہاجرت اختیار کی۔ اس کے اسباب مذکورہ بالا سطور میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ دونوں منطقوں کی طرف ہجرت کرنے والوں نے علیحدہ علیحدہ میدان علم وادب اپنایا جو ان کی موزونی طبع کے عکاس ہیں۔ چنانچہ جنوبی امریکہ ہجرت کرنے والے صاحبان علوم وفنون نے صنف نظم کو اپنی جولانگاہ بنایا۔ ان کی نظموں میں قومی، وجدانی اور دیو مالائی نظریات حاوی ہیں۔ انھیں مہاجرین امریکہ میں ایک معروف نام الیاس فرحاتؔ کا ہے۔

شاعر مہجر الیاس فرحاتؔ اصل میں لبنانی تھے۔ آپ کی پیدائش ''کفرشیما'' نامی گاؤں میں ۱۸۹۳ء کو ہوئی۔ عام رواج کے مطابق تعلیمی سلسلے کا آغاز گاؤں کے مدرسے سے ہوا۔ الیاس فرحاتؔ نے کچھ دنوں بعد اسے ترک کر کے ''شویفات'' کے مدرسہ میں داخلہ لے لیا، تاکہ اپنی علمی پیاس بجھا سکیں لیکن الیاس فرحاتؔ کی تلون مزاجی نے وہاں بھی مروجہ تعلیم کی تکمیل میں رخنہ اندازی کی۔ اس کے بعد ''وادی شحرور'' کے ایک مدرسے میں قدم رکھا، لیکن فطرت نے وہاں بھی ان کی مدد نہیں کی اور تعلیمی سلسلہ بالکلیہ موقوف ہوگیا اور وقت نے شاعر کو میدان حیات میں پہنچا دیا۔ اس درسگاہ حیات کے اندر تجربات وحوادث نے الیاسؔ کے شاعرانہ شعور کو جلا بخشی تو شخصیت کو کندن بنایا اور وقت تو سب سے بڑا استاد ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی ماہ وسال ترکی سلطنت کے لیے بڑے صبر آزما تھے۔ سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی اور تہذیبی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہو چکا تھا۔ چونکہ لبنان اس وقت ترکی سلطنت کا ایک عضو تھا لہٰذا وہ بھی اس ابتری کے حالات سے مبرا نہ رہ سکا۔ ترکی ولبنان ایک بہتر اور خوشگوار زندگی کے خواہاں تھے اس لیے حساس فطرت اشخاص نے کشمکش آلام سے رستگاری اور آذوقہ حیات کی بازیابی کے لیے وطن مالوف کو خیرباد کہنا شروع کر دیا۔

ادبا و شعرا سماج کے ترجمان اور بہت حساس فطرت کے مالک ہوتے ہیں۔ ملک میں کسی بھی قسم کی ہونے والی تبدیلی سے وہ زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے الیاس فرحاتؔ نے بھی ان حالات سے متاثر ہو کر ۱۹۱۰ء میں مہاجرت اختیار کر لی اور جنوبی امریکہ کے شہر برازیل کو اپنا مستقر بنا لیا۔

ہجرت کر کے نئی زمین، نئے لوگ، نئے سماج، نئے تہذیب و تمدن اور نئے زبان و ادب کے درمیان الیاس فرحاتؔ کو سخت جد و جہد کرنی پڑی اور کشاکش و تلخی کا سامنا کرنا پڑا جس نے الیاس فرحاتؔ کے شاعرانہ شعور کو مزید بیدار کیا اور ان کے وجدان کو بھی مہمیز کیا۔ ان آلام روزگار نے الیاس فرحاتؔ کی شاعری کو نئے عربی ادب میں پرسوز نغمے کا سرچشمہ بنا دیا۔ چنانچہ شاعر نے اپنے المی احساسات کو ہندوستان کے مشہور شاعر ساحر لدھیانویؔ کی طرح تجربات و حوادث کی شکل میں ''حیات مشتقات'' کے نام سے لوٹا دیا۔

حیات مستعار کی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچانے اور طلب معاش میں الیاس فرحاتؔ نے جو سخت اور جانگسل حالات برداشت کیے وہ سخت چٹان سے قطرہ آب اور ریت سے تیل نچوڑنے کے مترادف تھے۔ کہیں شاعر کو باد صرصر سے مقابلہ کرنا پڑا تو کہیں ریگزاروں کو قطع کرنا پڑا، کہیں Over Loaded سواریوں سے سفر کرنا پڑا تو کہیں Over Crowded مقامات سے گزرنا پڑا۔ کبھی بے سائباں جھونپڑیوں میں شب گذارنی پڑی تو کبھی کھلے آسمان میں اختر شماری۔ الیاس فرحاتؔ ان مصائب سے متاثر ضرور ہوئے مگر گھبرا کر صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ نتیجتاً یہی احوال و مناظر ان کی شاعری کے تشکیلی عناصر کی صورت اختیار کر گئے جنھوں نے الیاس فرحاتؔ کو عظمت عطا کی اور ان کی شاعری کو سند اعتبار بخشا۔

ادبی دنیا میں 1916-1910ء کا عرصہ الیاس فرحاتؔ کے لیے ایسا وقفہ تھا جس میں شاعر ایک نو زائیدہ پودے کی طرح نظر آتا ہے جو ہواؤں کے جھونکوں سے لچک تو جاتا ہے مگر ٹوٹتا نہیں۔ لیکن 1916ء کے بعد الیاس فرحاتؔ میدان شعر و ادب میں ایک قد آور درخت کی مانند نظر آتے ہیں جس کی اصل ثابت، شاخیں بلند اور بار آور ہیں۔

مہجر کی علمی و ادبی فضا نے الیاس فرحاتؔ پر بہت مفید اور عمدہ اثر مرتب کیا۔ برازیل کے شعرا و ادبا اور اہل علم سے اکتساب فیض کیا اور کم علمی کا جو بدنما داغ ان کے دامن پر لگا تھا اسے زائل کیا۔ اس اکتساب فیوض و برکات کے زیر اثر فرحاتؔ کا شعری اسلوب پختہ، بیان شستہ، ترکیب چست اور قافیہ درست ہو گیا نیز وہ الیاس فرحاتؔ جو چند سال قبل علم عروض، صرف و نحو، معانی و بیان اور صنائع و بدائع سے قطعاً ناواقف تھا اب ماہر علوم و فنون ہونے کے ساتھ دور حاضر کے بلند پایہ شعرا میں شمار کیا جانے لگا اور ادبی دنیا کی ایک عظیم شخصیت کے طور پر متعارف ہوا۔

شعر و ادب میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ الیاس فرحاتؔ نے میدان صحافت میں بھی اشہب قلم کی جولانی دکھائی اور توفیق ضعون کے ساتھ مل کر ''الجدید'' نامی ایک رسالہ جاری کیا۔ توفیق ضعون بھی اپنے

وقت کے مشہور ناقد و ادیب تھے۔ ''الجدید'' کا پہلا شمارہ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا۔ لبنانی مہاجرین جنوبی امریکہ کے اندر صنعت و تجارت میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے تعلیم و تعلم، علوم و فنون اور ادب و صحافت میں بھی دسترس حاصل کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ الیاس فرحاتؔ نے ''الجدید'' سے علیحدگی اختیار کر کے خود ایک رسالہ ''الدلیل'' کے نام سے شائع کر دیا۔

جب ہم الیاس فرحاتؔ کی شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام جہاں ایک مشہور شاعر متنبی کے حکیمانہ کلام سے مماثل نظر آتا ہے تو دوسری طرف زہیر بن سلمی کے کلام کی طرح حشو و زوائد سے پاک نظر آتا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا کہ تلخی حالات اور آلام روزگار سے الیاس فرحاتؔ کو طویل مدت تک نبرد آزما ہونا پڑا لیکن ایسے حالات میں بھی الیاس فرحاتؔ مردانہ وار میدان شعر و ادب میں برابر منزل کی طرف رواں دواں تھے اور ان کے قلم سے مسلسل شیریں و لطیف اور جانگداز اشعار کا سیل رواں جاری رہا۔ Saopaolo نامی مقام سے ۱۹۳۲ء میں ان کا دیوان شائع ہوا۔ اس میں بزعم شاعر کوئی غیر معیاری کلام شامل نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ اس دیوان میں شامل سارے قصائد سوز حیات سے مملو ہیں۔ انھیں قصائد میں سے ایک قصیدہ ''خصلۃ الشعر'' (بالوں کی لٹ) کے عنوان سے ہے۔ ''خصلۃ الشعر'' کو عرب نوجوانوں نے اپنی محبت کا ترانہ اور اظہار محبت کے لیے ایک موثر ذریعے کے طور پر قبول کر کے اسے جاودانی عطا کر دی۔

رسالہ ''الشرق'' میں الیاس فرحاتؔ کا ایک قصیدہ شائع ہوا جس میں شاعر نے اپنی زندگانی، نوجوانی اور آرزوؤں کا تذکرہ بہت ہی انوکھے انداز میں کیا ہے:

میری جوانی کا پرندہ ہاتھوں سے اڑ گیا مگر میری روح میں شعلۂ سوزاں چھوڑ گیا۔

اس نے مدت دراز تک میرے دل میں نغمے پیدا کیے جنھیں میں رات کی تاریکی میں گنگناتا تھا اور یہ نغمے اپنی مثال آپ تھے۔

جب سے جوانی کے باغ کے تر و تازہ پھول مرجھا گئے میری ساری تتلیاں اڑ گئیں اور مجھے تنہا چھوڑ گئیں۔

اے میری آرزوؤں کی تتلیو! لوٹ آؤ اور اس یاس زدہ انسان کو سکون بھری زندگی لوٹا دو۔

مذکورہ اشعار میں شاعر نے بڑی حسرت کے ساتھ اپنے احساسات و جذبات اور آرزوؤں کو بیان کیا ہے۔ اس کے سب سے مشہور و مقبول قصیدے کا تذکرہ اور اس کے چند منتخب اشعار کا بیان ضروری ہے ورنہ یہ مضمون

ناقص رہ جائے گا۔

بالوں کی وہ لٹ جو تو نے مجھے اس وقت (تحفے) میں دی تھی جب کہ جدائی نے مجھے کوچ کے لیے پکارا تھا۔

محبت کا معبد منہدم اور زمین بوس ہو گیا اور آنکھوں کے لیے وفا کے ویرانے چھوڑ گیا۔

جان من! یہ بالوں کی لٹ کیا ہے؟ یہ دو دلوں کو جوڑنے کا ذریعہ تھا جسے تیرے ہاتھوں نے توڑ ڈالا۔ حالانکہ میرا ہاتھ اسے رسوا کرنے سے گریزاں تھا۔

غم میرے سینے میں دل کو پگھلاتا ہے اور میں ہر طرح کا عذاب برداشت کرتا ہوں، یہ معاملۂ عشق ہے۔

جب مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ وقت موت قریب آگیا ہے تو خود کو مٹی (قبر) میں اتارے جانے کا تصور کرنے لگتا ہوں۔

تو بالوں کی اس لٹ کو ایک بار سونگھ لینا اور اس کا ایک بوسہ لے لینا جہنم جیسی سوزش کو بجھا دیتا ہے۔

کتابیات:

۱۔تاریخ الادب العربی فی العصر الحاضر مصنف ابراہیم علی ابوالخشب، القاہرہ، ۱۹۷۸ء
۲۔الشعر العربی فی المھجر مصنف احسان عباس، بیروت، ۱۹۵۵ء
۳۔دراسات نقدیۃ فی الادب المعاصر مصنف احمد زلط، القاہرہ، ۱۹۹۳ء
۴۔شعر المھجر مصنف جورج صیدح، بیروت، ۱۹۵۷ء
۵۔ادبنا وادباؤنا فی المھاجر الامریکیۃ مصنف جورج صیدح، بیروت، ۱۹۵۷ء
۶۔الادب العربی فی المھجر مصنف حسن بار، الدوحۃ، ۱۹۸۵ء
۷۔ادب المھجر مصنف صابر عبدائم، القاہرہ، ۱۹۹۳ء
۸۔شعر المھجر مصنف عیسی الناموری، القاہرہ، ۱۹۷۷ء

☆☆☆☆☆

Arshad Jamal
Research Scholar Dept. of Persian,
B.H.U. Varanasi -221005, Mob. 9918713230,
E-Mail: jamal.arshad229@gmail.com

عربی زبان میں مختلف علوم کے تراجم کا رجحان

محمد عدنان

عربی زبان کرہ ارض پر پڑھی، لکھی اور بولی جانے والی ایک منفرد زبان ہے، جسے حیات جاودانی حاصل ہے۔ تغیر وتبدل کی لہریں اس کو متاثر کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ عربی زبان محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ یہ بین الاقوامی روابط کا موثر ترین ذریعہ، اسلامی علوم وفنون کا خزینہ اور جدید عصری علوم کا ایک اہم ترین آلہ بھی ہے۔ یہ دنیا کے چھوٹے بڑے کم وبیش بیس ملکوں کی قومی اور سرکاری زبان ہے، جن میں سعودی عرب، مصر، شام، عراق، اردن، یمن، بحرین، لیبیا، مراکش، کویت، سوڈان، تیونس، عمان، فلسطین اور الجزائر سر فہرست ہیں جب کہ تمام عالم اسلام کی مذہبی زبان ہے۔ ان ملکوں میں یہودی، عیسائی، قبطی اور دوسری غیر مسلم قومیں بھی ہیں جن کی مادری زبان عربی ہے اور انھیں اس پر فخر بھی ہے۔ عربی زبان فصاحت وبلاغت، ایجاز واختصار میں اپنی مثال آپ ہے۔ بیشتر اہل علم ودانش نے اسے اس میدان میں اول سمجھا ہے۔ ڈاکٹر محمد احمد الغرب لکھتے ہیں:

> ”عربی زبان تاریخ سے قبل عصر جاہلی میں ظہور اسلام (۶۲۲ء) تک اپنے عروج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ تاریخی اعتبار سے اس کی بنیاد کے انتہائی قدیم ہونے پر ٹھوس دلیل ہے کیوں کہ ظہور اسلام کے بعد ایک قلیل مدت میں اس قسم کی بے مثال ترقی ممکن نہیں۔ (بحوالہ عہد مامون کی طبی وفلسفیانہ کتب کے تراجم، صفحہ نمبر ۱۰۳)“

جہاں تک عربی زبان کا مختلف علوم سے تعلق اور اس میں مختلف علوم کے ترجمے کی بات ہے تو اس کی تاریخ بھی بہت ہی تابناک ہے۔ مختلف علوم کے تراجم کے سلسلے میں عرب قوم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دوسری زبانوں کے علوم اپنی زبان میں منتقل کرکے اپنی زبان کو ثروت مند اور مالامال کیا۔ عربی میں ترجمے کا کام اکثر وبیشتر تین زبانوں سے ہوا۔ سریانی، یونانی اور فارسی۔ ان تینوں زبانوں میں سریانی زبان چونکہ عربی سے بہت قریب تھی، سریانی آرامی لہجے سے نکلی ہوئی تھی اور آرامی کا تعلق سامی سے تھا جو کہ عربی کے ساتھ بھی تھا، اور اس کے علما بھی بکثرت موجود تھے جن کے ذریعہ اس زبان کو علوم کے منتقل کرنے کے لیے زیادہ استعمال کیا گیا۔

جوں جوں عربوں میں علمی بیداری پیدا ہوتی گئی وہ تعلیم وتعلم کے سلسلے میں کچھ کر گزرنے کا جوش لے کر آگے بڑھتے گئے اور دینی ودنیاوی ہر طرح کے علوم وفنون کے معلم بن کر دنیا کے سامنے جلوہ گر ہوئے۔ تو ابتدا میں قرآن وحدیث اور ان سے متعلق دیگر علوم کی طرف توجہ زیادہ تھی، پھر رفتہ رفتہ دنیا کے دیگر علوم کی طرف مائل ہوئے۔ اپنی زبان کو مختلف علوم کے ذخائر سے ترجمہ کی مدد سے ثروت مند بنایا۔ چنانچہ عہد اموی میں اس سمت

رجحانات بڑھے اور اس حکومت کے زیر سایہ اسے خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ دور اموی نے اس کو ایک تحریک کی شکل دی جو خوب پروان چڑھی۔ عربی قوم متحرک ہوئی اور علوم فارس، یونان اور ہند کا بیش بہا ذخیرہ اپنی علمی بصیرت سے عربی زبان میں منتقل کیا جس کی نظیر دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔

عہد اموی میں ترجمے کا آغاز خلافت حضرت معاویہ سے ہو چکا تھا اور اس کا اچھا خاصا ماحول بھی پیدا ہو چکا تھا۔ ۸۰ھ کے قریب خالد بن یزید کے ہاتھوں ترجمہ کا کام ہوا اور یہ کام عہد اسلامی کا ترجمہ کے سلسلے میں پہلا علمی کارنامہ تھا۔ اس دور میں بہت سے مترجمین آئے، جن میں اسکندریہ کے مترجمین کی تعداد قدرے زیادہ تھی۔ اہم مترجمین میں قابل ذکر ابن ثال، سالم بن عبدالرحمان، جبلہ بن سالم اور وہب بن منبہ ہیں۔

دور عباسی میں علوم کی منتقلی کا کام بڑی تیزی سے ہوا اور اس کی ابتدا عہد منصور (۱۳۶ھ مطابق ۷۵۴ء-۱۵۸ھ مطابق ۷۷۵ء) میں ہوئی۔ پھر ۱۹۸ھ مطابق ۸۱۳ء/ ۲۱۸ھ مطابق ۸۳۳ء دور مامون میں یہ سرگرمی اپنے عروج پر پہنچ گئی اور اس دور میں بے شمار علما و مترجمین پیدا ہوئے اور مامون کے دربار میں فلسفہ و نجوم کے ماہروں اور کتب حکمت کے مترجموں کا عظیم گروہ اکٹھا ہو گیا۔ قابل ذکر مترجمین میں حنین بن اسحق، قسطا بن لوقا، یوحنا بن ماسویہ، ابن البطریق، یعقوب کندی، یحیی بن عدی، محمد بن موسیٰ منجم، محمد بن موسیٰ خوارزمی، حجاج بن مطر اور جہش وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان ادوار میں تصنیف و تالیف کا عمل بھی کافی عروج پر رہا۔ ماہرین کے مطابق اس کی دو بڑی وجہیں تھیں جس کے باعث یہ عمل انجام پایا۔ اول یہ کہ علمائے کرام اور مصنفین و محققین کو عباسی حکمراں کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان کو اتنا مال و دولت سے نوازا جاتا تھا کہ انھیں ذریعہ معاش کی طرف سے بے فکری رہتی تھی۔ ترجمہ کرنے والوں کو ترجمہ کی ہوئی کتاب کے وزن کے برابر سونا یا چاندی دے کر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ عرب اس وقت کاغذ بنانے کے فن سے واقف ہو گئے تھے جس کو انھوں نے چینی قیدیوں سے سیکھا تھا، جو بنی امیہ کے دور میں سمرقند کی فتح کے دوران گرفتار کیے گئے تھے۔ اس سے پہلے کاغذ کا رواج نہیں تھا۔ عہد عباسی کے متعلق ایک بہت ہی معروف مورخ 'جرجی زیدان' کچھ یوں رقم طراز ہے:

''عہد عباسی اسلام کا وہ عہد زرّیں ہے جس میں مسلمانوں کی سلطنت، دولت، ثروت، تہذیب و تمدن اور سیاست و حکمرانی کے اعتبار سے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اس میں بیشتر اسلامی علوم نشو و نما پائے اور اہم داخلی علوم کو عربی میں منتقل کیا گیا''۔ (بحوالہ نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء، ص ۲۷، از عبدالرحمن الانباری)

عہد عباسی میں مسلمانوں نے اپنے علم و فن کو تو سیکھا ہی، ساتھ ہی دنیا کے دوسرے اہم علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔ یونانی، سریانی، سنسکرت اور فارسی کتابوں کے عربی میں بہ کثرت ترجمے کیے گئے۔ تاریخ عربی

زبان و ادب کے مشہور و معروف عالم 'احمد زیات' لکھتے ہیں:

''حکومت عباسیہ کا زمانہ اسلام کا وہ عہد زریں ہے جس میں مسلمان تہذیب و تمدن اور عمران و اقتدار کے لحاظ سے اس قدر بلند مقام پر پہنچ گئے تھے کہ اس سے قبل یا اس کے بعد پھر کبھی اس بلندی پر نہ پہنچ سکے۔ فنون اسلامیہ اس دور میں پھلے اور پھولے، آداب عربیہ نے نشو و نما پائی، غیر ملکی علوم کے ترجمہ کیے گئے، عقل عربی پک کر تیار ہوئی اور اس نے غور و فکر، بحث و تمحیص کے لیے ایک وسیع جولانگاہ پائی''۔ (تاریخ ادب عربی، احمد زیات، ص ۳۰۸)

عربی میں مختلف علوم کے تراجم زیادہ تر سریانی اور یونانی زبان سے ہوئے لیکن سنسکرت اور فارسی سے جو تراجم ہوئے ہیں وہ قدرے کم ہیں۔ فارسی سے ترجمہ کرنے والوں میں عبداللہ ابن المقفع، فضل بن نوبخت اور عمر بن فرخان طبری کے نام قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر کے تراجم میں کلیلۃ و دمنۃ، الادب الکبیر اور الادب الصغیر اور فضل کے تراجم میں کتاب المدخل اور کتاب الموالید اور عمر بن فرخان کے تراجم میں سے کتاب المحاسن، کتاب اتفاق الفلاسفۃ و اختلافھم فی الخطوط قابل ذکر ہیں۔

سنسکرت سے عربی زبان میں جو تراجم ہوئے ہیں وہ کم ہیں، ان میں جن مولفین کی کتابوں کے تراجم ہوئے ہیں ان میں شاناقؔ، کنکہؔ، منکہؔ، جودرؔ، صالح بن بہلہؔ ہندی کے نام معروف و مشہور ہیں۔ شاناق کی مشہور کتاب ''کتاب السموم'' ہے۔ ابو حاتم بلخی نے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کی دوسری کتابیں ''کتاب البیطرۃ اور کتاب النجوم'' ہیں۔

عربی میں ترجمہ کے رجحان کے ضمن میں خلیفہ منصور کا نام غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے جنھوں نے ترجمہ کی تحریک میں روح پھونکی۔ انھوں نے مترجمین کو اپنے پاس بلایا اور مختلف علوم کی کتابوں کا ترجمہ کروایا، جس میں طب کی مشہور کتاب ''کناش'' کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ پھر ہارون رشید کے دور میں ترجمہ کا کام اچھے پیمانے پر انجام دیا گیا۔ اس کے بعد مامون رشید کے دور میں یہ کام بام عروج پر پہنچ گیا۔ اس دور میں بڑے بڑے دانشوروں جیسے افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس اور اقلیدس و بطلیموس وغیرہ کی کتابوں کو جمع کر کے ان کا بہترین ترجمہ کروایا گیا۔ اس دور میں حکمت، فلسفہ، طب، ہندسہ، ریاضی، تاریخ و ادب کی کتابوں کے تراجم ہوئے۔

دوران تحریر راقم نے یہ محسوس کیا کہ عربی زبان میں مختلف علوم کے تراجم تو ہوئے جن میں فلکیات، ارضیات، کیمیا، حکمت وغیرہ کے تراجم ہیں لیکن ان میں جالینوس، بقراط، افلاطون اور ارسطو کی علم طب و فلسفہ کے متعلق کتابوں کے تراجم سرفہرست ہیں۔

خلاصہ یہ کہ عربی زبان میں مختلف علوم کے تراجم کا کام بہت اونچے پیمانے پر کیا گیا تھا۔ اس وقت کی عرب قوم بالخصوص حکومتی اداروں نے اپنے تئیں عربی قوم کو ترقیوں کی منزل پر فائز کرنے کے لیے وسیع پیمانے

پرغیر عربی جیسے سریانی ، یونانی ، فارسی، سنسکرت اور عبرانی زبانوں کے علوم کو عربی زبان میں منتقل کرایا اور اپنی زبان کو مختلف شعبہ ہائے علوم سے واقف کروایا، جس کا نتیجہ دنیا نے دیکھا کہ عرب علوم کی دوڑ میں کتنے بلند و بالا مقام پر فائز ہوئے اور انھوں نے مختلف علوم میں اپنی مہارت کا لوہا منوایا۔اس کے بعد دوسری قوموں بالخصوص یوروپ نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جس کے سبب یوروپی علمی نشاۃ الثانیۃ ہوئی جو دراصل عربی زبان میں موجود علوم وفنون کے تراجم کی رہین منت ہے۔

☆☆☆☆☆

کتابیات:

۱۔انسائکلو پیڈیا آف ٹرانسلیشن اسٹڈیز — مونا بیکر

۲۔الموسوعۃ للترجمۃ — ترجمہ۔محمد یحیا تین

۳۔اسلام دور جدید کا خالق — مولانا وحید الدین خاں

۴۔عہد مامون کی طبی و فلسفیانہ کتب کے تراجم — ڈاکٹر عشرت اللہ خاں

۵۔الفہرست ابن الندیم — محمد بن اسحاق ابن یعقوب الندیم

۶۔تاریخ ادب عربی — احمد زیات

☆☆☆☆☆

Mohd. Adnan
Research Scholar Dept. of
Translation Studies,
MANUU Hydrabad -500032

نقش ہائے رنگا رنگ

ٹنڈے خوشبو تیرے کبابوں کی

(طنز و مزاح)

محبوب حسن

لکھنو کے ''ٹنڈے کباب'' میں کباب اگر جسم ہے تو ٹنڈے اس کی روح۔ دونوں میں جسم و جاں کا رشتہ ہے۔لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح ''ٹنڈے کباب'' کے درمیان بھی ازلی رشتہ ہے۔ٹنڈے اور کباب کے رشتے پر ٹیڑھی نظر ڈالنا لکھنوی تہذیب کی شان میں عین گستاخی ہے۔''ٹنڈے کباب'' اپنی سیرت وصورت دونوں اعتبار سے قابل رشک ہے۔اس کے تقدس کی تفہیم کے لیے بصیرت اور بصارت درکار ہے۔ٹنڈے کباب کے دیدار محض سے سطح ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ٹنڈے کباب کے سامنے شیراز کے میخانے اور خیاّم کی رباعیاں بے اثر ہیں۔اس میں کوثر و تسنیم اور آب زمزم کی پاکی اور کوہِ قاف کا حسن موجود ہے۔

سرزمین لکھنو پر قدم رکھنا اگر فرض ہے، تو ''ٹنڈے کباب'' سے لطف اندوز ہونا سنت قرار پاتا ہے۔اسی لیے لکھنو آنے والا ہر خاص و عام ''ٹنڈے کباب'' کو سلام عقیدت پیش کرنا عین سعادت مندی تصور کرتا ہے۔اس سے محرومی پر فرشتے لعنت بھیجتے ہیں۔اہل لکھنو ''ٹنڈے کباب'' کو توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔ان کا عقیدہ ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' کی برکت سے گناہِ صغیرہ سوکھے ہوئے پتوں کی طرح جھڑ جائیں گے۔قبر کے عذاب میں بھی تھوڑی بہت رعایت ممکن ہے۔اس کی سماجی و تہذیبی اہمیت کا اندازہ اس شہرِ نشاط میں درپیش ایک واقعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ حسب وعدہ باراتیوں کی خاطر تواضع میں ''ٹنڈے کباب'' کا اہتمام نہ ہونے سے دولہے نے عین موقع پر نکاح سے انکار کر دیا۔قابل غور ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' سے خاکسار کا رشتہ روحانی نوعیت کا ہے۔میرا عقیدہ ہے کہ وصال عشق کی موت ہے۔اس لیے دل میں جب بھی ''ٹنڈے کباب'' کی تمنائیں جاگتی ہیں تو اس کا ورد شروع کر دیتا ہوں۔اس عمل بابرکت کی بنیاد پر ہی ''ٹنڈے کباب'' کی روحانی خوشبو سے دل و دماغ دونوں معطر ہو جاتے ہیں۔یعنی عشق میں اگر گرمی ہو تو ہجر میں بھی وصال کا لطف آتا ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ لکھنو میں ایک بزرگ نواب صاحب ہوا کرتے تھے۔ان کی بتیسی جھڑ چکی تھی لیکن حضرت کباب کے بہت شوقین تھے۔لہٰذا انھوں نے کبابیوں کے درمیان مقابلہ آرائی کا اعلان کیا۔شہر شہر سے کبابیے جوق در جوق شاہی دربار میں جمع ہوئے۔انواع واقسام کے کباب تیار کیے گئے۔دربار کی پوری فضا کباب کی خوشبو سے مہک اٹھی۔کبابیوں نے اپنے اپنے کباب ترتیب سے میز پر سجا دیے۔دربار کا سارا منظر کبابی

باز ار جیسا ہوگیا۔نواب نے باری باری سے سب کے کباب چکھے۔نواب کو حاجی متان علی کا گلاوٹی کباب بہ شکل شامی کباب بے حد پسند آیا۔حاجی متان علی کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔عزت افزائی کے بعد انھوں نے لکھنو میں کباب کی دکان کھول لی۔ان کے کباب کی شہرت جلد ہی دور دور تک پھیل گئی۔بہت سے کبابیوں نے ان کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے کیوں کہ ایک سو بارہ قسم کے مسالے کہاں سے لاتے؟ حاجی متان علی کو پتنگ بازی کا بھی شوق تھا۔بدقسمتی کہیے کہ ایک روز پتنگ اڑاتے ہوئے چھت سے نیچے آن پڑے اور ایک ہاتھ توڑ وا بیٹھے۔اس حادثے کے بعد حاجی متان علی ٹنڈے میاں اور ان کا کباب ''ٹنڈے کباب'' کے نام سے مشہور ہوا۔''ٹنڈے کباب'' کی زلف عنبریں کو سنوارنے میں ان کی کئی پشتیں گزر گئیں۔

ویسے تو لکھنوی ''ٹنڈے کباب'' کی شہرت سرحدوں میں قید نہیں۔اس کی لذت وخوشبو تو عرشِ معلی تک پہنچتی ہے۔لیکن آج کل اس کا چرچہ ملک کے ہر کوچہ و بازار میں ہے۔کیوں کہ لکھنوی ''ٹنڈے کباب'' ان دنوں طوفان کی زد میں ہے۔کم وبیش گزشتہ سو برسوں میں ''ٹنڈے کباب'' پہلی دفع فاقہ کشی کا شکار ہوا ہے۔یہ سچ ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' پر سیاسی گرہن لگا ہوا ہے۔ارے بھائی! گرہن تو چاند اور سورج کو بھی لگتا ہے۔دراصل زوال عروج کا مقدر ہے۔جب لکھنوی حکومت کا سورج ڈھل گیا تو ''ٹنڈے کباب'' کی کیا بساط؟ ملک کے مختلف حصوں سے ٹنڈے کباب کی تعزیت کی خبریں موصول ہو رہی ہیں۔خاص طور پر لکھنو میں تو صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔بعض صاحبان کا خیال ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' کے دم پر ہی لکھنوی تہذیب زندہ تھی۔لیکن اب چراغوں میں روشنی نہ رہی:

محفلیں اب کہاں نوابوں کی صحبتیں اب کہاں جنابوں کی
کھینچ لاتی ہے لکھنو ہم کو ٹنڈے خوشبو تیرے کبابوں کی

خدا ''ٹنڈے کباب'' کو ہر بلا سے محفوظ رکھے!!! ایسے مایوس کن حالات میں ''ٹنڈے کباب'' کے حق میں دعائیں ضروری ہیں۔''ٹنڈے کباب'' پر قہر نازل ہوتے ہی لکھنوی تہذیب کا آخری ستون بھی گر پڑا۔درحقیقت اس کے ذکر کے بغیر ادھوا اور اس کی تہذیبی تاریخ ادھوری ہے۔اس ستم ظریفی پر شہر کا ذرہ ذرہ اداس ہے۔امام باڑوں میں ماہِ محرم کی فضا طاری ہے۔لکھنو کا دسترخوان اجڑ سا گیا ہے۔عیش وعشرت اور عیش ونشاط کا یہ شہر سائیں سائیں کر رہا ہے۔یہاں کی رونقیں، چہل پہل، ریل پیل سب کچھ غائب ہیں۔

کبھی نخاس اور امین آباد کے علاقوں میں انسانوں کا جم غفیر موجود ہوتا تھا۔جہاں ہوائیں بھی مشکل سے گزر پاتی تھیں۔بدن سے بدن چھلتا تھا لیکن اب ہر طرف سناٹا ہی سناٹا۔جیسے گلیوں، بازاروں اور کوچوں میں بیوگی طاری ہو۔جیسے پورا شہر روٹھ گیا ہو۔جیسے چاند، سورج اور ستارے اپنی گردش بھول گئے ہوں۔کبھی لکھنو کی شامیں رومانی ہوا کرتی تھیں۔شب وصال کے سامنے شب فراق ڈھول چاٹتی پھرتی تھی۔مے خانوں سے زیادہ کباب خانوں میں رونق رہتی تھی لیکن اب ٹنڈے کباب کے فراق میں لکھنو کا حال کچھ یوں ہے۔بقول میرؔ:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

''ٹنڈے کباب'' کے ہجر میں اس کے عاشق بیمار بیمار سے نظر آتے ہیں۔اس سے بے پناہ چاہت و رغبت رکھنے والے دیوانوں کی نوک زباں پر صرف یہی نغمہ ہے کہ ''تیرا جانا ارمانوں کا لٹ جانا''۔اس شمع فروزاں کے ذکر کے سبب ان کی زبانیں گھس گئی ہیں۔ان کے ایمان میں بھی اب وہ گرمی باقی نہ رہی۔عاشقوں کے ساتھ ساتھ کبابیوں میں بھی غم واداسی کی لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔کبابیے ''ٹنڈے کباب'' کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے مرغ، انڈے اور سبزی کا سہارا لے رہے ہیں۔لیکن گوشتِ معظم کے بغیر ''ٹنڈے کباب'' کا وجود پارہ پارہ ہوگیا ہے۔

مذکورہ اشیا کے بنے ہوئے ٹنڈے میں وہ بات کہاں؟ نہ لطافت، نہ نزاکت، نہ لذت، نہ عظمت۔بس ایک رسم واجبی سی پوری ہو رہی ہے۔خدا معاف کرے! یہ تو ''ٹنڈے کباب'' کی شان میں سراسر گستاخی اور بے ادبی ہے۔دکانوں کے باہر ''ٹنڈے کباب'' کی جگہ ''مرغ کباب''، ''انڈے کباب'' اور ''سبزی کباب'' کی تختیاں لگائی گئی ہیں۔دراصل یہ تختیاں ''ٹنڈے کباب'' کی عظمت رفتہ کی داستان معلوم پڑتی ہیں۔لیکن اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ شاید کوئی نیا نسخہ ہاتھ لگ جائے۔

بعض دکانوں پر جلی حروف میں فیضؔ کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' چسپاں کی گئی ہے۔لیکن داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر دیکھ کر عاشقوں کو یک گونہ سکون میسر نہیں۔انھیں سفینۂ غم دل کے رک جانے کا شدت سے انتظار ہے۔جنون ومحبت اور نالہ وفریاد کی یہ شدت پتھر کو بھی پگھلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔قوی امید ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' پر چھائے ہوئے سیاسی بادل جلد ہی چھٹ جائیں گے۔کیوں کہ ''ٹنڈے کباب'' کے پروانوں کا یقین ہے کہ ''لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے''۔عرض کرتا چلوں کہ گزشتہ جمعرات کی شب اکبری گیٹ پر ''کبابی مشاعرہ'' کے نام سے ایک شاندار شعری نشست کا انعقاد ہوا۔اس تقریب میں سرزمین لکھنو کے نامی گرامی شاعروشاعرات جمع ہوئے۔مشاعرے کا ہجوم ایسا کہ سامعین کو مجبوراً امام باڑے کی چھت پر چڑھنا پڑا۔لوگ مکھیوں کی طرح ایک دوسرے سے چپک چپک کر بیٹھے تھے۔دراصل یہ ہجوم ''ٹنڈے کباب'' کی شان وعظمت کی گواہی دے رہا تھا۔

کسی نے ''ٹنڈے کباب'' کی شان وعظمت میں قصیدے پڑھے تو کسی نے اس کی خستہ حالی کا مرثیہ سنایا۔مخمل بربادیؔ نامی ایک شاعر نے شہر آشوب کے پردے میں لکھنو کے تہذیبی زوال کی داستان پیش کی۔انصاف کی بات ہے کہ اردو داں حضرات کو ''ٹنڈے کباب کے عصری مسائل'' کے موضوع پر آناً فاناً ایک کل ہند سیمینار منعقد کرنا چاہیے۔کیوں کہ اردو کے بیشتر کلاسیکی شعرا نے کباب، شراب اور شباب کے سہارے ہی اپنا شعری لقمہ توڑا ہے۔

قابل ذکر ہے کہ میرؔ جیسے عظیم المرتبت شاعر نے بھی اپنی ایک مشہور غزل کی بنیاد کباب، شراب، شباب، حجاب، اضطراب اور خراب جیسے قوافی پر رکھی ہے۔ اس غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو ”داغ رہنا دل و جگر کا دیکھ/ جلتے ہیں اس طرح کباب کہاں“ یعنی وہ کباب کے بغیر اپنے دل و جگر کی سوزش وجلن سے پردہ اٹھانے میں قاصر ہیں۔ بہرحال مشاعرے میں ”ٹنڈے کباب زندہ باد“ کے فلک شگاف نعرے بھی لگائے گئے۔ اس شعری محفل کی تکمیل میں پوری شب گزر گئی۔ فجر کی اذان ہوتے ہی ناظم مشاعرہ نے فیض کے اس شعر کے ساتھ سامعین کو خدا حافظ کہا کہ:

تم آئے ہو، نہ شب انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

قابل ذکر ہے کہ مٹن تکہ، چکن تکہ، مٹن بریانی، چکن بریانی، مٹن قورمہ، چکن قورمہ جیسی مرغن غذائیں ”ٹنڈے کباب“ کے خلا کو پر کرنے میں ناکام ہیں۔ لیکن اس قدر ہائے توبہ مچانا جائز نہیں۔ اپنے اندر صبر ایوبی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ خدا کی نافرمانی پر تو حضرت آدم بھی جنت سے نکالے گئے تھے۔ ”ٹنڈے کباب“ کی حالت زار دیکھ کر ”حیدرآبادی پایہ“ اور ”مرادآبادی بریانی“ بھی خوف زدہ ہیں۔ انھیں فکر ہے کہ جانے کب سیاست کی برچھیاں ان کے سینے میں بھی اتار دی جائیں۔

ظاہر ہے کہ ”حیدرآبادی پایہ“ اور ”مرادآبادی بریانی“ کی شہرت تحت الثریٰ تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان میں ارض وسما کی ساری وسعتیں سمائی ہوئی ہیں۔ توجہ طلب ہے کہ پرانی دہلی کے معروف حکیم ہمدرد صاحب نزلہ اور پرانی کھانسی جیسی جاں گداز بیماریوں سے نجات کے لیے حیدرآبادی پایہ تجویز کرتے تھے۔ تحقیق طلب نکتہ ہے کہ ”ٹنڈے کباب“ کسی بیماری کی دوا ہے کہ نہیں لیکن یہ تو جگ ظاہر ہے کہ اس کے ہجر وفراق میں عاشقوں کی ایک بڑی جماعت بیمار ضرور ہوگئی ہے۔ اب تو بس یہی التجا ہے کہ:

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

☆☆☆☆☆

Dr. Mahboob Hasan
Dept. of Urdu JNU New Delhi -67,
Mob. 8527818385,
E-Mail: mahboobafaqi@gmail.com

عرشؔ ملسیانی (1979-1909ء)

امام الشہدا

حق بات پہ اڑتے ہیں تو لڑتے ہیں قضا سے
رکھتے ہیں عقیدت جو امام الشہداؑ سے
کس طور سے ہوتا ہے کوئی فخرِ دو عالم
پوچھے کوئی مظلومی اربابِ وفا سے
اب تک ہیں زمانے کے لیے زندگی آموز
حیدرؑ کے جگر بند محمد کے نواسے
شبیر کے صدقے میں لٹادوں اسے فوراً
ہو دولتِ کونین بھی حاصل جو خدا سے
ہر دامن اولاد نبی تک ہے رسائی
یہ فیض میسّر ہے مجھے دستِ دعا سے
شبیریت اس دور میں بھی شانِ بشر ہے
پوچھے کوئی گاندھی سے پرستار وفا سے
اس دورِ یزیدی میں بھی جو سینہ سپر ہیں
اللہ بچائے انھیں آفت سے، بلا سے
گلزارِ حنا سے نہیں کم مرتبہ ہرگز
وہ خاک جو گلرنگ ہے خونِ شہدا سے
اے دل مجھے اس ارضِ مقدس ہی پہ لے چل
نسبت ہے بلندی میں جسے عرشِ علا سے
اس دور میں بھی تازہ ہیں گلہائے عقیدت
محفوظ ہیں شاید یہ زمانے کی ہوا سے

☆☆☆☆☆

قندِ مکرر

غزلیں از محمد حسیب مغمومؔ

سوانحی تعارف

نام: محمد حسیب
تخلص: مغمومؔ
والد: شیخ محمد شفیع
تاریخ پیدائش: 15 دسمبر 1931ء
آغازِ سخن: 1950ء
تلمیذِ سخن: حضرت نازش پرتاپ گڑھی

(1)

میں نے کھولی جو زباں حشر اٹھا ہے کیا کیا
چپ ہوا ہوں تو پھر افسانہ بنا ہے کیا کیا

میں سمندر تھا سکوں بانٹ رہا تھا سب کو
بس اسی بات پہ طوفان اٹھا ہے کیا کیا

کرب، محرومی، گھٹن، سوز ، جنوں، تنہائی
زندگی تجھ سے ملا ہے تو ملا ہے کیا کیا

لاکھ بے گانہ سہی خود سے مگر، دیوانہ
اپنی شوریدہ مزاجی پہ ہنسا ہے کیا کیا

مصلحت تیرا برا ہو کہ خود اپنے ہاتھوں
میرا سرمایۂ احساس لٹا ہے کیا کیا

دوستو! آؤ ذرا ہم بھی نظارہ کرلیں
شہر میں آگ لگی ہے تو بچا ہے کیا کیا

مجھ کو معلوم ہے اس عہد ریا کاری میں
آگہی نے بھی مجھے زہر دیا ہے کیا کیا

دشمنوں سے بھی نہ شکوہ کیا جس نے مغمومؔ
اپنی ہی ذات سے اب اس کو گلا ہے کیا کیا

(2)

حادثے یوں تو ہماری راہ میں آئے بہت
لیکن اے مغموم ہم سے مل کے پچھتائے بہت

کچھ نہ ہاتھ آیا کسی کے بھی، سوائے زخم سر
دوست دشمن سب انا سے میری ٹکرائے بہت

کیسے بے تحقیق کہہ دوں گو حقیقت ہی سہی
دوستوں نے میرے اوپر تیر برسائے بہت

ان کی یادوں کے اجالے بھی سمٹ کر رہ گئے
روشنی کے شہر میں ہم جاکے پچھتائے بہت

یہ الگ ہے بات کہ میں ہی تہی دامن، مگر
میری پلکوں نے گہر اشکوں کے برسائے بہت

قتل گاہ عاشقاں مغمومؔ سونی دیکھ کر
ہم خود اپنے آپ کو رہ رہ کے یاد آئے بہت

(3)

خلوص عشق و وفا کے رستے میں ایک ایسا مقام بھی ہے
جہاں اجل پوچھتی ہے سب سے حیات کس سمت بٹ رہی ہے
یہ کس کی یادوں کا بانکپن ہے مرے خیالوں کی انجمن میں
کہ جس کی سانسوں کی بھینی خوشبو سے موت کی نیند اچٹ رہی ہے
تمھاری بزم طرب سے لے کر ہماری مجبوریوں کی حد تک
وہ فاصلہ ہے کہ جس پہ عمر تباہ قسطوں میں کٹ رہی ہے
یہ بات الگ ہے کہ نور عارض کو ہم ترستے رہے ہیں لیکن
فسانہ زندگی کا عنواں تمھاری زلفوں کی لٹ رہی ہے

(4)

مجھے اس کے جلوؤں کی جستجو تجھے اس کے در کی تلاش ہے
یہ بشر بشر کا ہے حوصلہ یہ نظر نظر کی تلاش ہے
نہ ہے فکر جادہ و راہبر نہ تو ہم سفر کی تلاش ہے
جو فروغ منزل نو بنے مجھے اس نظر کی تلاش ہے
جو خود اعتماد ہیں دوستو! وہ قریب منزل دوست ہیں
وہ بھٹک رہے ہیں ادھر اُدھر جنھیں راہبر کی تلاش ہے
کبھی دل سے دور نہ ہوسکی یہ کشاکش غم جستجو
درِ یار تک جو پہنچ گیا تو پھر اپنے سر کی تلاش ہے
نہ غرض فریب نشاط سے نہ مسرتوں کی حیات سے
یہ جو غم ہے حاصل زندگی یہی عمر بھر کی تلاش ہے

(5)

میرا ضمیر، میری انا آزمائے ہے
اب مجھ کو میری لغزش پا آزمائے ہے

جیسے تپا کے آگ میں سونا پرکھتے ہیں
کچھ یوں ہی مجھ کو میرا خدا آزمائے ہے

غالبؔ کا عہد ہو کہ وہ نازشؔ کا دور ہو
انسان کو حیات سدا آزمائے ہے

کیا وقت آپڑا ہے کہ مغمومؔ ان دنوں
خون جگر کو رنگ حنا آزمائے ہے

☆☆☆☆☆

تعارف وتبصرہ

نام کتاب: مجلہ ادراک (10)

مدیر/مرتب: سید حسن عباس

صفحات: 336

قیمت: فی شمارہ 300 روپے/ سالانہ 500 روپے

مقام اشاعت: مرکز تحقیقات اردو و فارسی، گوپال پور، سیوان (بہار)

تبصرہ نگار: فیضان حیدر (معروفی)

مجلہ ادراک اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے علمی و ادبی حلقوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مدیر اعزازی پروفیسر سید حسن عباس اپنی علمی، ادبی اور تحقیقی مشغولیتوں کی وجہ سے اردو اور فارسی کی ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ موصوف کی مختلف موضوعات پر اردو اور فارسی میں درجنوں کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

ان کی ادارت میں شائع ہونے والے تحقیقی جریدے ادراک کا دسواں شمارہ راقم کے پیش نظر ہے۔ اس کے مشمولات بھی گزشتہ شماروں کی طرح ادبی شان کے حامل ہیں۔ اس میں چھ عنوانات قائم کیے گئے ہیں مکتوبات، مخطوطہ و مخطوطہ شناسی، مقالات اردو و فارسی، طنز و مزاح، یاد رفتگاں اور غالبیات۔ ان عنوانات کے تحت تقریباً دو درجن تحقیقی و تنقیدی مضامین، پانچ علمی و ادبی شخصیات کے خطوط مختلف افراد کے نام اور غالب کی مشہور زمانہ مثنوی چراغ دیر کے دو منظوم تراجم شامل ہیں۔

چراغ دیر کے دونوں تراجم اپنی نوعیت کے منفرد ترجمے ہیں جن کے مترجمین بالترتیب افضل ٹکھمبوی اور امتیاز الدین خاں ہیں۔ اس مثنوی کے اگرچہ کئی منظوم ترجمے ہو چکے ہیں لیکن یہ دونوں ترجمے بھی اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور فکری و فنی خوبیوں پر کھرے اترتے ہیں۔

مدیر موصوف کا تعلق چونکہ مخطوطات سے ہمیشہ سے رہا ہے اس لیے انھوں نے اس کی اہمیت کے پیش نظر جریدے کا ایک معتد بہ حصہ مخطوطات سے مخصوص کیا ہے۔ مخطوطہ اور مخطوطہ شناسی کے تحت جریدے میں شامل خود موصوف کا مضمون بیاض نوحہ جات و دیگر نسخے اور اکبر حیدری کشمیری کا مضمون مخطوطہ دیوان خان شاگرد مصحفی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔

مقالات اردو و فارسی کے تحت کئی مضامین توجہ طلب ہیں جن میں مرزا عبدالقادر بیدل اور ایرانی نقاد از سید احسن الظفر، اردو اصناف ادب پر فارسی کے اثرات از صالحہ رشید، لطیفہ گوئی تعارف اور ارتقائی سفر از

شہاب الدین ثاقب، مولوی مہیش پرشاد اور مشاہیر اردو کے خطوط از عبد السمیع اور دبستان عشق کا آخری چراغ: مہذب لکھنوی از محضر رضا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ادراک کا یہ شمارہ اپنے اندر گوناگوں خوبیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ عنوانات کے تحت مضامین کی ترتیب مدیر کی علمی استعداد کے ساتھ ساتھ ان کی بہترین قوت انتخاب پر بھی دال ہے۔ یہ مجلہ مرکز تحقیقات اردو و فارسی، گوپال پور، سیوان (بہار) سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب: نشاط قلم

مصنف: ڈاکٹر شکیل احمد

صفحات: 320

قیمت: 240 روپے

مقام اشاعت: مئوناتھ بھنجن، مئو، یوپی 275101

سال اشاعت: 2016ء

تبصرہ نگار: فیضان حیدر (معروفی)

نشاط قلم ڈاکٹر شکیل احمد کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں سپرد قلم کیے گئے ہیں۔ موصوف کا شمار مشرقی اتر پردیش کے بہترین قلم کاروں، ناقدوں اور محققوں میں ہوتا ہے۔ موصوف کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی ابتدا سے 1947ء تک، مئو شہر ہنر وراں، سمٹتا سائباں، اور بادل چھاؤں علمی اور ادبی حلقوں میں خاصی مقبول ہوئیں۔

زیر نظر کتاب میں مضامین کی تعداد کل پینتیس ہے۔ اس میں دو عنوانات قائم کیے گئے ہیں مطالعۂ نظم اور مطالعۂ نثر۔ مطالعۂ نظم کے تحت کل اٹھارہ مضامین ہیں جو مختلف اصناف اور شخصیات سے متعلق ہیں۔ ان میں کچھ مضامین مشاہیر اردو کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ہیں جیسے میر کا استفہامیہ لہجہ، فانی بدایونی کی شاعری اور زندگانی اور عصر حاضر میں مسدس حالی کی معنویت وغیرہ اور کچھ مضامین ادب کے خاموش خدمت گزاروں جیسے سردار شفیق، مشتاق شبنم، شفیق اعظمی، فاخر جلال پوری اور رئیس الشاکری کی شخصیت اور شاعری پر مشتمل ہیں۔ اس حصے میں کبیر داس اور اردو شاعری اور اردو شاعری میں بارہ ماسہ سرسری جائزہ بھی اپنی انفرادیت اور گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے قارئین کی دلچسپی کی چیز ثابت ہوں گے۔

مطالعہ نثر کے تحت کل سترہ مضامین ہیں جو مختلف اصناف نثر داستان، ناول، افسانہ، سوانح، خاکہ، صحافت

اور سفرنامے سے متعلق ہیں۔ حصۂ نثر میں بھی موصوف نے مشاہیر کے ساتھ غیر مشہور افراد کی ادبی کاوشوں اور سرگرمیوں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ساتھ ہی بعض کتابوں مثلاً لکھنو کی پانچ راتیں، شہر میں کرفیو اور نشاط آبلہ پائی پر تبصرہ بھی موصوف کی تنقیدی بصیرت کے غماز ہیں۔

مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے شعوری طور پر شعرا اور ادبا کے ذہن و فکر، ماحول، سماج و معاشرہ اور سیرت و شخصیت کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی روشنی میں جو نتائج اخذ کیے ہیں انھیں بڑے سیدھے سادے انداز میں پیش کر دیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے خوبیوں کے ساتھ خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس سے ان کی سچی تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اس کے باوجود وہ کتاب کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

”مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تنقید و تجزیے کی دنیا میں کوئی رائے حرف آخر نہیں ہوتی، میں نے اس کتاب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ضروری نہیں ہے کہ اس سے ہر ادب شناس متفق ہو۔“

گویا ان کے نزدیک بھی تنقید و تجزیے کی راہ نہایت مشکل اور اس کا عمل دشوار اور صبر آزما ہے اور یہ کام کسی مادی لالچ کے بغیر ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ نقطۂ نظر انھیں ان ناقدین کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے جن کا طرۂ امتیاز نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ ہے۔ خدا ان کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے تاکہ وہ علم و ادب کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں اور تشنگان علوم ان کی نگارشات سے مستفیض ہوتے رہیں۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب: غبار صدا
شاعر: سردار شفیق
صفحات: 224
قیمت: 175 روپے
مقام اشاعت: سردار پبلی کیشن، مئوناتھ بھنجن، مئو، یوپی 275101
سال اشاعت: 2011ء
تبصرہ نگار: فیضان حیدر (معروفی)

غبار صدا سردار شفیق کی غزلوں کا انتخاب ہے جس میں سو سے زائد غزلیں ہیں۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ”تازہ ہوا“ کے نام سے 1993ء میں شائع ہوا جو علمی و ادبی حلقوں میں مشہور ہوا اور دوسرا مجموعہ ”غبار صدا“ کے

نام سے شائع ہوا۔ یہ دونوں نام ”غبار صدا“ میں شامل پہلی اور دوسری غزل کے بالترتیب چھٹے اور تیسرے شعر میں استعمال شدہ ترکیبوں سے ماخوذ ہیں۔

یہ بے دریچہ مکانوں میں بند ہیں کب سے — کسی کو ”تازہ ہوا“ دے کسی کو پانی دے
اندھیری رات کا سارا طلسم ٹوٹ گیا — تمام شہر ”غبار صدا“ سے روشن ہے

کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر حدیث انصاری کا ایک مختصر مضمون بعنوان دبستان مئو کا مقبول خاص و عام شاعر سردار شفیق بھی شامل ہے جو سردار شفیق کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں معاون ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے سردار شفیق کی غزلوں کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ رقمطراز ہیں:

”سردار شفیق صنف غزل کے تہذیبی مزاج سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ غزل ان کے تجربے کا اظہار اور دل کی واردات کی ترجمان ہے۔ ان کی غزل کا ضمیر یادوں کے جلتے ہوئے بسیرے سے اٹھا ہے۔ اس میں وقت کی شعلگی، واقعات کی کرب ناکی، انفرادی اور اجتماعی آپ بیتی کی دل گرفتہ کیفیت کے ساتھ سماجی بدنظمی کا عکس و آئینہ موجود ہے۔“ ص 5

سردار شفیق نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے زیادہ تر چھوٹی چھوٹی بحروں کا انتخاب کیا ہے جو غزل کی جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں زبان و بیان کے حسن کے ساتھ ساتھ موسیقیت اور غنائیت کی بھی بہترین مثال ہیں۔

ان کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کے بدلتے ہوئے رجحانات سے بخوبی آشنا ہیں اور بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے سیاسی، سماجی اور عصری تقاضوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کا انداز منفرد نظر آتا ہے جن میں درد دل بھی ہے اور درد جہاں بھی، حالات حاضرہ کا عکس بھی ہے اور ماضی کا پرتو بھی جس کی روشنی میں تابناک مستقبل بنایا جا سکتا ہے۔ مذکورہ اشعار دیکھیے:

بدلتی قدروں کو آہنگ ترجمانی دے
پرانے لفظ ہوں مجھ کو نئے معانی دے
یہی محیط ہے میرے لہو کا آئینہ
میں ایک قطرہ سہی مجھ کو بے کرانی دے
غموں کی دھوپ کی شدت سے جل گیا ہے لہو
فسردہ چہروں کو پھر رنگ ارغوانی دے

مذکورہ اشعار میں شفیق کی زبان و بیان کا وہ حسن واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے ان کی غزلوں میں ایک کیف وکشش پیدا ہوگئی ہے۔ان کی غزلوں میں جذبات کی صداقت، والہانہ پن، بندش کی چستی اورسوز وگداز بھی موجود ہے جوانھیں ان کے ہم عصر شعرا میں ایک اہم مقام دلانے کے لیے کافی ہے۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب: سلام اس پر (طبع دوم)
شاعر: مولانا زبیر اعظمی معروفی
مرتب: مطیع اللہ مسعود قاسمی معروفی
صفحات: 120
قیمت: 100روپے
مقام اشاعت: مکتبۂ امینیہ، پورہ معروف محلہ بلوہ، مئو، یوپی275305
سال اشاعت: 2017ء
تبصرہ نگار: فیضان حیدر (معروفی)

”سلام اس پر“ مولانا زبیر اعظمی معروفی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے جو پہلی بار 1997ء میں ہمدم پریس مالیگاؤں سے شائع ہوا تھا۔اس کی مقبولیت کے پیش نظر مولانا مطیع اللہ قاسمی معروفی نے اسے از سرنو مرتب کیا ہے۔اس میں حرفے چند کے ضمن میں وہ کہتے ہیں:

(1)اس ایڈیشن میں ہم نے مولانا کے حالات زندگی پر ایک مختصر مضمون شامل کتاب کیا ہے تاکہ ان کے علمی کارناموں کی ایک جھلک سامنے آئے۔(2)مولانا نے قرآن پاک کے تعلق سے تقریباً دو درجن نظمیں کہی ہیں جو مدارس و مکاتب میں ختم قرآن کے موقعے پر پڑھی اور سنی جاتی ہیں،انھیں بھی کتاب کا جزو بنایا گیا ہے۔“

کتاب کے شروع میں مولانا خورشید انور کا تعارفی مضمون ”مولانا محمد زبیر اعظمی ایک منفرد نعت گو شاعر“ مولانا زبیر کی شعری صلاحیت اور نعت گوئی کو سمجھنے میں بڑا معاون ہے۔مضمون کے شروع میں انھوں نے نعت گوئی کا ایک اجمالی تعارف پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعت گوئی ایک مشکل فن ہے اور چونکہ مولانا کی کتاب وسنت پر گہری نظر ہے اس لیے انھوں نے اس مشکل فن کو اپنے لیے قدرے آسان بنالیا ہے۔پھر بھی نعت گو ایک ایسے حصار میں مقید رہتا ہے کہ جس سے باہر نکلنا اس کے لیے بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔

اسی طرح پیش لفظ بعنوان ”نوید قلب وجگر،کاروان فکروعمل“ از مولانا محمد حنیف ملی اور سوانحی خاکہ از مولانا

مطیع اللہ قاسمی بھی مولانا کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔پیش لفظ میں مولانا زبیر اعظمی کی شاعری کے فکری اور فنی محاسن بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ساتھ ہی ان کی نعت گوئی کا ایک کلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔چنانچہ موصوف ان کی شاعرانہ خوبیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”شاعرانہ اسلوب اور پرواز تخیل میں حالات اور وقائع کی عکاسی اگر مشکل کام ہے تو اعجاز رسول کی ترجمانی نعت کے پیرائے میں مشکل ترین ہے۔مگر یہ زبیر کا کمال وصف ہے کہ اعتدال و توازن کے ساتھ معجزات نبوی کو بیان کرتے ہیں تو تعبیر ومعنی میں انہونا پن نہیں آنے پاتا نہ ذوق پر کوئی بار گزرتا ہے۔“ص 24

کتاب کے بنظر غائر مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں زبان و بیان پر دسترس حاصل ہے ساتھ ہی کہیں کہیں صنائع لفظی ومعنوی سے بھی کام لیا ہے۔ان کی ایک نعت کے چند اشعار دیکھیے:

باطل کی فضاؤں میں تونے، توحید کا پرچم لہرایا
انوارِ نبوت سے اپنے، تاریک دلوں کو چمکایا
باطن بھی ترا روشن روشن ظاہر بھی ترا جگمگ جگمگ
جب چہرۂ زیبا کو دیکھا، خود چاند بہت ہی شرمایا
معراج نبی کو مان لیا، توفیق و سعادت والوں نے
عقلوں کے پجاری کہتے رہے کیوں کر وہ گیا کیسے آیا؟

ایک ایک شعر میں پورے پورے واقعے کو نہایت سادگی سے نظم کردیا ہے جو تاریخ اسلام سے ان کی گہری واقفیت کا بین ثبوت ہے۔مذکورہ اشعار میں جو روانی اور سادگی پائی جاتی ہے وہ قابل توجہ ہے، ساتھ ہی ایک شعر میں انھوں نے معراج کے واقعے کے ساتھ اپنے عقیدے اور موقف کو بھی بیان کردیا ہے کہ نبی کی معراج جسمانی تھی اور اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ عقل پر عشق کو ترجیح دیتے ہیں۔ان کا یہی جذبۂ عشق انھیں نعت گوئی کی معراج پر لے گیا ہے۔ان کی نعتوں میں جو حسن اور توانائی پائی جاتی ہے وہ اسلامی تعلیمات سے براہِ راست استفادے سے عبارت ہے۔

مولانا مطیع اللہ قاسمی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مولانا زبیر اعظمی کے کلام کو بڑی کدوکاوش سے از سرنو ترتیب دیا ہے اور اس میں کچھ اضافات بھی کیے ہیں۔امید ہے کہ ان کی یہ کاوش علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

☆☆☆☆☆